پیاس کا دریا
رحیم گل

میرے محبوب!

تُم یہاں ہو، میرے پاس، میرے بالکل قریب، مَیں تمھیں دیکھ رہی ہُوں ——— مگر میری دیوانگی ملاحظہ ہو ——— مَیں پھر بھی تُمھیں ڈھونڈ رہی ہُوں۔ تمھیں تلاش کر رہی ہُوں۔

تُم ایسا کیوں نہیں کر لیتے پیارے ——— کہ میری آتما میں سَما جاؤ ——— تاکہ میری ذمہ داری صرف اِتنی رہ جائے کہ جیون کے ہر سانس میں تُمھیں محسُوس کرتی رہُوں!

میں دیباچہ نہیں لکھواؤں گا

"پیاس کا دریا" میرا دوسرا ناول ہے۔

اس سے پہلے میرا ناول "تن تارا را" رابعہ بک ہاؤس نے چھاپا ہے۔ "تن تارا را" اپنے ماحول اور پس منظر کی وجہ سے اردو ادب میں ایک منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ اسے ناول کی بجائے غزل کہتے ہیں۔

اور بعض لوگ اسے نثر میں شاعری کہتے ہیں۔

ایک دوست نے "تن تارا را" پر تبصرہ میں لکھا--- کہ "یہ روح کے اندر کی سیر ہے"۔ اس کی اشاعت کے بعد مجھے جو خط موصول ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ لوگوں نے اسے دس دس۔ اور چودہ چودہ بار پڑھا ہے۔

بہرکیف' اس ناول کی اتنی مقبولیت کے بعد خود بخود مجھ پر ایک ذمہ داری آن پڑی تھی کہ نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہو۔

لیکن ایک بات عرض کر دوں کہ "تن تارا را" لکھنے والا رحیم گل وہ شخص تھا جو سکول سے بھاگا اور برما کے جنگلوں میں پہنچ گیا اور جاپانیوں کے خلاف بے مقصد گولیاں چلاتا رہا۔ وہ رحیم گل بے حد معصوم تھا۔

"تن تارا را" انہیں معصومیتوں سے عبارت ہے۔

لیکن جس شخص نے "پیاس کا دریا" لکھا۔ وہ معصوم نہیں ہے۔ وہ محبت کے افلاطونی دور کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے "پیاس کا دریا" لکھنے والا رحیم گل وہ شخص ہے۔ جس نے فلم انڈسٹری میں بحیثیت مصنف، فلمساز و ہدایت کار کے انیس برس گزار دیے۔ گویا انیس برس فنون لطیفہ اور حسین عورتوں کے جھرمٹ میں گزارے ہیں۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ جناب مرزا ادیب صاحب صحرا نورد کے خطوط لکھ سکتے ہیں لیکن اگر وہ "پیاس کا دریا" لکھنا چاہتے تو ناکام رہتے۔ کیونکہ جو مواقع مجھے میسر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کے مقدر میں بھی نہیں تھے۔ کیونکہ جنسی تجربوں اور مشاہدوں کے مقابلتاً" میرے پاس انبار لگے ہوئے تھے۔

جناب احمد ندیم قاسمی بھی یہ کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ بے حد شریف النفس آدمی ہیں۔ کم از کم جنسی بالغ نظری میں میری عمر شاید ان سے بڑی ہو گی۔

ہاں منٹو مرحوم اگر زندہ ہوتے تو یہ کام کر سکتے تھے لیکن ناول لکھنے کے لیے جس استقلال، برداشت اور طویل انتظار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ منٹو مرحوم میں نہیں تھی، لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ "پیاس کا دریا" جیسا ناول لکھنا میرے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ میرا حق تھا۔

میں نے "تن تارا را" پر کسی سے دیباچہ نہیں لکھوایا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کی ضرورت بھی کیا ہے اور واقعی جب ناول مارکیٹ میں آیا تو دیباچے کے بغیر ہی بہت بکا۔ بلکہ اب تک ہر تیسرے مہینے میرا پبلشر مجھے ایک معقول رقم بھیجتا رہتا ہے۔

لیکن "پیاس کا دریا" لکھنے کے بعد مجھے خواہ مخواہ شوق چرایا کہ آخر کیا مضائقہ۔ اگر کوئی بڑا ادیب آٹھ دس صفحے میرے اور میرے ناول کی تعریف میں سیاہ کر دے۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے اپنا مسودہ جناب فارغ بخاری کو بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد فارغؔ کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا۔

"پیاس کا دریا" کا مسودہ پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔ تم مجھے اپنے قد سے دس گنا زیادہ قد آور لگے۔ تم نے "تن تارا را" ہی میں اپنے منفرد اسلوب نگارش کی وجہ سے لوگوں کو چونکا دیا تھا لیکن "پیاس کا دریا" تو چیزے دیگر است۔ میں دیباچہ لکھنے سے بہت کتراتا ہوں، لیکن تمہارا ناول اتنا بھرپور، اتنا زور دار اور اتنا پر مغز ہے کہ اس پر دیباچہ لکھنا واقعی میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ میں بہت جلد دیباچہ لکھ کر بھیج دوں گا۔ بے فکر رہیں۔

اور جب فارغ کا طویل دیباچہ میرے ہاتھ لگا تو واقعی میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ فارغ ناول کی روح میں اتر گیا تھا۔ اس نے ایک خوبصورت اور شاندار دیباچہ لکھا تھا۔

اشاعت کے لیے مکتبہ آئینہ ادب والوں سے بات ہو گئی۔ میں نے دیباچہ اور مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ چھ ماہ بعد معلوم ہوا کہ ناول اشاعت کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن فارغ کا دیباچہ گم ہو چکا ہے۔ مجھے اس دیباچے کی گمشدگی کا اتنا صدمہ ہوا کہ غصے میں مسودہ بھی وہاں سے اٹھا لیا۔

فارغ نے اس دیباچے کے سلسلے میں جس محبت اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے ہمت نہ ہوئی کہ دوبارہ ان سے رجوع کرتا۔

لیکن اس بار مجھ پر دیباچے کا خبط سوار تھا۔ سوچا جناب مرزا ادیب سے بھی تو خاصے مراسم ہیں۔ ہمیشہ گلے لگا کر ملتے ہیں۔ وضع دار آدمی ہیں۔ چنانچہ اگلے دن میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔

مرزا صاحب نے ناول کی بڑی تعریف کی۔ فرمانے لگے "بہت بکے گا"۔

چند دن کے بعد مسودہ واپس آ گیا، مگر دیباچہ ساتھ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ لکھ کر بھیج دیں گے۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ لیکن چند دن بعد معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ "قلم کا کام تو دلواتے نہیں۔ دیباچہ مفت میں لکھ دوں!"

میں بہت ہنسا۔ اس مایوس اور معصوم آدمی کے رویہ سے مجھے بالکل دکھ نہ

ہوا۔

لیکن بات یہ تھی کہ دیباچے کا خبط اب بھی سوار تھا۔

میری نظریں جناب احمد ندیم قاسمی کی طرف اٹھ رہی تھیں لیکن چونکہ قاسمی صاحب سے مجھے بے پناہ محبت تھی اور دل میں ایک خدشہ تھا کہ خدانخواستہ انہوں نے بھی یہ سوچ کر ٹال دیا کہ یہ رحیم گل کبھی قریب تو پھٹکا نہیں اور اب جو مطلب نکل آیا تو چار سو صفحے کے ناول کے تعریفی جملے لکھوانے کے لیے حاضر خدمت ہو گیا تو میں اپنی عقیدت' جو ان کی ذات سے ہے' کا جنازہ کہاں کہاں اٹھائے پھروں گا۔

سر راہے ایک بات اور کہتا جاؤں کہ ندیم صاحب سے اتنی محبت اور عقیدت کے باوجود دور دور رہنے کی ایک نفسیاتی وجہ تھی۔ جن لوگوں کو زمانہ طالب علمی یا اس کے بعد پڑھا ہے اور جو مجھے پسند تھے۔ میرے نزدیک وہ لوگ کچھ مافوق الفطرت قسم کے انسان تھے۔ لیکن جب ایک وقت آیا اور میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی تو مجھے انتہائی مایوسی ہوئی۔ اور جب ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا تو وہ مجھے بہت مختلف سے انسان لگے۔

چنانچہ میں نے قاسمی صاحب سے قربت کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ تاکہ میری محبت اور عقیدت کا سلسلہ قائم رہے۔ بخدا میں اب بھی دل سے ان کی عزت کرتا ہوں اور ان کی شخصیت اور فن کا مداح ہوں۔

لہٰذا یہی وجہ تھی کہ میں نے قاسمی صاحب سے دیباچہ لکھوانے کا خیال ترک کر دیا۔

لیکن دیباچہ مستقل ترک کرنے کا خیال ابھی پختہ نہیں ہوا تھا چنانچہ میں نے میر عبدالصمد خاں صاحب سے جو ان دنوں لاہور کے محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے' مشورہ کیا۔ انہوں نے جناب وقار عظیم کا نام تجویز کیا۔ تجویز ہی نہیں کیا' بلکہ خود میرے ساتھ ان کے دولت کدہ تک گئے۔ وقار صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے چائے پلائی اور مسودہ رکھ لیا۔ مجھے وقار صاحب اچھے لگے۔

چھ ماہ بعد میں ان کی طرف گیا۔ وہ طلبا کے امتحانی پرچے دیکھ رہے تھے بدقسمتی سے مسودہ پڑھنے کا وقت نہیں نکل سکا تھا۔

ایک سال بعد میں پھر ان کے در دولت پر حاضر ہوا عجیب اتفاق کہ وہ پھر پرچے دیکھ رہے تھے۔ مسودہ ابھی تک نہیں پڑھ سکے تھے۔

ڈیڑھ سال بعد میں پھر حاضر ہوا۔ وہ تخت پر بیٹھے طلباء کے پرچے دیکھ رہے تھے اور سرخ پنسل سے نمبر دے رہے تھے۔ قریب ایک کرسی پر جناب عبادت بریلوی تشریف فرما تھے۔ موضوع گفتگو یونیورسٹی کی سیاست تھی۔ میں کان لگا کر دو دانشوروں کی باتیں سننے لگا۔ اس گفتگو کی سطح اور معیار کو دیکھ کر میری چھٹی حس نے مجھے چونکا دیا۔ کہ میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔

دراصل یہ ایک ادیب کا نہیں۔ ایک ممتحن کا گھر تھا۔

میں نے ہنس وقار صاحب سے کہا کہ "آپ میرا مسودہ واپس کر دیں۔ تو عین نوازش ہو گی" وقار صاحب کچھ جھینپے اور فرمانے لگے۔

"آپ ایک ہفتہ تک تشریف لے آئیں۔ میں مسودہ تلاش کر لوں گا"۔

لیکن میں حسب عادت ایک ہفتے کی بجائے تین ماہ بعد ان کے پاس گیا۔ دیکھتے ہی بولے "صاحب نہ جانے آپ کا مسودہ کہاں رکھ چھوڑا ہے بہت ڈھونڈا۔ نہیں ملا"۔

میں حیرت سے اس سال خوردہ دانشور کو دیکھ رہا تھا جو آج بھی طلباء کے امتحانی پرچے دیکھنے میں مصروف تھا۔ میری حیرت کے معنی شاید وہ سمجھ گئے فوراً لہجہ بدل کر بولے ـــ "خیر تلاش کرتے ہیں مل جائے گا۔ آپ بھی آ جائیے۔ آپ شاید اپنا مسودہ پہچان لیں"۔

میں ان کے ساتھ اندر صحن میں چلا گیا۔ برآمدے میں لکڑی کے ایک تخت پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میری نظریں فوراً ایک سرخ جلد کی موٹی کاپی پر پڑیں۔ میں نے باز کی طرح جھپٹ کر اپنا مسودہ اٹھا لیا اور بے اختیار سینے سے لگا کر چلا آیا۔ میں

نے مڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔

لیکن دیباچہ لکھوانے کا خیال تو اب بھی اپنی جگہ اٹل تھا۔ میں نے سوچا۔ اگر ایسی بات ہے تو ایسا ہی سہی۔ نچلا کیوں بیٹھا جائے۔ میں نے جھٹ سے جناب کرشن چندر کو بمبئی خط لکھ دیا۔

مگر کرشن چندر تو ایسا بھولا آدمی نکلا کہ فوراً" دیباچہ لکھنے کی حامی بھرلی۔ بلکہ لکھا کہ گل بھائی' مسودہ کہیں ڈاک میں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ اس لیے بہتر ہو گا آپ خود مسودہ لے کر بمبئی آ جائیں۔ میرے پاس ٹھہریں۔ پندرہ بیس دن بمبئی کی سیر کریں اور دیباچہ لکھوا کر چلے جائیں۔

خط کا مضمون پڑھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگا---- کہاں تو مرزا ادیب کے رویے پر مجھے ہنسی آئی تھی۔ اور کہاں اس خط سے میری روح سرشار ہو گئی---- میں نے جناب کرشن چندر کا خط بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھایا---- اب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

لیکن پاک و ہند کے سیاسی حالات اس قدر مخدوش تھے کہ میں محترم کرشن چندر کی دعوت سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور دوستوں کو شرمندہ کرنے کا موقع ضائع کر دیا۔

میرے ناول کا عنوان ہی کچھ ایسا ہے کہ دریا مگر پیاس---- تشنگی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی۔ اپنے مرکزی خیال کے عین مطابق دیباچے کی ضرورت اگر تھی' پوری نہ ہو سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ دوستوں نے مجھے مایوس کیا۔ آخر تک ہی کیا ہے کہ مصنف اور قاری کے درمیان ایک تیسرا آدمی کھڑا ہو کر تکلفاً" کچھ بولتا دکھائی دے اور ناول پڑھنے سے پہلے قاری کو ایک خاص تاثر دے کر مصنف اور قاری کا آپس کا رشتہ توڑ دے۔

اگر لکھنے والا کچھ کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو وہ اپنے لیے قارئین ضرور تلاش کر لے گا۔ آخر "تن تارا را" نے بھی تو بغیر کسی دیباچے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

میرے کچھ دوست جنہوں نے "پیاس کا دریا" کا مسودہ پڑھا ہے۔ اسے بڑا ناول تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ "تن تارا را" سے نسبتاً" زیادہ متاثر ہیں میں آگے جانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔

میں اس کا تجزیہ یوں کرتا ہوں کہ انسان جو دکھی ہے۔ خوابوں کے جزیرے میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ حقائق سے زندگی میں بھی گریزاں ہے--- وہ کتابوں میں بھی ---- سامنا نہیں کرنا چاہتا۔

لیکن میں اس رویے کی نفی کرتا ہوں۔

میں جو کل تھا۔ آج نہیں ہوں' اور جو آج ہوں۔ وہ کل نہیں ہوں گا---- زندگی کا ہر لمحہ مجھے بتدریج ارتقاء کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ تغیر مصنوعی نہیں فطری ہے خود فریبی نہیں خود آگہی ہے۔

اگرچہ خود آگہی' خود فریبی سے زیادہ تلخ ہوتی ہے' مگر یہی زندگی کی عطا ہے۔ ہو سکتا ہے' یہ جو آنے والا کل ہے۔ بالکل ہی مختلف ہو۔ آج جس بات کو میں سچ سمجھ رہا ہوں۔ کل اس کی سچائی پر اصرار نہ کر سکوں۔ آج جن باتوں کو میں اٹل سمجھ رہا ہوں۔ کل بالکل ہی مضحکہ خیز نظر آئیں۔ اور آج جن نظریات پر میں فخر کر رہا ہوں کل خود ہی ان کی تردید کروں۔

"پیاس کا دریا" کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی ہے۔ اس سے میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں نے اسے دوبارہ لکھا۔ اور کانٹ چھانٹ کے بعد بقدر سو صفحے کم ہو گئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ قاری اور میرے دونوں کے مفاد میں تھا۔ بہت سی ایسی قدریں' جنہیں میں اپنے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہتا تھا اور بہت سی ایسی قدریں' جنہیں میں رد کر چکا ہوں قلم زد کر دی گئیں۔ اس کے باوجود مجھے دعویٰ نہیں ہے کہ جو کچھ ناول میں آگیا' حتمی ہے۔

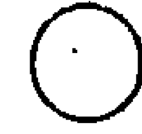
میں نے ناول شروع کیا تھا تو انسان زمین پر تھا اور جب ناول ختم کیا تو انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔

کل میں زمین کا آدمی تھا۔ آج میری منزل کا نشان بدل چکا ہے' لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ پیاس کا جو دریا جنسی شکل میں انسان کے سینے میں بہہ رہا ہے' خشک نہ ہو گا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ پیاس پھر بھی نہ بجھے گی۔

بس میں نے اس ناول میں یہی کہا ہے۔

رحیم گل

لاہور۔ اگست ۱۹۷۳ء



میں پہلی بار کراچی آیا تھا۔

شمسہ کے اصرار پر ------

میرے افسانوں سے متاثر ہو کر اس نے مجھے خط لکھا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خط و کتابت ایک خوشگوار رومانس کی صورت اختیار کر گئی' جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔

پروگرام کے مطابق یہاں پہنچتے ہی میں نے اسے خط لکھا کہ میں فلاں ہوٹل کے فلاں کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔

کراچی کی بڑی بڑی شاہراہیں' اونچی اونچی بلڈنگیں اور صاف ستھرے ماحول نے مجھ پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔

شام کو نہا دھو کر جب باہر نکلا اور ادھر ادھر گھومنے لگا تو مجھے ایسا لگا کہ کسی نہ کسی بلڈنگ کی بالکونی سے جھانکتی ہوئی شمسہ مجھے دیکھ لے گی۔ ابھی کسی سڑک کی فٹ پاتھ پر اس کا ٹکراؤ ہو جائے گا۔ یہ جو آٹو رکشہ گھوں کر کے گزر گئی' شمسہ تو نہیں تھی اس میں۔ اور وہ جو موٹر نکل گئی اس کی پچھلی سیٹ پر اکیلی لڑکی کون بیٹھی تھی؟ اور وہ سامنے دبلی پتلی' لڑکی جو مٹھائی کی دکان پر کھڑی ہے شمسہ تو نہیں؟ اور وہ دو ڈھائی سال کا بچہ جو لڑکی کا دامن پکڑے ہوئے ہے۔ پینو تو نہیں؟ اور وہ---- تین

لڑکیاں جا رہی ہیں ایک تو خاصی لمبی ہے۔ شمسہ، سلمیٰ اور زاہدہ بھی تو ہو سکتی ہیں۔۔۔۔؟ مگر نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہیں۔ خصوصاً" وہ لمبی تو بہت بے ڈھب سی لڑکی ہے۔ رنگ بھی کالا ہے۔ اجی نہیں! شمسہ تو سو جنم کے بعد بھی ایسی نہیں ہو سکتی!

لیکن اتفاق سے مڈبھیڑ ہو گئی تو میں فوراً اسے پہچان لوں گا، تصویر تو میری جیب میں ہی ہے۔ لیکن سڑک پر تعارف سے تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ منہ پر رومال رکھ لوں گا۔ کالی عینک تو لگا ہی رکھی ہے۔

لیکن اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو بڑا مزہ آئے گا۔ ذرا فاصلے پر رہوں گا، کنکھیوں سے دیکھوں گا، اس کا چلنا پھرنا۔ اس کی حرکات و سکنات، بے حد لطف رہے گا۔

اور وہ لٹن روڈ بھی تو یہیں کہیں ہو گی اور وہ سنت رام بلڈنگ۔ مگر کسی سے کیا پوچھوں۔ الٹا کوئی مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ کس سے ملنا ہے تو کیا خاک جواب دوں گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جانے سے تو یہی بہتر ہے کہ کسی سے پوچھا ہی نہ جائے۔

بہتری اسی میں ہے کہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں۔ چپکے سے سو جاؤں۔ صبح کا انتظار کروں اور دوپہر کو اپنی تقدیر کا فیصلہ سن لوں۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ شمسہ کے سارے خطوط نکالے۔ پہلے انہیں ترتیب دیا۔ پھر اٹیچی کیس کے ایک کونے میں رکھ دیے۔ شمسہ کی تصویر جو میں نے اپنی تصویر کے ساتھ فریم کروائی تھی۔ اٹیچی کیس سے نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ پوری باقاعدگی سے لاہور کی طرح کراچی میں بھی شرما رہی تھی۔ کل آئے گی اور اس طرح خود کو میرے پہلو میں پائے گی تو کیا محسوس کرے گی؟

چوڑیوں کے سیٹ، مخمل کا ڈبہ، جس میں انگوٹھی بند تھی۔ بڑی کامنا سے بنوائی تھی۔ خدا کرے اس کے ناپ کی ہو۔ پینو کے لئے کچھ کھلونے لایا تھا! سب میز پر رکھ دیے۔

دیر تک چھوٹے بچوں کی طرح ان چیزوں سے دل بہلاتا رہا۔ چوڑیاں پہناؤں گا

تو یہ کہوں گا۔ انگوٹھی پہناؤں گا تو دونوں کی نگاہیں انگوٹھی اور انگلی پر جمی رہیں گی۔ پھر یہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں گی۔ ایک دوسرے میں تحلیل ہو جائیں گی۔ پل پل کا ساتھ۔ ساری زندگی نباہنے کا عہد۔ انگوٹھی کے اس چھوٹے سے دائرے میں زندگی کا کتنا وسیع پروگرام محیط ہوتا ہے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ نیچے بازار میں اسی طرح ہنگامہ تھا۔ ہنگاموں کا یہ شہر۔ حرکت کا یہ شہر۔

شمسہ بھی میرے متعلق سوچ رہی ہو گی۔ وہ جانتی ہے آج میں کراچی میں ہوں۔ مسکرا رہی ہو گی۔ میری طرح چھت کو گھور رہی ہو گی۔ ہنس رہی ہو گی۔ من میں قندیل، آنکھوں میں دیئے۔ ہر طرف روشنی۔۔۔۔ بچوں کی سی حرکتیں، جن پر اختیار ہوتا ہے نہ قابو۔ معصوم، چنچل، شوخ، بھولی بھالی، پیاری پیاری حرکتیں۔

من نگری کا روپ ہی نرالا ہوتا ہے۔

پھر میں سوچنے لگا۔۔۔۔ شمسہ کل کس وقت آئے گی۔ نو بجے، دس بجے، بارہ بجے، دو بجے۔۔۔۔؟

یہ لوکل ڈاک رات ہی کو کیوں نہیں بٹ جاتی۔ میں نے خط شام کے چار بجے پوسٹ کیا تھا۔ پھر یہ ڈاک والے اسے دوسرے دن کیوں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ہماری سرکار ڈاک والوں کے کان کیوں نہیں کھینچتی؟

کل۔۔۔۔ نہ جانے شمسہ کس وقت ملے۔ میں نے سارے دوستوں سے کہہ دیا ہے۔ کل شام چھ بجے سے پہلے میں کسی سے نہیں مل سکتا۔ دن کو میں نے بہت ضروری کام کرنے ہیں۔ اب بیچارے شام ہی کو آئیں گے۔ کیا پتہ تھا ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ مجھے دوستوں کے خلوص سے کھیلنا پڑے گا۔

عجیب بات ہے۔ پیار، جہاں سچائی اور خلوص کی روشنی بخشتا ہے وہاں ننھے ننھے معصوم جھوٹوں کو بھی جنم دیتا ہے۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی کرنوں نے میرے رخساروں کو تھپتھپایا۔ گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ابھی شیو بھی نہیں بنائی۔ غسل بھی نہیں

کیا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ ایسے میں شمسہ آ گئی تو۔۔۔؟

نہیں نہیں شمو۔ اتنا سویرے نہ آنا۔ مجھے تیار تو ہو لینے دو۔۔۔۔۔ ڈاک خانہ نو بجے کھلتا ہے۔ ابھی تو ڈاک کی چھانٹی ہو گی۔ کہیں گیارہ بجے تمہیں میرا خط ملے گا۔ پھر تم اسے کھولو گی۔ پڑھو گی اور خوشی مناؤ گی۔۔۔۔ پھر نہاؤ دھوؤ گی۔ کپڑے پہنو گی۔ سنگھار کرو گی۔ پھر اماں سے اجازت لو گی۔ موٹر میں تو نہیں آؤ گی۔ وہ تو تمہارے ابا کچہری لے گئے ہوں گے۔ رکشہ میں ہی آؤ گی۔ لٹن روڈ تو یہاں سے دور ہی ہو گی۔ پندرہ بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ اور پھر میرے کمرے کے دروازے پر دستک دینے میں بھی دس پندرہ منٹ تو سوچتے سوچتے گزار ہی دو گی۔ تمہارا دل زور زور سے دھڑکے گا۔ ایک انجانے سے خوف سے' ایک انجانی خوشی سے۔ دائیں بائیں دیکھو گی۔ چوروں کی طرح۔ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا۔ اور جب اچانک کسی کی نظر پڑے گی تو تم دل کڑا کر کے دروازہ کھٹکھٹاؤ گی۔

دستک سنتے ہی میں اچک کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ پٹ کھلتے ہی تم سے آنکھیں چار ہوں گی۔ ہائے کتنا حسین تصور ہے۔ یہ کتنا انوکھا۔ کتنا عجیب' بغیر دیکھے سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

لیکن تب تک تو ایک بج جائے گا۔ دو بج جائیں گے۔ میں بڑی آسانی سے شیو بنا سکتا ہوں۔ غسل کر سکتا ہوں۔ اور پھر گھنٹوں انتظار کر سکتا ہوں۔

اسی طرح میں اپنے تصورات میں الجھا رہا۔ پھر اٹھ کر دروازہ بند کر دیا شمسہ چپکے سے کہیں اندر نہ آ جائے۔ حالانکہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی میری خواہش تھی۔ وہ دروازہ ضرور کھٹکھٹائے۔ اس کی دستک پر میں اپنے اندر کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

سامنے کی کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ بائیں ہاتھ کا دروازہ بالکنی کی طرف۔ نیچے چوک میں ٹریفک کا سنتری کھڑا ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا۔ بالکنی والے دروازے اور کھڑکیوں سے سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں اور من کو

گدگدا رہی تھیں۔

ابھی میں نے کلفٹن نہیں دیکھا۔ منوڑہ نہیں دیکھا۔ شمسہ ساتھ ہو گی تو ساگر کے کنارے چھلکیں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں گھومیں گے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر کریں گے۔ لوگ ہمیں کنکھیوں سے دیکھیں گے۔

لو بارہ بج گئے۔ شمسہ ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وہ بیچاری بھی خط کے انتظار میں تڑپ رہی ہو۔ ڈاک والے ہوتے ہی ست ہیں۔۔۔ ان کو کسی کے انتظار کی کیا پروا۔ کوئی مرے' جئے ان کی بلا سے۔۔۔ ان کا بس جب دل کرے گا تھیلا اٹھا لیں گے۔ سائیکل پر بیٹھیں گے اور پھر مزے مزے سے سائیکل چلائیں گے۔ ایک ایک گلی' ایک ایک گھر گھومیں گے لیکن یہ کبھی نہیں سوچیں گے کہ کس کا خط پہلے پہنچانا ضروری ہے۔

آخر شمسہ نے اسے سمجھایا کیوں نہیں کہ کل ایک ضروری خط آئے گا۔ کیا پتہ شمسہ ستا رہی ہو۔ خط اسے مل چکا ہو۔ جان بوجھ کر دیر کر رہی ہو۔ عورتوں کے تریا چلتر بھی تو بہت مشہور ہیں۔

لیکن شمسہ تو بڑی آن بان والی لڑکی ہے وہ ایسی چھوٹی باتیں نہیں سوچ سکتی۔ اسے خط ملے' اڑتی ہوئی آئے گی۔

ہو سکتا ہے۔ بیمار ہو گئی ہو۔ لیکن بیمار ہو جاتی تو اطلاع کراتی۔ سہیلی کو بھیجتی۔ زاہدہ کو بھیجتی۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کرتی۔

ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔ خط کہیں بھائی جان کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ مگر یہ دل کو لگنے والی بات نہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ گھرانوں میں بہنوں کے خط بھائی نہیں کھولتے۔

شاید خط ہی نہ ملا ہو۔ پھر بے چاری کہاں ڈھونڈتی پھرے اور شاید یہ بھی سوچے کہ میں کراچی نہیں پہنچ سکا۔

بہتر ہو گا۔ اسے ایک اور خط لکھ دوں۔ ایکسپریس لیٹر۔

اچانک دستک کی آواز آئی۔ بڑی سہمی سہمی دستک۔

میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دل زور' زور سے دھڑکنے لگا۔ امید و بیم' شوق اور تجسس' جانے میں کیا سوچ رہا تھا۔

خدا کرے یہ شمسہ نہ ہو۔ ہوٹل کا بیرہ ہو۔ شمسہ کچھ دیر بعد آئے۔ میں ذرا سنبھل جاؤں گا۔

ٹک ٹک ٹک ------!

یہ دوسری دستک تھی۔ ضرور شمسہ ہے۔ یہ ٹک ٹک بڑی مہذبانہ ہے۔ بڑی شاعرانہ ہے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

"اوہ---!"

دروازہ کھولتے ہی میرے سر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ بیرا کھڑا تھا۔ چائے کے لئے پوچھ رہا تھا۔

میں ہنس پڑا۔

"بھئی جس وقت مرضی ہو لے آنا۔ اچھا چار بجے لے آنا"۔

بیرا سلام کر کے چلا گیا۔ میں خفت مٹاتا ہوا بستر میں آ لیٹا۔ اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا بیرا کوئی بات [illegible] گیا ہے--- جلدی سے اٹھا۔ دروازہ کھولا تو دل دھک سے رہ گیا۔

میرے سامنے ایک سروقد حسینہ کھڑی مسکرا رہی تھی---- نسواری رنگ کا نیا سوٹ۔ پاؤں میں بے حد سبک اور نازک جوتے۔ دونوں ہاتھوں میں خوبصورت چوڑیاں؛ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں' کانوں میں نگینوں والے گول گول چوڑے چھلے' زعفرانی رنگ' خوبصورت آنکھیں' دبلی پتلی اور لمبی---- دلفریب خد و خال کی لڑکی۔

یہ تھی شمسہ!

"آیئے---!"

میں نے مسکراتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ تبسم بر لب بے حد تمکنت سے پرس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میری روح کو گدگدا گیا۔ شمسہ نے ٹھیک لکھا تھا۔

"آؤ نا۔ ایک بار' ایک نظر مجھے دیکھ تو لو۔ کہ میں سانولی ہوں یا گوری ہوں۔ کالی چڑیل ہوں یا پری!"

اس نے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں دعویٰ تھا۔ اور یہ دعویٰ آج حقیقت بن کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ واقعی حسین تھی۔ نرم و نازک ہاتھ' کنول کی طرح سندر پاؤں۔

ٹیبل پر اپنی اور میری تصویر پر ایک نظر پڑی تو اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

"بہت انتظار کرایا"۔

"کاہے کو---" وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔ "میں تو صبح سے آپ کے خط کا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی خط ملا۔ فوراً چلی آئی!"

"چائے تو پیئیں گی آپ؟"

وہ ہنسنے لگی--- "مہمان سے پوچھا نہیں کرتے"۔

میں بھی ہنس پڑا۔

"خیر یہ فیصلہ تو بعد میں ہو گا کہ مہمان ہم میں سے کون ہے۔ بہرحال آپ چائے پی لیجئے"۔

کال بیل بجائی۔ بیرا نہ آیا تو اسے دیکھنے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ میرا اٹیچی کیس کھولے اپنے خطوط دیکھ رہی تھی۔ میں ہنس پڑا۔

"اچھی طرح تسلی کر لو کہ مطلوبہ شخص کی بجائے کوئی غلط آدمی تو نہیں آ گیا"۔

اس کی چوری ایک پیاری سے مسکراہٹ میں ڈھل کر معذرت بن گئی۔

"آپ نے میری تصویر اپنی تصویر کے ساتھ فریم کروا کر میز پر رکھ دی ہے۔ اگر میں بھائی جان کو ساتھ لاتی تب تو میں خوب تماشا بنتی"۔

نہ جانے اس نے کس جذبے کے تحت یہ بات کہی تھی' لیکن مجھے اچھی نہ لگی۔

"اگر میرے پہلو میں آپ خود کو تماشہ سمجھتی ہیں۔ تو میں ابھی اسے نکال کر اٹیچی کیس میں رکھ دیتا ہوں"۔

"نہیں نہیں!" وہ تڑپ سی گئی۔ "میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو اسے بالکل نہ نکالئے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا"۔

"وقت کی مالک عورت ہوتی ہے۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ابھی اس کا وقت بہت دور ہے تو مجھے اسے الگ کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہو گا"۔

اوہ خدایا۔۔۔۔!" "آپ نے تو میری بات کو بالکل الٹ سمجھا۔ بس بس۔ آپ اسے بالکل نہ نکالئے۔ سرے سے تصویر کی بات ہی نہ کیجئے"۔

میں ہنس پڑا۔ شمسہ' کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر آ گئی۔

"مجھے کرسی پر بیٹھنے سے کوفت ہوتی ہے"۔

میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے تپائی پر پڑی ہوئی پنسل اور رائٹنگ پیڈ اٹھا لیا تھا۔ اور اب اس پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کاغذ پر سوالیہ نشان کے ساتھ یہ فقرہ درج تھا۔

"ندیم صاحب! میں آپ کو پسند آئی یا نہیں؟"

میں ہنس پڑا۔ وہ بھی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مسکرا رہی تھی۔ عجیب سا سوال تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ جب پہلی ملاقات ہو گی تو یہ کہوں گا۔ وہ کہوں گا۔ اس کے خیالات پرکھوں گا۔ کڑے کڑے امتحان ہوں گے۔ بے چاری کے۔۔۔۔ لیکن ہوا کیا۔ بس یوں سمجھئے' کچھ بھی نہ ہوا۔

وہ تو ایک دعویٰ بن کر آئی تھی۔

ٹیبل سے چوڑیاں اٹھا کر' میں بالکل اس کے قریب آن بیٹھا۔

"شمسہ! یہ چوڑیاں تمہارے لئے لایا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ اس طرح کی چوڑیاں تمہیں میسر نہیں۔ بلکہ تمہاری بانہوں کی چوڑیاں تو بے حد حسین ہیں۔ لیکن یہ چوڑیاں جو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ ان کی چھنک میں میرا خلوص ہے۔ میرا پیار ہے۔ اور یہ انگوٹھی شمسہ! میں نے سوچا تھا تمہارے لئے کوئی انوکھا سا تحفہ لاؤں گا۔ لیکن جب سوچتے سوچتے تھک گیا اور کوئی دوسری چیز نہ جچی تو صدیوں کے اس فرسودہ بندھن کی آڑ لینا پڑی لیکن تمہاری انگلیاں تو میرے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ شمسہ! اور یہ انگوٹھی۔۔۔۔"

"پہنا دیجئے"۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں ہاں۔ کیا کہا جاتا ہے ایسے موقعوں پر کہ اس کی لاج رکھنا۔ پر ایسا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ لاج رکھو نہ رکھو۔ یہ اب تمہاری چیز ہے میں پوری عقیدت اور بالکل سادہ سچائی سے اسے تمہاری نذر کرتا ہوں!"

وہ بے حد خوش تھی۔ اس نے دوبارہ کاغذ پر لکھا۔

"آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ میں آپ کو پسند ہوں یا نہیں؟"

میں اور اس کے قریب ہو گیا۔ اور اس کے خشک چمکتے ہوئے لمبے بالوں کی ایک چوٹی ہاتھ میں لے کر چوم لی۔

"شمسہ تم مجھے بے حد پسند ہو"۔

"یوں نہیں جی۔ بتاؤ میری کون سی چیز آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟"

اس نے کاغذ پر یہ نیا فقرہ لکھا۔

میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور اس کے پیارے پیارے سپید سپید کنول کی طرح خوبصورت پاؤں کی طرف دیکھا۔

"شمسہ' تمہارے پاؤں بے حد حسین ہیں!"

"نہیں جی"۔ وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "لعنت بھیجو پاؤں پر۔ کسی اور چیز کا انتخاب کرو"۔

"نہیں شمسہ! میں تو انہیں کو انتخاب کروں گا۔ جن سے چل کر تم یہاں آئی ہو"۔

وہ ماتھے پر شکنیں ڈال کر بولی۔

"دیکھو جی۔ یہ نہیں چلے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں اور میں آپ کو اچھی نہیں لگی"۔

میں ہنس پڑا۔

"تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتیں شمسہ کہ میں نے اپنا دل تمہارے قدموں میں پھینک دیا ہے"۔

شمسہ تڑپ اٹھی۔ اس نے جھٹ سے اپنا نازک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔

"چپ رہئے ندیم صاحب! چپ رہئے"۔

اس کی آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ خوشی کی بات بھی تھی۔ اس کے محبوب نے اپنا دل سینے سے نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ میں اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے گریہ میں میں لذت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہی وہ لڑکی ہے جس کو میں نے ہزار ہزار دعاؤں اور امنگوں کے بعد مانگا تھا۔ جو میرے لئے اور صرف میرے لئے پیدا کی گئی اور جس میں میں اپنا وجود ضم کر دوں گا۔

میں نے ابھی تک محبت کے اس شدید احساس اور دیوانگی کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ لیکن آج جان گیا کہ حبیب و محبوب ایک ساتھ زندگی کے نشے سے سرشار ہوتے ہیں اور ایک ساتھ حسن اور عشق کی شیرینی کا مزہ چکھتے ہیں۔

میں نے بے حد پیار سے اس کے زعفرانی رخساروں سے آنسو پونچھے۔

"شمسہ۔ تم اتنی جذباتی نہ بنو۔ بھلا دیکھو۔ تمہاری جیسی دلکش اور پیاری لڑکی

کو کوئی کیسے نظرانداز کر سکتا ہے"۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو سہلانے لگی۔ پھر میری انگلیوں کے پوروں کو گنتے ہوئے بولی۔

"ندیم صاحب! میں آپ کی باندی ہوں۔ مجھے ہمیشہ اپنے چرنوں میں رکھنا اور دیکھئے ندیم صاحب! جانے دوسری لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے کس طرح پیار کرتی ہوں گی۔ شاید لجاتی ہوں گی۔ شرماتی ہوں گی۔ ڈرتی ہوں گی۔ افسانوں اور ناولوں میں تو یہی پڑھا ہے۔ لیکن مجھے تو یہ سب کچھ کرنا نہیں آیا۔ میں تو منٹوں میں آپ سے گھل مل گئی۔ مجھے نہ آپ سے ڈر لگا۔ نہ خوف آیا۔ آپ میرے اپنے جو ہوئے۔ اس لئے مجھے ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھنا"۔

"نہیں شمو۔ تمہارے اسی انداز اور اعتماد نے تمہیں انمول بنا دیا ہے۔ یہ تمہارا پکے پھل کی طرح آغوش میں آ جانا انتہائی معصومیت اور ناتجربہ کاری کی دلیل ہے۔ شکر ہے تم نے منجھی ہوئی لڑکیوں کی طرح اداکاری نہیں کی۔ تمہاری سپردگی' تجربے سے خالی ہے۔ اور تمہاری کنواری آنکھیں بے داغ ہیں----!"

"ندیم صاحب! میں بہت جلد باز ہوں۔ میں عشق میں بھی آپ پر سبقت لے گئی تھی۔ میں خط و کتابت میں بھی بہت جلد عریاں ہو گئی تھی۔ میں آج بھی اپنی بے وقوفی میں آپ سے آگے ہوں"۔

میں نے بے حد خلوص سے اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں بھی بہت خوش تھا---- لیکن اس کا قیمتی لباس اور زیور دیکھ کر ایک خیال آیا۔ یہ لڑکی جذبات و محبت کے نشے میں سرشار ہے۔ آج یہ عسرت اور ثروت میں تفریق نہیں کر سکتی۔ لیکن کل جب اس کا ریشمی لباس پھٹ جائے گا اور میں اسے ایسا لباس مہیا نہ کر سکوں گا۔ تب اس کے احساسات میرے متعلق کیا ہوں گے؟

مجھے سوچوں میں ڈوبا پا کر اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"شمو!" میں نے بے حد خلوص سے اس کے نام پر زور دیا۔ "میں ایک لمحے کے لئے بھی تمہارے خلوص پر شک نہیں کرتا۔ میں پوری نیک نیتی سے تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ اور مجھے بیوی کے اس مقدس رشتے کی قسم ہے کہ دنیا میں تم سا عزیز مجھے کوئی دوسرا نہ ہو گا۔ تم میری دنیا سے نکل گئیں' تو میرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس کے باوجود آج تم سے دو باتیں بے حد سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں"۔

شمسہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناکہ میں مجسٹریٹ کی بیٹی ہوں۔ لیکن ندیم صاحب! میں اس کا جواب خطوط میں دے چکی ہوں۔ میرے ابا موٹر میں کچہری گئے ہیں لیکن میں آپ کے پاس پیدل آئی ہوں اور یہی میری حیثیت ہے۔ میں سمجھتی تھی' میں آپ پر جتا چکی ہوں کہ ہم جو ایک دوسرے سے ملے ہیں بلاوجہ نہیں ملے اور وہ دن دور نہیں جب میں آپ کے اس اجتناب کو ختم کر دوں گی"۔

"لیکن شمسہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس وقت کا انتظار کرو------ جب میں بہت بڑا آدمی بن جاؤں۔ تم عزیزوں دوستوں میں میرا نام فخر سے لے سکو اور تمہاری گردن میری وجہ سے تنی رہے"۔

"جب میں یہ جانتی ہوں کہ کسی ذات کا احترم کسی اصول پر کیا جاتا ہے' کسی عقیدت پر کیا جاتا ہے' کسی جذبے کے تحت کیا جاتا ہے اور اس جذبے کا نام خوشی ہے اور خوشی امیری کا دوسرا نام ہے۔ تو پھر بتائیے کہ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟"

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں شمسہ! اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری موجودہ جذباتی کیفیت سے تمہاری زندگی برباد ہو جائے۔ آج تم مسکرا رہی ہو' کل تمہارے مسکراتے چہرے پر بہتے آنسوؤں کی کہانی آ گئی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا"۔

"ندیم صاحب! آپ نے ابھی تک میرے دل کو نہیں ٹٹولا۔ محبت کی نگاہوں میں امیری اور غریبی کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ پیار کو پرکھنے کی تو کوئی کسوٹی ہی نہیں

ہوتی۔ میں صرف محبت کی بھوکی ہوں۔ ایسی محبت کی جو میں نے خود پیدا کی ہو۔ سب کچھ بھول جایئے سوائے اس کے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت!"

"ٹھیک ہے شمو!" میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم میرے ساتھ بھوکی رہ سکتی ہو یا موجودہ صورت حال کو قبول کر سکتی ہو تو آؤ' میری آنکھوں میں بیٹھ جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں یہاں تمہارا جسم ننگا رہ سکتا ہے۔ تمہاری آتما ننگی نہیں ہو گی۔ تمہارا پیٹ خالی رہ سکتا ہے' تمہارا من خالی نہیں ہو گا۔ آؤ شمو! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میں تمہیں کبھی جدا نہیں کروں گا!"۔

شمسہ نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ دیر تک ہم دونوں خاموش چپ چاپ ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔

شام کے چھ بج گئے۔ اس نے اپنی نرگسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"میں اب چلی جاؤں؟"

"ہاں شمسہ! اب تم چلی جاؤ۔ تاکہ کل پھر آ سکو"۔

وہ بچوں کی طرح رشوت دیتے ہوئے بولی۔

"کل دس بجے آؤں گی اور پھر سارا دن آپ کے پاس رہوں گی"۔

میں ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس پڑی۔ پھر وہ جوتے پہننے لگی۔ میں اس کے خوبصورت پاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ جوتے پہن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی کنگھی سے بال سنوارے اور پھر قد آدم آئینے میں کپڑوں کی شکنیں درست کرنے لگی۔ میں مسکراتا ہوا اس کی پشت کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ آئینے میں تصویر کی طرح مجھے پاس دیکھ کر وہ شرما گئی اور آئینے کی گرفت سے نکل گئی۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت بھایا۔

میں اسے دوبارہ پکڑ کر آئینے کے سامنے لے آیا ور خود پیچھے کھڑے ہو کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ پیارا پیارا احتجاج کرتی رہی۔

"میں اب آئینے میں نہیں دیکھوں گی"۔

میں اس کا سر پکڑ کر سیدھا کر دیتا۔ وہ ادھر ادھر گردن موڑ دیتی۔

"نہیں نہیں۔ میں نہیں دیکھوں گی"۔

میں نے خوشامد کی "شمو ایک بار صرف ایک بار"۔

وہ ہنس پڑی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے سامنے دیکھا اور جھٹ سے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"نہیں نہیں۔ میں اس طرح آپ سے آنکھ نہیں ملا سکتی"۔

"اچھا چلو۔ سر اٹھاؤ۔ میں ہٹ جاتا ہوں"۔

اس نے منہ سے ہاتھ ہٹا لئے۔ وہ ہنس رہی تھی۔

"بس اب مجھے جانے دیجئے"۔

"ہاں چلو"۔ میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے دروازے تک لے آیا۔

بولتے ہوئے تو وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"آپ کو کون سا رنگ پسند ہے۔ کل کیسے کپڑے پہن کر آؤں؟"

"میرا خیال ہے۔ سفید یا کریم کلر کا سوٹ تمہیں بہت کھلے گا"۔

"ہاں"۔ اس کے لہجے میں خوشی اور اطمینان تھا۔ "ایک سوٹ تو ایسا ہے"۔

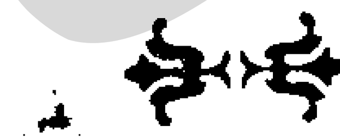
پھر وہ ایک دم چنچل ہو کر بولی "اچھا جی---- اب آپ تشریف رکھیں اور سو جائیں---- تسلیم!"

تسلیم کہتے ہوئے وہ بہت رومینٹک ہو گئی۔

میں نے اس کا ہاتھ چوما۔ وہ مسکرائی اور چلی گئی۔

اطمینان و مسرت کی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر میں پلٹا اور بستر میں گر پڑا۔

آہ------ یہ ہوتی ہے محبت!



صبح ہوئی۔

میں حسب معمول سویرے اٹھ گیا تھا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے اخبار اٹھایا۔ شمسہ نے تو دس بجے آنا ہے۔ اور کیا پتہ پندرہ بیس منٹ لیٹ ہی آئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ سفید کرتے اور پاجامے میں میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ اچانک شمسہ مسکراتے ہوئے اندر آ گئی۔

وہ حنائی رنگ کا غرارہ' حنائی رنگ کی قمیض اور اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ کتنی دلکش لگ رہی تھی---- خلاف معمول اس لباس میں اس کا قد قدرے چھوٹا محسوس ہوا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کا تبسم دودھ پیتے بچے کی طرح معصوم اور بے ساختہ تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہے۔ وہ بالکل میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور معذرت کے لہجے میں بولی۔

"وہ آپ نے جو لباس پہننے کو کہا تھا' استری نہ ہو سکا۔ اس لئے یہی پہن کر آ گئی ہوں"۔

میں نے اس کے مخروطی انگلیوں والے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبایا۔

"تم اس لباس میں کل کی نسبت مجھے بہت پیاری لگی ہو۔ تمہیں یہ لباس بھی بہت سجتا ہے"۔

اس نے مسکرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

"میں صرف آدھ گھنٹہ ٹھہر کر چلی جاؤں گی"۔

"کیوں؟" مجھے حیرت ہوئی۔ "کل تم نے سارا دن میرے پاس ٹھہرنے کا وعدہ کیا تھا"۔

وہ ہنس پڑی----

دراصل مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں اباجان کی گاڑی لے کر آئی ہوں۔ اباجی اتوار کو سارا دن گھر پر رہتے ہیں۔ لیکن آج نہ جانے انہیں کیا کام پڑ گیا۔ کہنے لگے "شمو بیٹا آدھ گھنٹے تک لوٹ آنا۔ مجھے کہیں باہر جانا ہے"۔ میں نے لاکھ انکار کیا کہ میں رکشے میں چلی جاؤں گی۔ لیکن اباجی بچوں کی طرح اصرار کرتے رہے کہ کہیں میں ان سے روٹھ نہ جاؤں"۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ تمہاری تیس منٹ کی قربت میرے سارے ماضی پر بھاری ہے"۔

وہ مجھے بچوں کی طرح تسلی دینے لگی۔

"کل تو بس صبح آؤں گی اور شام کو جاؤں گی"۔

میں دل میں ہنسا۔ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہی ہے۔ لیکن وہ خود بھی اس کے لئے مجبور تھی۔

اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ بہت جلد مجھ سے گھل مل گئی--- اس نے میرے متعلق قبل از وقت جو رائے قائم کر لی تھی۔ وہی قطعی اور حتمی تھی۔ محبت صرف اعتماد کرنا جانتی ہے۔ اس صورت حال نے مجھے اور زیادہ گرویدہ کر لیا تھا۔

میں تکیے پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ سائیڈ پوز کے زاویے سے میرے قریب بیٹھی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا سائیڈ پوز مجھے بے حد پسند تھا۔

میں نے اس کے خوبصورت لمبے بالوں کی ایک چوٹی کھینچی تو اس نے اپنا سر میری چھاتی پر رکھ دیا۔ وہ باتوں کی چکی چلاتی رہی۔ میں اس کے بالوں اور بالیوں سے کھیلتا رہا۔ پھر اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کر لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے سلگتے ہونٹ اس کے حسین لبوں پر رکھ دیے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد میں ہولے سے بولا۔

"شمسہ"۔

"جی" وہ جیسے دوسری دنیا سے بولی۔

"میرے ساتھ لاہور چلو گی؟"

"جی"۔

"ساری زندگی میرے ساتھ رہو گی؟"

"جی"۔

"لیکن شمسہ! تم نے ایک بار خط میں لکھا تھا کہ تم دھرتی پر سب سے زیادہ پیار اماں سے کرتی ہو۔ اسے بھی چھوڑ جاؤ گی میرے لئے؟"

"جی" اس کی آواز لرز گئی۔

"شمو!"

"جی"۔

"پھر تو ساری کائنات میں سب سے زیادہ پیار تم مجھ سے کرتی ہو نا؟"

"جی" اب اس کی آواز میں ایک دعویٰ تھا۔

"پھر تو میں ساری دنیا سے جیت گیا ہوں نا شمو؟"

"جی"۔

"جی۔ جی۔ جی---!" میں نے اس کا سر اٹھایا۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ تم رو رہی ہو؟"

"جی---" وہ ہنس پڑی۔ "دراصل یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ساری دنیا سے ناطہ توڑنے کے غم میں بہہ گئے تھے یہ آنسو"۔

شمسہ تعلیم یافتہ اور سمجھدار لڑکی تھی۔ لیکن آج یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی۔ پڑھی لکھی لڑکی بھی--- "جی" کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکیاں بھی پیار کی بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے کچھ نہیں کر سکتیں۔ بے بس ہو جاتی ہیں۔ ان سندر ناریوں کے دل میں جب کسی مرد کا دھیان جم جائے تو یہ نہ ماں باپ کو دیکھتی ہیں' نہ بہن بھائیوں کو۔ نہ آس پاس والوں کو۔ بلکہ ان سب کے ساتھ یہ اپنے جیون کو بھی تنکے کا سماں جانتی ہیں۔

جب دل میں چاہت کا تند و تیز دھارا پھوٹتا ہے تو زندگی کے سارے ویرانے شاداب ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے' بالکل ٹھیک ہے۔ پیار کرنے والے بالکل بیراگی بن جاتے ہیں۔

میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"شمو! تم مجھے کیوں پیار کرتی ہو؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ بس دیکھتی رہی۔ خاموش۔ دیر تک اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھیں۔ لیکن اس کی یہ خاموشی جو انداز تکلم سے بھی زیادہ پراثر تھی۔ بے حد پراسرار اور مقدس تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دبی دبی زبان میں کوئی آسمانی پیغام سنا رہی ہو۔

اس سکوت میں بھونروں کی گنجار تھی۔ اس خاموشی میں ایک عجیب گیان تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مہرو مہ کی ساری روشنی۔ چندا کی ساوی ٹھنڈک اور سورج کی ساری حدت اس کی آنکھوں میں سمو گئی ہے۔

اس طرح کا خاموش سواگت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

عورت اور مرد کے اس ملن ترنگ سے کتنے میٹھے اور مدھر سر نکلتے ہیں۔ اس نے اپنے زعفرانی رخسار میرے ننگے بازو پر رکھ لئے۔ آہ یہ لمحے----

سندر تاروں کی سنگت سے بھی زیادہ پیارے تھے۔

اس گھڑی چاند بھی آسمان سے اتر کر میری جھولی میں آ جاتا تو شاید میں اس کو بھی دھیان میں نہ لاتا۔

کیسے تھے یہ لمحے---؟

کتنا ہنگامہ تھا اس خاموشی میں!

اس خاموشی میں میں دور چلا گیا----- دور----- بہت دور---- تصورات کی دنیا میں--- خیالوں کی وادی میں----

وہاں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ ننھا سا۔ چھوٹی سی سرسبز پہاڑی کے دامن میں---- چیل اور چنار کے درختوں سے اٹی ہوئی پہاڑی اور ستھرا نیلا آسمان۔ شفاف اور میٹھے پانی کی لہراتی ہوئی ندیاں۔ دیوداروں کے گول گول تنوں اور لمبے لمبے سایوں سے آگے---- بس کچھ آگے--- سنہری اور خوبصورت شفق تھی۔

کچی مٹی کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھت کا یہ گھر کتنا پرسکون تھا جو دن کو دھوپ کی کرنوں سے منور رہتا۔ اور رات---- مٹی کا دیا تارامیرا کے تیل سے اجالے کا رس چوستا---- اور اس کی لرزتی لو شمسہ کے زعفرانی چہرے پر کبھی سانولی اور کبھی سنہری لیپ کرتی رہتی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے۔ رات بھر یہ لو کانپتی رہتی۔ خم کھا کر--- لیٹ کر--- بجھتے بجھتے اس کی دھار پھر سے آکاش کی طرف بہنے لگتی--- پہلی پہلی سی یہ دھار ڈھلوان کی طرف نہیں بلندیوں کی طرف لپکتی۔ پر بجھتی کبھی نہ۔ پیار کی جوت آندھیوں اور طوفان میں جگمگانے کی عادی ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے۔

صبح نور کے تڑکے جب پاس کی پہاڑیوں سے تیتر اور چکور کی پیاری صدا آتی۔ چڑیوں کی چہکار سنائی دیتی۔ تو شمو کے لب دھیرے سے میری ننگی چھاتی سے سرک جاتے۔ وہ اپنے نازک سیمیں بازو میری گرن کے نیچے سے ہولے ہولے کھینچ لیتی۔ اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں سے الگ ہو جاتیں۔ وہ بڑے احترام سے اٹھتی اور دونوں

ہاتھوں سے کمبل کھینچ کر میرے شانوں تک لے آتی--- دیے کو ہولے سے پھونک مار دیتی۔ اور کونے میں بندھی ہوئی بکری کی پشت کو تھپتھپاتی۔ بکری اس کی بات سمجھ جاتی۔ اور اٹھ کھڑی ہوتی--- اور وہ جست کے کٹورے میں دودھ دوہنے لگتی۔ شمو سمجھتی میں سو رہا ہوں۔ لیکن میرا وجدان جاگتا رہتا۔ بجھے ہوئے دیے کی بتی سے جو دھواں نکلتا اس کی بو عجیب سی لگتی۔

جس جست کے کٹورے سے ٹکرا کے دودھ کی دھاریں جو ترنم پیدا کرتیں۔ وہ میں سنتا رہتا۔ گھر کے پچھواڑے شفتالو اور سیب کے پیڑوں میں فاختاؤں کے جوڑے نرم سروں میں غوں غوں کرتے۔ وہ بھی میں سنتا رہتا۔ دودھ دوہ کر شمو آگ جلاتی۔ پانی گرم کرتی۔اور دودھ گرم کرتی۔

جب سب کچھ تیار ہو جاتا تو وہ مسکرا کر بے حد عقیدت سے میری پیشانی چومتی۔ میں آنکھیں کھولتا۔ اسے دیکھتا۔ اس کی ساری عقیدتیں اس کی آنکھوں کی راہ سے میرے سینے میں سمو جاتیں۔

اس لمحے دھوپ کی سنہری کرنیں چاروں سمت پھیل چکی ہوتیں۔ بکری جھونپڑی کے پچھواڑے چر رہی ہوتی۔ اور اس کا ننھا سا بچہ اس کے تھنوں کو کھینچ کھینچ کر چپڑ چپڑ دودھ پی رہا ہوتا۔

دوپہر کی روٹی پکانے میں تو بڑا مزہ آتا---- میں چکور تیتر شکار کر کے لاتا۔ اور پھر انہیں خود ہی انگاروں پر بھون لیتا۔ لیکن روٹی تو بہرحال شمو کو پکانا تھی۔ آگ اس سے نہ جلتی۔ روٹی اس سے نہ پکتی---- اس نے ماں باپ کے گھر میں بھلا یہ سب کچھ کاہے کو پکایا تھا۔ لیکن یہاں اب ایک عورت کی حیثیت سے یہ سب کچھ اسے کرنا تھا۔ اور پھر میں چاہتا بھی یہی تھا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے ہاتھ سے کرے۔ شمسہ کو کوفت ہوتی تو مجھے بڑا مزہ آتا۔ اس کے ناخنوں کا سرخ رنگ اتر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ جگہ جگہ سے جل گئے تھے۔ لیکن وہ میرے من کی بات کیسے جانتی---- وہ چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی کتنی اچھی لگتی۔ بار بار پھونکیں مارتی-- پر آگ نے تو جیسے نہ جلنے

کی قسم اٹھا رکھی ہو---- دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ آنسوؤں کے ساتھ کاجل بھی بہتا۔ اس حالت میں جب وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑتی تو مجھے کیا کیا خوشیاں نہ مل جاتیں۔

یہ سب جھمیلے وہ پیار کے لئے اٹھا رہی تھی۔ ورنہ وہ تو بڑی آسانی سے کسی ایسے گھر جا سکتی تھی۔ جہاں مٹی کے چولہے کی بجائے بجلی کی انگیٹھیاں ہوتیں۔ خانسامے ہوتے۔ چاق و چوبند بیرے ہوتے۔ لیکن شمسہ نے یہ سب کچھ دھتکار دیا تھا' پیار کے لئے----

پھر وہ سب کچھ بڑے چاؤ سے کر رہی تھی۔ اس کی تکلیف دیکھ کر بھی مجھے خوشی محسوس ہوتی۔ وہ گھر گرہستن کی ساری ذمہ داریاں نبھا رہی تھی۔

وہ آرٹسٹک خیال کی لڑکی تھی۔ اس نے زندگی کا ساتھی چنا تو یہ سب کچھ دیکھ کر۔

دولت و ثروت اس کی کسوٹی نہیں تھی۔ یہی وہ نکتہ تھا۔ جو مٹی کے چولہے پر روٹیاں تھاپتے ہوئے اس کا مقام بہت اونچا کر دیتا۔

اور پھر یہ مستقل خواہش نہ تھی کہ شمسہ ساری زندگی ٹیڑھی ترچھی روٹیاں پکاتی رہے۔ بلکہ میری تمنا تھی کہ اس کے ہاتھوں کی نرمی قائم رہے۔ اس کے ناخنوں کا رنگ چمکتا رہے۔ وہ ایک صاف ستھرے گھر کی مالکن کہلائے۔

لیکن جب تک ایسا وقت نہیں آتا۔ وہ یہ دوسری صورت قبول کر لے اور شمسہ نے یہ دوسری صورت قبول کر لی تھی--- بن کہے بن سمجھائے۔ یہ میرے لئے بڑا اطمینان تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دونوں پہاڑی کی چوٹی پر چلے جاتے---- بلندی سے وادی بڑی دلکش لگتی۔ دھان کے ہرے بھرے کھیت۔ بل کھاتی پگڈنڈیاں۔ خود رو پھول۔ سبزہ' اونچے اونچے درخت۔ چڑیوں کی چہک' کبوتروں کے غٹرغوں' دھیمے دھیمے راگ۔ ان بوجھے سروں سے ساری فضا مسحور لگتی۔

ایسے میں وہ میری گود میں سر رکھ کر گنگنانے لگتی۔ پھر یہ گنگناہٹ ابھرتے ابھرتے گانا بن جاتا۔ شمسہ کی آواز میں بلا کا لوچ تھا۔ میں سحرزدہ سا ہو کر اس کے متحرک لبوں سے بہتے ہوئے نغموں میں کھو جاتا۔

ایک دن حسب معمول وہ میری گود میں سر رکھے گا رہی تھی۔ سامنے کے پیڑ پر دو طوطے کان لگائے گانا سننے میں محو تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ سچ مچ شمسہ کے گانے سے مسحور ہو رہے ہوں۔ ورنہ تھوڑی دیر پہلے کس بدتمیزی سے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔

میں نے شمسہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر طوطوں کی طرف متوجہ کیا۔۔۔۔وہ مسکرائی اور جونہی اس نے گانا ختم کیا۔ طوطوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی کرخت آواز میں ٹیں ٹیں کرنے لگے۔ ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد دونوں اڑ کر نیچے وادی میں چلے گئے۔

اچانک نیچے سے بکری کے بچے کے ممیانے کی آواز آئی۔ شمسہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شمسہ کو اس سے بے حد پیار تھا۔ دوپٹہ اٹھا کر وہ بھاگ گئی۔ تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ دوپٹہ ایک جھاڑی میں الجھ گیا۔ دوپٹہ وہیں چھوڑ کر وہ ننگے سر چوکڑیاں بھرتی ہوئی نیچے چلی گئی۔۔۔۔ اس کا یہ الھڑپن بے حد پیارا تھا۔

بچے کو سینے سے لگائے ہانپتی کانپتی وہ پھر ادھر اوپر آ گئی۔ دیر تک اس سے کھیلتی رہی۔ اور اس کے نرم نرم چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

نیچے بکری نے گھاس چرتے چرتے سر اٹھایا۔ بچے کو پاس نہ دیکھ کر وہ بھی وحشت زدہ سی ہو کر میں میں کرنے لگی۔ ادھر بکری کا بچہ بھی شمسہ کی گود میں منمنایا۔ شمسہ ہنس پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں بکری چٹانیں پھلانگتی ہوئی اوپر آ گئی۔

بچہ دوڑ کر اس کے تھنوں سے دودھ پینے لگا۔ بکری نے گردن گھما کر اس کی ٹانگوں کو سونگھا۔ بکری کی آنکھوں میں ممتا کی کومل کومل نرمی تھی۔

شمسہ کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ ایک عجیب جذبے' ایک عجیب خواہش سے سرشار

ہو کر۔۔۔۔ اس کے بند ہونٹوں پر ایک سوال' ایک آرزو رقص کر رہی تھی۔

میں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔۔۔۔ شمسہ پوری طرح بے سدھ تھی۔۔۔

میں نے پیار سے کہا۔

"شمسہ ایک دن تم بھی ماں بنو گی۔ تمہیں بھی ممتا نصیب ہو گی۔ تم بھی اپنی کوکھ پر فخر کرو گی۔ شمسہ وہ دن دور نہیں"۔

اس نے بھرپور اور مطمئن نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"شام ہو رہی ہے۔ چلو چلیں"۔

مگر خواب ٹوٹ چکا تھا۔ گھڑی پر نظر پڑی۔ دو بج رہے تھے۔ یہ تصور کی دنیا نہیں۔ کراچی کے ایک ہوٹل کا کمرہ تھا۔ شمسہ میرے بازو پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے عالم خیال میں کتنا خوبصورت' مستقبل دیکھا تھا۔ کاش! یہ خیال' یہ تصور' حقیقت کا روپ دھار لیتا۔

میں نے اس کی بند پلکوں پر ہولے ہولے انگلی پھیری۔ اس کے غلافی پپوٹے تھرکنے لگے۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

"شمسہ دو بج گئے۔ تمہارے ابا جی نے کار لے کر کہیں باہر جانا تھا"۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک دو لمحے چپ رہی۔ پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح ہنس پڑی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا!"

"شمو! یہ اچھی بات نہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ تمہیں وقت پر واپس جانا چاہیے تھا"۔

وہ میری سنجیدگی محسوس کر کے بولی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اباجی کو منا لوں گی۔ میں کوئی بہانہ گھڑ لوں گی۔ میرے ابا بہت اچھے ہیں"۔

میں اٹھ بیٹھا۔۔۔۔ "شمو اب تم چلی جاؤ"۔

"ہاں" وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ تو شمسہ نے میری طرف دیکھا۔

"بس اب آپ واپس چلے جائیں"۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مسکرا کر چلی گئی۔

میں دوڑ کر بالکنی میں آیا۔ وہ موٹر میں بیٹھ چکی تھی۔ کار ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ موٹر چل پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مڑ کر بالکنی کی طرف دیکھے گی۔ عین اسی لمحے اس نے گردن گھما کر پچھلے شیشے میں سے میری طرف دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں پہلے ہی مسکرا رہا تھا مگر شمسہ کی ہنسی۔

آہ۔۔۔۔ کس قدر موہنی، محبت میں رچی ہوئی ہنسی تھی یہ۔ اس کے دانتوں کی خوبصورت لڑیاں چمک رہی تھیں۔ میرا انگ انگ خوشی سے سرشار تھا اور میرا رواں رواں اس دلکشی ہنسی کا زیربار احسان تھا۔

شمسہ نے مجھے مالا مال کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں وہیں کھڑا بازار کے شور و غل سے بے نیاز۔۔۔۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ یوں کسی عورت کی مخلصانہ ہمت افزائی پر اپنے آپ کو اس کے خلوص کا پابند کر دوں گا۔ شمسہ میرے دل و دماغ اور احساس پر چھا چکی تھی۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی ایسی ہی لڑکی میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اسی قسم کی باتیں، اسی قسم کا مذاق، بالکل یہی مسکراہٹیں، یہی قہقہے، میں ہمیشہ دیکھتا اور سنتا رہا ہوں۔

دل خوش ہو تو دنیا ناچتی اور کائنات رقصاں نظر آتی ہے۔ اس لمحے میں آکاش کے مکینوں سے متکلم تھا۔

"چھم چھما چھم چھم!"

آہ۔۔۔۔ یہ نیلا آسمان کتنا پھیلا ہوا ہے۔ لیکن محبت تو اس سے بھی وسیع تر چیز ہے۔ آسمان تو زمین کے ساتھ مل کر اپنی محدودیت کا احساس پیدا کر دیتا ہے، لیکن محبت کے آسمان کا کوئی افق نہیں ہے۔ وہ لامحدود ہے، بے کنار ہے۔ وہ کہیں نہیں ڈوبتا۔ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ پھیلتا جاتا ہے۔۔۔۔ تاحد نظر۔۔۔۔ بلکہ اس سے بھی آگے۔۔۔۔ جنت کے مکینوں سے بھی بہت آگے۔۔۔۔ اور آگے۔۔۔۔ بہت اوپر خدا کے نور میں ضم ہو جاتا ہے۔

محبت نور ہے۔ نور خدا ہے۔۔۔۔ اور خدا محبت ہے۔

تیسرے دن وہ آئی۔ ٹھیک دس بجے۔ اس کی آہٹ پا کر میں نے خود کو سوتا بنا لیا۔ وہ کچھ لمحے کھڑی مسکراتے ہوئے میرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ گئی میں مذاق کر رہا ہوں۔

اس نے میری ناک پکڑ کر کھینچی۔ میں پتلی کی طرح اٹھ بیٹھا۔ وہ کھٹ کھٹ ہنس پڑی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح مسرور دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے میری گھڑی میں وقت دیکھا۔ اور پھر اپنی گھڑی میں ٹھیک دس بج رہے تھے۔ وہ اترا کر بولی۔

"ہم تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ دس بجے کا کہا تھا۔ اور ٹھیک دس بجے پہنچ گئے"۔

وہ پہلے روز بھی دلیر تھی۔ دوسرے روز بھی۔ آج تو اس کی ایک ایک بات سے شوخی پھوٹ رہی تھی۔

"دیکھو جی۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ ہم آتے ہیں اور ہم سے بات تک نہیں کرتے"۔

"بات تو خیر میں کر رہا ہوں۔ مگر آج یہ تم اور تو کی گردان، کس خوشی میں؟"

"ہوں۔۔۔۔!" وہ منہ بنا کر بولی۔ "دیکھو جی۔ جو ہمیں تم کہے، ہم اسے تم کیوں

نہ کہیں؟"

"سو بار کہو۔ تکلف مجھے بھی پسند نہیں"۔ میں اس کے بالوں کا ایک گچھا اپنے رخسار سے سہلانے لگا۔۔۔ "اور یہ تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں"۔

وہ اچک کر پرے ہٹ گئی۔

"واہ۔۔۔ تمہیں تو پیار کرنا بھی نہیں آتا۔ گندے بالوں کو پیار کرتے ہو۔ آخر ہمارے بالوں میں کون سی خوبی ہے جو ہم میں نہیں۔ ایسا کرو گے تو میں کل قینچی سے کاٹ پھینکوں گی"۔

میں نے اس کے بال چوم لئے۔

"بالوں تک قینچی پہنچے یا نہ۔ لیکن تمہاری زبان کی قینچی بہت خوبصورتی سے چلتی ہے"۔

"تو تم کہنا چاہتے ہو ہم واہیات بکتے ہیں۔ دیکھو جی! ایسا کہو گے تو ہم چپ سادھ لیں گے اور پھر مناؤ گے بھی تو نہیں بولیں گے"۔

"وہ تو ہم مانتے ہیں۔ لیکن کیا کریں۔ ہمیں یہ بکواس اچھی لگتی ہے"۔

"تو گویا ہم بکواس کرتے ہیں"۔

"کسی حد تک!"

"یعنی؟"

"یعنی بہت پیارا پیارا بے حد میٹھا میٹھا جسے سننے کے لئے تمہاری زلفوں کی طرح کئی دراز راتوں کی ضرورت ہے"۔

"صرف چند راتوں کی ندیم۔ صرف چند راتوں کی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں شمو! صرف چند راتیں ہی بکواس سنی جا سکتی ہے۔ ساری زندگی بکواس سننے کے لئے نہیں ہوتی"۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ندیم!" وہ تڑپ سی گئی۔

"دیکھو شمو! حقیقتیں جب اپنے گھناؤنے روپ میں سامنے آتی ہیں تو بکواس کو

اپنے بکواس ہونے کا یقین آ جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کھلی حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کرتی"۔

وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اس بکواس کو محبت کے معنی دے رہی تھی ندیم"۔

"میں بھی اسے یہی معنی دے رہا ہوں شمسہ! لیکن سوچو، جب کسی روز تم ایک بچے کی ماں بن جاؤ گی۔ تو تم مجھے بکواس سنانے کی بجائے اسے لوریاں سنانی شروع کر دو گی۔ میرا موڈ ہلکی میٹھی سٹرونگ چائے پینے کا ہو گا اور تم اسے اپنا میٹھا میٹھا گرم دودھ پلانے پر اصرار کرو گی۔ میں تمہیں پیار کرنے کی خواہش کروں گا تو تم اسے سلانے پر بضد ہو گی۔ میری چاہت اور تمہاری بکواس ممتا کی حقیقت بن جائے گی۔ اور یہ حقیقت میری راتوں کو ویران کر دے گی"۔

"اوہ۔۔۔" اس کے سینے سے جیسے بوجھ اتر گیا ہو۔ "تم کتنے ظالم باپ ہو۔۔۔!"

یہ وہ اس طرح بولی۔ جیسے سچ مچ اس کی گود میں بچہ ہو اور میں اسے مجبور کر رہا ہوں کہ وہ اسے پنگوڑے میں روتا بلکتا پھینک کر میرے سینے سے لگ جائے۔

ممتا کے جام میں بھی کتنا نشہ ہوتا ہے۔

"دیکھو جی" اس نے پھر پچھلے موڈ کی طرف چھلانگ لگائی۔ "میں بچہ وچہ نہیں جنوں گی۔ میں تم سے سیدھا سیدھا پیار کروں گی۔ تاکہ بچے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور تمہاری خودغرضی زندہ رہے۔ مجھے تو بس تمہاری خودغرضی سے غرض ہے"۔

میں نے اس کے دونوں رخسار چوم لئے۔

یہ سیدھا سیدھا پیار بھی کتنا اچھا ہوتا ہے۔ انسان اپنی ماں کو چوم لیتا ہے۔ بہن کو چوم سکتا ہے۔ بچے کو چوم لیتا ہے۔ پھول کو چھو لیتا ہے۔ شمسہ نے کتنی بڑی بات کس قدر سیدھے انداز میں کہہ دی تھی۔

اس کی کنواری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا اور وہ میرے بالوں بھرے بازو پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

حیات' خاموشی کا نام نہیں۔ زندگی ساز سننے کی عادی ہے۔ جیون ہنگاموں سے عبارت ہے۔

یہ جو منڈیروں پر چڑیاں چہک رہی ہیں۔ یہ جو ہر گھر کے کسی کونے کھدرے میں چار تنکوں کا گھونسلہ بنا ہوا ہے اور جس میں گلابی مائل ننھے ننھے دودھ جیسے انڈے پڑے ہیں۔ یہ جو نور کے پردے میں ننھی ننھی روحیں پل رہی ہیں۔ یہ جو کچے کچے گوشت کے بے بال و پر بچے بے تابی سے چیں چیں کر رہے ہیں۔ یہ جو اپنی زرد زرد' نرم نرم' کچی چونچیں اپنی ماؤں کی پکی چونچوں میں ڈال کر جیون کا رس چوس لیتے ہیں اور پھر کسی پندرھواڑے' پھر سے اڑ کر فضاؤں میں تیرنے لگتے ہیں اور پھر منڈیروں پر آ بیٹھتے ہیں--- اور پھر چہکنے لگ جاتے ہیں۔

یہ چہکار کیا ہے؟ یہ ہنگامہ کیا ہے؟ یہ ساز کون بجا رہا ہے؟

یہ ساز بجے گا۔ یہ ساز ضرور بجے گا۔

ورنہ تخلیق بند ہو جائے گی۔ زمین ویران اور کائنات خاموش ہو جائے گی۔

"آؤ سمجھوتہ کر لیں شمو!"

"سمجھوتہ"۔ وہ چونکی۔ "کیسا سمجھوتہ؟"

میں اس کی گھبراہٹ پر ہنس پڑا۔

"دو پتھر ٹکراتے ہیں تو آگ کی چنگاری جنم لیتی ہے۔ تاریخ سے پہلے' پتھر کے زمانے میں لوگ' چقماق کے پتھر کی رگڑ سے آگ حاصل کرتے تھے"۔

وہ اپنی بے چینی پر قابو پا کر بولی۔ "ہاں کرتے تھے۔ ہمیں اس سے کیا؟"۔

"ہم ان کی اولاد ہیں شمو۔ ان کے وارث۔ دیکھو تم میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیر رہی ہو۔ تم جانے کیا محسوس کرتی ہو لیکن مجھے تو یوں لگتا ہے' جیسے کوئی چقماق سے چقماق رگڑ کر آگ حاصل کر رہا ہو۔ کیا تمہیں اس آگ کی حدت محسوس نہیں ہو

رہی؟

شمسہ نے آتش بار نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ یوں کھینچ لیا۔ جیسے واقعی آگ کا لپکتا ہوا شعلہ اسے چھو گیا ہو--- اس نے نگاہیں جھکا لیں اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ شاید سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

یہ بات تو خیر میں جانتا تھا کہ کوئی لڑکی اس طرح کھلم کھلا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے--- وہ جب پیار کرتی ہے تو پہلے سمجھوتہ کر چکی ہوتی ہے۔ مرد کی قربت ہی سمجھوتہ کی بنیاد پر رکھی جاتی ہے۔ ورنہ صرف دوستی مقصود ہو تو ایک سے ایک بڑھ کر حسین سہیلی' ایک سے ایک بڑھ کر رازدار سہیلی--- لیکن وہاں بالوں بھرا ہاتھ نہیں ملتا۔ بالوں بھری چھاتی نہیں ملتی۔ وہ نسائیت کی نہیں۔ مرد کی درندگی کی بھوکی ہوتی ہے۔

کوئی اسے نوچ لے۔ کوئی اسے دبوچ لے۔ کوئی اس کی ہڈیوں کی کڑک کا ساز بجا لے--- یہ سب کچھ ہو جائے۔ چپکے سے۔ خاموشی سے بڑی بے دردی سے' لیکن کوئی اس سے پوچھے نہیں۔ کوئی اس کی مرضی نہ ٹٹولے۔ کوئی اس کی اجازت طلب نہ کرے۔ بس اسے دبوچ لے۔

میں نے اس کے چٹکی بھری۔

"شمو! روٹھ گئیں تم؟"

"تم مجھے زیادہ دق کرو گے تو میں نہیں آؤں گی"۔

"نہیں بھئی نہیں۔ ہم کان پکڑتے ہیں۔ توبہ کرتے ہیں۔ آئندہ تمہیں دق نہیں کریں گے"۔

شمسہ ہنس پڑی اور بولی۔

"ندیم! کل پروین کو لاؤں گی۔ پر تم اس پر ریجھ نہ جانا۔ بڑی خوبصورت ہے کم بخت!"

"یقیناً وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہو گی جو تم اس طرح احساس کمتری میں مبتلا

ہو"۔

"ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ اگر میں مرد ہوتی تو اسی سے شادی کرتی"۔ پھر اس نے پرس سے تصویر نکالی۔

"یہ ہے اس کی تصویر"۔

شمسہ کی باتوں سے جو تصور بندھ گیا تھا۔ تصویر دیکھ کر ٹوٹ گیا۔ میں بے دلی سے بولا۔ "ہاں ٹھیک ہے"۔

وہ بولی۔ "صرف ٹھیک' اس کی تعریف نہیں ہے۔ اس کی آواز بڑی شیریں ہے۔ اس کی ادائیں بڑی دلفریب ہیں۔ اور اس کی ہنسی پہاڑی آبشار کی طرح دلکش ہے!"

میں نے کہا۔ "یہ سب باتیں ہوں گی--- لیکن مجھے اس سے کیا۔ تم یہ بتاؤ کلفٹن کب لے چلو گی۔ منوڑہ کب چلیں گے۔ وہ ہلکی میٹھی سٹرونگ چائے کب پلاؤ گی۔ اماں سے کب ملاؤ گی۔ سنیما کس دن ساتھ ساتھ بیٹھ کر دیکھیں گے؟

وہ ہنس پڑی--- "آج ہی تو تم سے کھل کر بات کی ہے۔ آج ہی تو آپ سے تم بنایا ہے۔ اب تمہارے آتے ہی یہ سب کچھ شروع ہو جاتا تو کیا خاک مزا آتا"۔ چند لمحے ٹھہر کر بولی۔

"مجھے سارے وعدے یاد ہیں۔ ایک ایک کر کے نبھاؤں گی"۔

"کیسے؟"

"ایسے!" اس نے جھٹ سے ایک چوٹی کھولی اور بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے میری دونوں کلائیاں ساتھ ساتھ باندلیں۔ "یہ ریشمی بندھن ہے اور ریشم کی گانٹھ نہیں کھلا کرتی۔ سمجھے میری طاقت!"

میں نے ہاتھ کھینچ لئے تو شمسہ کا سر میری گود میں آ گیا۔

"یہ تمہاری طاقت تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں جدھر جاؤں گا۔ تم پابند و مجبور رسی میں بندھے ہوئے بچھڑے کی طرح میرے پیچھے آؤ گی"۔

وہ ہنس پڑی--- "یہ کمزوری' تمہارے گلے کا ہار بن جائے گی--- یہ گانٹھ نہیں کھلے گی۔ تم اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے اور جس چیز کے لئے تم خود کو مجبور و محبوس پاؤ گے وہ کمزوری نہیں طاقت ہو گی"۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شمسہ کے بال رباب کے تاروں کی طرح کھنچ گئے۔ وہ چیخ اٹھی--- "ندیم' ندیم!"

میں کمرے میں ٹہلنے لگا--- شمسہ بھی میرے ساتھ ساتھ---- رباب کے تار کبھی ڈھیلے پڑ جاتے۔ کبھی تن جاتے۔ اس کے نقرئی قہقہے' شبنمی آنسوؤں میں نہا کر ساز بجا رہے تھے۔ وہ رو بھی رہی تھی۔ ہنس بھی رہی تھی۔ مسرت اور پابندی کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اس کے ہاتھ کھلے تھے لیکن وہ ان سے کوئی کام نہیں لے سکتی تھی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مگر میں اسے کھینچ رہا تھا۔

وہ گڑگڑا کر بولی--- "تم بڑے ظالم ہو"۔

مرد واقعی ظالم ہے۔ عورت واقعی مظلوم ہے۔

عورت کا وجود محبت کے خمیر سے اٹھایا گیا ہے۔ عورت محبت کرتی ہے۔ وہ محبت کے لئے مجبور ہے۔ وہ محبت کو تلاش کرتی ہے۔ محبت کو پا کر اس کے ہاتھوں میں ریشمی زلفوں کی ہتھکڑیاں پہنا دیتی ہے' کہ محبت کہیں چلی نہ جائے۔ محبت کہیں روٹھ نہ جائے۔ محبت کہیں اسے اکیلا نہ چھوڑ دے۔ لیکن کسی روز یہی ہتھکڑی اس کی مظلومیت کی کہانی بن جاتی ہے۔ پھر اس کہانی میں رباب کے تاروں کا نغمہ نہیں گونجتا۔ پائل کی چھن چھن نہیں ہوتی۔ لوہے کی ہتھکڑی کی جھنکار ہوتی ہے۔

اس جھنکار میں مجبوری اور خوشی کی ملی جلی کیفیت نہیں ہوتی۔ نوزائیدہ بچے کی ہنسی کا تقدس نہیں ہوتا۔

ایک کمزور لڑکی صرف پیار کر سکتی ہے۔ عصمت بخش سکتی ہے۔ پیار کے لئے بٹ سکتی ہے۔ مگر تلوار نکال کر اپنے پیار کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس کے بازو کمزور ہیں۔ اس کے شانے بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے سینے میں معاشی تھپیڑے سہنے کی

قوت نہیں ہے۔ وہ دوسرے کو پا لے۔ دوسرے کو اپنا لے۔ دوسرے کو باندھ لے پھر بھی کھنچی وہ جائے گی۔ گھسیٹی وہ جائے گی۔ پابندی اس کا مقدر ہے۔ مجبوری اس کا نصیب ہے اور صبر اس کی قسمت ہے۔

یہ سب سوچتے سوچتے میں ہنس پڑا۔

"بتاؤ شمو۔ ہم میں سے کون طاقتور ہے۔ تمہارا دعویٰ یا میری قوت؟"

وہ بولی---- "تم میرے بال کھینچ سکتے ہو۔ انہیں جڑ سے اکھیڑ سکتے ہو۔ لیکن ریشم کی گانٹھ تو پھر بھی نہ کھلے گی۔ پیار کا بندھن پھر بھی نہ ٹوٹے گا۔ عورت کا پیار تیرا پیچھا کبھی نہ چھوڑے گا"۔

میں نے بے حد پیار سے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ وہ مسکرائی اور پھر دھیرے دھیرے اس نے میری کلائیاں ریشمی بندھن سے آزاد کر دیں۔ دونوں کلائیوں پر گلابی گلابی حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ اسے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ میں اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر بڑی وارفتگی سے وہ ان حلقوں کو اپنے شہابی رخساروں سے سہلانے لگی۔

مجھے یوں لگا۔ جیسے بادلوں نے مجھے اپنے شہپروں پر اٹھا لیا ہے۔ میں اکیلا نہیں شمسہ بھی میرے ساتھ ہے۔ لیکن ہمارا وجود ایک ہو چکا ہے۔ ہم ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں---- ہم ایک ہیں۔ ازل سے ایک ہیں اور ابد تک ایک رہیں گے---!



اگلے روز حسب معمول میں شمسہ کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن جوں جوں انتظار کے لمحے طویل ہوتے گئے۔ توں توں میری بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ اور پھر ایک وقت ایسا آ گیا کہ مجھے یقین ہو گیا--- آج شمسہ نہیں آئے گی۔

بڑھتی بے چینی کی تکلیف اپنے رنگ کی تھی--- اور نہ آنے کے یقین کی گرفت اپنی جگہ تھی۔

شروع شروع میں انتظار کی کیفیت میں ایک تڑپ سی تھی۔ پھر یہ تڑپ ستانے لگی۔ شمسہ کیوں نہیں آئی۔ کیوں نہیں آئی؟

شمسہ کو وہاں کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ نہ ماں باپ' نہ بہن بھائی' نہ سماج' نہ زمانہ--- اس کی محبت ہر چیز سے طاقتور ہے۔ وہ نڈر ہے۔ بہادر ہے۔ دلیر ہے--- پھر---؟"

پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ گھر میں جھگڑا نہ ہو گیا ہو؟

یا خدا---- کیا بھید ہے۔ کیا راز ہے۔ وہ کیوں نہیں آئی؟

لمحہ لمحہ میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ بڑھتی چلی گئی۔

شمسہ میری ہے---- وہ اس دنیا میں اس لئے آئی ہے کہ صرف میں ہی اسے پاؤں۔ خود میں اس دنیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اسے پاؤں۔ یہ قدرت کی منشا تھی۔ یہ اللہ کی مرضی تھی۔

شمسہ میری ہے۔ وہ میرا حق ہے۔ ہم نہ کسی کا حق چھینیں گے اور نہ اپنا حق چھوڑیں گے---- نہ بے انصافی کسی کے ساتھ کریں گے۔ نہ اپنے ساتھ بے انصافی ہونے دیں گے۔

انسان دنیا میں انمول چیز کو نظرانداز کر سکتا ہے۔ مگر محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی محبت کو چھوڑ نہیں سکتا۔

رات بھی آگئی۔ مگر شمسہ نہ آئی۔

کیا کیا شبہات مجھے ستاتے رہے۔ کن کن توہمات نے مجھے بے چین کئے رکھا۔ کیا کیا خیال ذہن میں آتے رہے۔

ایک میں تھا۔ اور ہزار وسوسے۔

صبح ہوئی---- مرجھائی مرجھائی صبح---- پھیکی پھیکی---- تھکی تھکی مضمحل سحر، جیسے اپنا طلسم کہیں بھول آئی ہو۔

مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا---- یہ لوگ کہاں دوڑ رہے ہیں۔ یہ رکشے یہ موٹریں یہ بسیں کہاں بھاگی جا رہی ہیں۔ یہ زندگی کس تگ و دو میں مصروف ہے۔ یہ لوگ چاروں افق پھیلی ہوئی محرومیت اور اداسی کا غبار کیوں نہیں دیکھتے۔ اف!

زندگی میں محبت کے سوا بھی کوئی تسلی ہو سکتی ہے؟

آج میں کس کا انتظار کروں گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میرا آج بھی کل کی طرح نہیں ہو گا۔ میں کیا جانوں۔ کل کیا ہو چکا ہے اور آج کیا بیتے گی؟

میں کس سے پوچھوں۔ کس پر الزام لگاؤں؟

کون بے قصور ہے۔ کون خطاوار ہے؟

شاید آج شمسہ آ جائے۔ شاید آج سلمٰی یا زاہدہ آ جائے۔ شاید آج پروین آ

جائے اور شاید آج کوئی بھی نہ آئے۔

یہ فرض کر لینا کتنا مشکل ہے کہ آج کوئی نہیں آئے گا۔ آج کوئی سندیسہ نہیں پہنچے گا۔ یہ نہ آنے کے معنی آنا کیوں نہیں۔ تلاش کے معنی پانا کیوں نہیں۔ اور پریشانی کے معنی خوشی کیوں نہیں؟

یہ لفظوں کو موسیقی کس نے دی ہے۔ یہ لفظوں کو فریاد کس نے بخشی ہے۔ وصال کے لفظ سے راحت کی تسکین کیوں ہوتی ہے اور ہجر کے لفظ سے دل ڈوبنے کیوں لگ جاتا ہے---- ہجر کی طرح وصال کا نتیجہ کیوں نہیں ملتا---- اور وصال کا احساس ہجر کی طرح تکلیف دہ کیوں نہیں ہوتا؟

لفظوں میں بھی آدمیوں کی طرح طبقے ہیں۔ قبیلے ہیں۔ خیل ہیں۔ ذاتیں ہیں۔ یہاں بھی اونچ نیچ، پنجابی، پٹھان، سندھی اور بنگالی کا سوال ہے۔ یہ سب انسان کیوں نہیں کہلانا چاہتے---- یہ لفظ ہمیں اتنا شدید تاثر دے کر اتنا کمزور، تنگ نظر اور متعصب کیوں بنا دیتے ہیں---- آخر پٹھان کہلوانے سے کتنی عمر بڑھ جاتی ہے۔ پنجابی کہلوانے سے کون سا امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ اور بنگالی کہلوانے سے کون سا احساس تسکین پاتا ہے۔

ٹیگور کا نام اقبال ہوتا تو کیا ہوتا۔ اقبال کا نام ٹیگور ہوتا تو کیا ہوتا---- دونوں کی روحیں انسان کی بھلائی کے لئے تڑپتی رہیں۔ پھر دونوں کے نام سے ہم الگ الگ معنی کیوں پیدا کرتے ہیں؟

سب قومیں ایک قوم کیوں نہیں بن جاتیں؟

سب نفرتیں ٹکرا کر چور چور کیوں نہیں ہو جاتیں؟

آہ---- محبت اور محرومی مل کر بھی ایک چیز نہ بنیں گی۔ خدا اور بھگوان کے گھر بھی تو الگ الگ ہیں۔

یہ لفظ کتنے ظالم و جابر ہوتے ہیں۔ ان کا معنوی تاثر کتنا شدید ہوتا ہے۔ یہ محبت کاٹتے ہیں۔ نفرت بوتے ہیں۔ خوشی دیتے ہیں۔ خوشی چھین لیتے ہیں۔

ان کا جامہ وہ جامہ ہے۔ جو پھٹتا ہے نہ میلا ہوتا ہے اور نہ اترتا ہے۔ یہ موت کی طرح انسان پر حاوی ہیں۔

یہ قرآن اور انجیل کو ان کے ناموں کی طرح الگ الگ عزت بخشتے ہیں۔

عجیب بات ہے۔ انسان اپنے تخلیق کئے ہوئے لفظوں کے خوف سے کانپ رہا ہے۔۔۔۔ جب انسان ماں کی کوکھ سے باہر آتا ہے تو روتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو روتا ہے۔ نیند آنے لگتی ہے تو روتا ہے۔ رونے کے سوا اور کوئی زبان اس کی نہیں ہوتی۔ کوئی قومیت نہیں ہوتی۔ کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پھر دھیرے دھیرے ہم اپنی کیفیات' اپنے احساسات' اپنی آنکھوں کی راہ سے' اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اور زبان سے لفظوں کی شکل میں ڈھال کر لاشعوری طور سے اس کے ذہن میں ڈال دیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ اس کی ضرورتیں بھی لفظوں کی شکلوں میں ڈھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے جذبات و احساسات زبان کی لڑی میں پرونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ آس پاس سے متاثر ہو کر ایک مصنوعی انسان کی شکل ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ باپ کے مذہب کی طرح لفظوں کی کیفیت کی زنجیریں بھی ورثے میں پاتا ہے۔ گویا اس کی خوشی بھی مصنوعی' اس کا غم بھی مصنوعی۔

اس کا تعصب بھی جھوٹا۔ اس کی محبت بھی جھوٹی اور اس کی نفرت بھی جھوٹی۔

لیکن یہ تڑپ' یہ کسک' یہ خلش۔۔۔۔ جو آج زندگی میں پہلی بار میں نے محسوس کی ہے۔ میری اپنی ہے۔ میری ذاتی ہے۔ یہ مجھے باپ سے ورثے میں نہیں ملی۔ اس نے آج ہی جنم لیا ہے۔ آج ہی پروان چڑھی ہے اور شاید آج ہی مرجائے۔ اور شاید آج نہ مرے۔۔۔۔ اور شاید کل بھی نہ مرے اور شاید کبھی نہ مرے!

میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ معصوم جذبہ باپ کی چھوڑی ہوئی کسی زنجیر کی کڑی نہیں۔۔۔۔ یہ سب سے نرالی' الگ اور انوکھی حقیقت ہے اور شاید اسی حقیقت کا نام محبت ہے۔

مجھے ایسا لگا کہ میں بہت دنوں سے محبت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ شمسہ کو دھوکہ دیتا

چلا آ رہا ہوں۔ لیکن وہ ندیم تھا۔ میں نہیں تھا۔ ندیم نے کتابوں کی محبت پڑھی تھی۔ وہ مصنوعی انسان کی طرح محبت کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ الفاظ کی کیفیتوں میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ:۔

میں آج ان فرسودہ بندشوں کو سمجھا ہوں۔ آج نیا انسان بن کر محبت کے درد کو سمجھا ہوں۔ میں آج نئے سرے سے شمسہ کو پیار کر رہا ہوں۔ آج اپنی وجہ سے شمسہ کو چاہ رہا ہوں۔ یہ تعلق بالکل نیا تعلق ہے۔ یہ بندھن نیا بندھن ہے۔ جو شمسہ کے وجود سے ماوراء ہے جو شمسہ کی زندگی اور موت سے بے نیاز ہے۔

شمسہ آئے یا نہ آئے۔ اب میں اپنے من کو تسکین دے سکتا ہوں۔ محبت کرنا ہی اپنی جگہ بڑی تسکین ہے۔ پانا اور کھونا تو ادلتے بدلتے رنگوں کی کہانی ہے۔ آج پایا کل کھویا۔ آج کھویا کل پایا۔ مگر محبت پانے کے بعد کھو نہیں سکتی۔

جسم آج جوان ہے کل بوڑھا ہو جائے گا۔ مگر محبت سدابہار ہے۔ سدا سہاگن ہے۔ آج کی طرح کل بھی جوان رہے گی۔ ہمیشہ جوان رہے گی۔

شمسہ آئے' شمسہ نہ آئے' میں ہمیشہ اس کا انتظار کروں گا۔ یہ کون سا طریقہ ہے کہ صرف آنے والے کا انتظار کیا جائے۔ نہ آنے والے کے انتظار میں بھی بڑا مزہ ہوتا ہے۔۔۔۔ آنے والا تو ایک دن آ جائے گا۔ پھر انتظار کے لئے پیچھے کیا رہ جائے گا۔

بھوک مٹنے کے بعد تو روٹی بھی اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔

بس انتظار کرو۔ اپنی شمسہ کا انتظار کرو۔ آئے بھی تو اس کے جانے کا انتظار کرو تاکہ کل پھر آنے کا انتظار کر سکو۔

معاً ہولے سے دروازے پر دستک ہوئی۔

میرا دل دھڑکا۔ شمسہ تو نہیں ہو سکتی۔ شمہ تو اب دستک دیئے بغیر سیدھی اندر آ جاتی ہے۔

پھر کون ہو سکتا ہے' میں اٹھ کر دوازے کی طرف گیا۔ کھولا۔ کوئی بھی نہیں

تھا۔ باہر جھانکا۔ پہلے دائیں پھر بائیں۔

شمسہ دیوار سے لگی ہنس رہی تھی۔

شمسہ کو اچانک اتنا قریب پا کر ایک لمحہ کے لئے میں چکرا گیا۔

"آیئے"۔

میں بے دلی سے مسکرایا۔ اپنے لہجے کا غیر قدرتی پن بری طرح محسوس کیا۔ اس کی ہلکی پھلکی ذہنی کیفیت کے برعکس میرا ذہن بھاری بھرکم خیالات کی وجہ سے بوجھل تھا۔ ایک دن کی فرقت کے صدمے نے لذت الم کا روپ دھار کر میرا دل بھاری کر دیا تھا--- مجھے ایسا لگا کہ شمسہ کی ہنسی نے میرے غم کو حقیر سی چیز سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہے۔ مجھے سبکی محسوس ہوئی۔

آج اس کی آمد پر میں نے پہلی بار دروازہ بولٹ نہیں کیا تھا اور چپکے سے آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شمسہ نے پرس تپائی پر رکھا اور مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ لاشعوری طور پر سہی۔ مگر میری زیادتی تو ہے کہ اس کی قربت اور موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔

میں اٹھا' دروازہ بند کیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔

وہ بدستور ہنس رہی تھی اور بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں' گویا مجھے چڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

آج وہ میری پسند کا کریم کلر کا سوٹ پہن کر آئی تھی۔ میں نے اس کی بھی تعریف نہ کی۔ ارادتاً" نہیں۔ بلکہ ہو نہ سکی۔

وہ بولی۔

"دیکھئے صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے ہیں شاید"۔

صاحب اور آپ' اس کے موڈ کی صحیح ترجمانی کر رہے تھے۔

"بات یہ ہوئی کہ چند بے حد عزیز مہمان آ گئے تھے۔ جن کی وجہ سے کل نہ آ سکی۔ معذرت چاہتی ہوں۔ ہاتھ جوڑتی ہوں"۔

مجھے شمسہ کا یہ انداز بالکل اچھا نہ لگا۔ وہ اپنے ایک دن کی غیر حاضری کو اتنی کم تر سطح پر لے آئی تھی۔ میں نے تو اس کی غیر حاضری کو بڑی عزت دی تھی۔

ہر چند میں نے اپنی کمزوری پر غالب آنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود دل بھر آیا۔ اور میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ مگر میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے بولا۔

"چائے کے لئے آرڈر دے آؤں"۔

مگر میرے لہجے نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میری آواز غبارے کی طرح پھٹ گئی۔ دروازے تک کا فاصلہ جیسے میلوں کا فاصلہ بن گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری پشت پر میری بے بسی کی کہانی درج ہے۔ اور شمسہ نے اسے پڑھ لیا ہے۔

غسل خانے میں میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ نہ جانے کتنی کیفیتیں مل جل کر آنسو بن گئی تھیں------ پھر بھی ایک بات واضح تھی کہ یہ رونا' محبت کے لئے' محبت کا رونا تھا۔

چائے کے آنے تک میں دل کا غبار دھو چکا تھا۔ بیرے کو دروازے سے واپس کر کے ٹرے خود اندر لایا---- شمسہ اب سنجیدہ بیٹھی تپائی پر پڑے اپنے سیاہ پرس کو گھور رہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اب بھی مذاق کے موڈ میں ہو گی۔ لیکن خلاف توقع چپ چاپ ہونٹ چبا رہی تھی۔ غالباً" اس نے میری آتما کی لرزش محسوس کر لی تھی۔ ایک طرح سے اس میں بھی اطمینان کا ایک پہلو تھا۔

میں چائے بنانے لگا تو شمسہ نے ٹرے اپنی طرف کھینچ لی۔ میں ہنس پڑا وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔ چائے بن گئی۔ میں اب موڈ میں تھا اور چسکیاں لے لے کر اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ شمسہ کی نظریں چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی ہواڑ پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے ہنس کر کہا "چائے ٹھنڈی ہو جائے گی تمہاری"۔

اس نے چھوٹے بچوں کی طرح حکم مانا۔ ایک گھونٹ بھر کر پیالی دوبارہ پرچ میں

رکھ دی۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے آنسوؤں نے اسے خاصی تکلیف دی ہے اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے اور کس طرح اس کی تلافی کی جائے۔

وہ جو کچھ پہلے کہہ چکی تھی۔ شاید اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ بہت چھوٹی بات تھی۔ نہ آنے کی شرارت' ایک بچگانہ چھیڑ تھی۔ لیکن میرے آنسو غیر معمولی بات تھی۔

میں چائے پی کر پیالی خالی کر چکا تھا۔ لیکن شمسہ کی پیالی اسی طرح بھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"چائے بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی شمسہ!"

شمسہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر تکئے پر سر رکھ لیا اور رونے لگی۔

"واہ بھئی واہ"۔ میں ہنس پڑا۔ "یہ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات ہوئی۔ دست بدست لڑائی اور فوری انتقام۔ اٹھو بھئی شمو یہ کیا کر رہی ہو"۔

میں نے اسے پکڑ کر کھینچا۔ مگر وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں ندیم۔ میں بہت ذلیل ہوں۔ بہت حقیر ہوں۔ میں اتنی چھوٹی بات سوچ لیتی ہوں جو آپ کی رفعتوں کو چھو تک نہیں سکتی۔ مجھے ہمیشہ اپنی توقع سے اتنا زیادہ ملتا ہے جس کی میں مستحق ہی نہیں ہوتی"۔

"یہ تم کیا کہتی ہو شمی! کیسی پہیلی لڑکی ہو"۔

"ندیم تم نہیں جانتے میں کل جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا تم مجھ سے جواب طلبی کرو گے۔ مجھے مارو گے' پیٹو گے۔ لیکن تم نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا"۔

"اوہ---- یہ بات ہے۔ تو میں ابھی تیری مرمت کر لیتا ہوں"۔

"اب کیا فائدہ" وہ بالکل بچہ بن کر بولی--- "اب تو تم مجھے اتنی بڑی سزا دے چکے ہو جو میری طلب سے بہت تھی۔ میں تنگ نظر سی لڑکی۔ اتنی بڑی مار کھا کر

پھوٹوں گی نہیں تو اور کیا کروں گی!"

"دیکھو بھئی مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ ہاتھ جوڑتا ہوں"۔

مگر وہ اسی رنگ میں بولی۔

"ندیم! تم اتنے بڑے ہو کہ مجھے اب خود کو چھوٹا سمجھنے میں ذرا بھی افسوس نہیں ہو رہا۔ لیکن اگر مجھے ساتھ رکھنا ہے تو پھر خود کو میری سطح پر لے آؤ یا مجھے اپنی سطح پر لے جاؤ"۔

میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اٹھائی۔

"سچ مچ بہت باتونی لڑکی ہو۔ ہنستے ہوئے تو بولتی ہو۔ روتے ہوئے بھی چپ نہیں رہتیں"۔

اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے رخساروں پر رکھ دیئے۔

"تم نہیں جانتے ندیم! میں تم سے کتنی دب گئی ہوں۔ کتنی بے بس ہو گئی ہوں۔ تمہارے سامنے۔ تمہاری ہر ادا انوکھی' ہر بات نرالی ہے' میں نے جو سوچا پایا۔ لیکن میرے مانگنے کے انداز میں جو سفلہ پن ہوتا ہے وہ مجھے اس وقت محسوس ہوتا ہے جب تمہارے دینے کی شان دیکھتی ہوں۔ تم نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ میں ایک کمتر سی لڑکی اتنے بڑے آدمی کو کیوں کر حاصل کر سکوں گی۔ ندیم میں روتی اس لئے ہوں کہ میری یہ کمزوری میرا یہ چھوٹا پن صرف تمہارے رحم کا محتاج رہ گیا ہے۔ میرے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں جس کے زور سے میں تمہیں پابند کر سکوں!"

"بیوقوف!" میں نے اسے اٹھا کر چھاتی سے لگایا۔ "دیکھو تم میری چھاتی سے لگی ہوئی ہو۔ آج تک کوئی لڑکی اس خلوص کے ساتھ میری چھاتی سے نہیں لگی۔ لو دیکھو میں تمہارا بوسہ لیتا ہوں' مجھے نور کی طرح اس مقدس بوسے کی قسم ہے شمسہ! میں نے آج تک اس خلوص سے کسی لڑکی کا بوسہ نہیں لیا۔ یقین کرو شمسہ! تمہارے

بوسے سے جو کیف ملتا ہے آج تک مجھے نصیب نہیں ہوا۔ تم میرا اور اپنا موازنہ نہ کرو۔ مجھے اس حیثیت سے نہ دیکھو کہ میں کیا ہوں۔ تم صرف یہ دیکھو کہ میں ایک آدمی ہوں۔ آدم کا بیٹا' جسے تم پسند کرتی ہو جو تمہیں پسند کرتا ہے۔ دو پسند مل کر ایک مقدس بوسے کو جنم دیتے ہیں۔ اور یہ بوسہ ہمارا تمہارا رشتہ ہے۔ یہ بوسہ ہماری زندگی میں نکہتیں پھیلائے گا۔ یہ بوسہ ہمارے مستقبل کو طہارتیں بخشے گا اور یہ بوسہ ہماری روحوں کو سعادتوں سے مالا مال کر دے گا"۔

شمسہ خاموش میرے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی گداز گرفت میں ایک ایسی وارفتگی تھی جو میری روح کی گہرائیوں تک اتر گئی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اس کی پیشانی' اس کی بند غلافی آنکھیں اس کے ہونٹ' اس کے رخسار' اس کی ٹھوڑی اور اس کی گردن' اس وارفتگی سے چومتا رہا کہ وہ لرز لرز گئی۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ اور اس کا جسم کانپنے لگا۔

"شمو!" میں نے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

"جی!" وہ ہولے سے بولی۔

"آنکھیں کھولو شمو"۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا---- "مجھے نیند آ رہی ہے ندیم' مجھے نیند آ رہی ہے"۔

وہ دوسری دنیا سے بول رہی تھی۔ اس کا انگ انگ لرز رہا تھا اور اس کا جسم دہکتے ہوئے لوہے کی طرح گرم ہو گیا تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ وہ پگھل کر میرے جسم میں گھل مل جائے گی۔ خود میری حالت بھی شمسہ سے مختلف نہ تھی۔ بس اتنا تھا کہ میری آنکھیں ابھی کھلی تھیں۔ یہ احساس بھی تھا کہ میں ابھی جاگ رہا ہوں اور اس کے ہونٹوں اور اس کے جسم کی لرزتی تحریریں پڑھ رہا ہوں۔

پھر خیال آیا۔ کیا میں بھی اس کی نیند میں شریک ہو جاؤں۔ کیا میں بھی خوابوں کی وادی میں چلا جاؤں؟

لیکن میں تو اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ سچے دل سے پیار کرتا ہوں۔ یہ آگ کا کھیل تو شادی کے بعد بھی کھیل ہوتا ہے۔ میں اس سے شادی ہی تو کروں گا۔ مگر بفرض محال یہ شادی نہ ہوئی۔ یا نہ ہو سکی تو اس کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ کیا وہ دل میں یہ نہ سوچے گی کہ وہ برا آدمی جس کے سامنے وہ خود کو کمتر سمجھتی تھی۔ کتنا چھوٹا آدمی تھا۔

وہ اعتماد جو اس نے ماں باپ کی جھولی سے چرا کر ایک اجنبی کی گود میں پھینک دیا تھا۔ کتنا بودا اور کمزور تھا۔

آج وہ میری محبت میں اندھی ہو کر سب کچھ نثار کر دے گی اور کل ہماری شادی ہو جائے تو کیا اس کے احساس میں یہ کانٹا نہ چبھا رہے گا کہ وہ اخلاقی اور تہذیبی تقاضوں سے پہلے زندگی کی راہوں میں بھٹک گئی تھی۔ چاہے میں کتنا عالی ظرف بنا رہوں۔ لیکن شمسہ کے لئے تو گنجائش موجود ہو گی کہ وہ اپنے آپ پر شک کرے۔ اپنے آپ کو ملامت کرے اور اس بات پر فخر نہ کر سکے کہ وہ میرے پاس ایک کنواری دلہن بن کر آئی تھی۔

اور یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ دو طرفہ ذمہ داری ہے۔ عصمتیں دونوں طرف سے لٹتی ہیں۔ عورت کے ساتھ مرد بھی کچھ کھوتا ہے۔ تو بھی ایک سوال اپنی جگہ اٹل نظر آتا ہے کہ اگر عصمتیں محفوظ نہ ہوں تو شادی کی سہاگ رات میں پیار کرنے والے ایک دوسرے کو کیا تحفہ دے سکیں گے۔ وہ کیا چیز ہوتی ہے جو دلہن اپنے دلہا کے لئے محفوظ رکھتی ہے اور وہ کون سا راز ہوتا ہے جو عورت زندگی میں پہلی اور آخری بار مرد کے حوالے کر دیتی ہے؟

مگر شمسہ چشمے کی طرح ابل رہی تھی۔ اس کی دوشیزگی اور نسائیت سمٹ کر میری آغوش میں سما جانا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نسوانی جذبات اور نسوانی حجاب کی کہانی تھرک رہی تھی۔ اس کی ساری نسوانی قوتیں ردعمل کے لئے بیتاب تھیں۔ دل کی ہیجانی کیفیت کے سامنے دماغ معطل ہو چکا تھا۔ وہ کچھ چاہتی تھی۔ کوئی چیز حاصل

کرنا چاہتی تھی۔ اس کا اضطراب۔ اس کی بے تابی۔ اس کی بے چین روح ایک ان دیکھی تسکین کے لئے پھڑک رہی تھی۔

میں خود بھی اس جذبے سے مسحور ہو چکا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ قدرت نے جو کشش پیدا کی ہے۔ اسے زبردستی ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو کیا وہ ختم ہو سکے گی؟

زندگی کی قدریں' حالات کی مجبوریاں اور اخلاقی تقاضے کسی حد تک حقیقتوں کو مفلوج ضرور کر دیتی ہیں------ مگر پھر بھی حقیقت کا روپ باقی رہتا ہے۔

اور پھر یہ زبردستی نہیں تھی۔ اظہار تمنا اور حصول تسکین کی متفقہ خواہش تھی۔ بیمانہ جذبات سے بالکل الگ اور انوکھی سی فطری طلب تھی۔ بوالہوسی اور حیوانیت سے ہٹ کر ایک بوسے کے کیف کی سی سچی خوشی کی آرزو تھی۔

مگر اس کے باوجود اگر ایک طرف آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کی تڑپ تھی تو دوسری طرف ایک فنکارانہ زندگی کا نظریہ تھا---- ایک طرف دل کی بے تابانہ اور پرجوش سیمابی خواہشیں تھیں تو دوسری طرف عزم و استقلال کے اونچے مینار کی عظمت---- ایک طرف خلوت کی رنگین راز کی گرمی تھی۔ تو دوسری طرف شرافت کے سدابہار درخت کی چھاؤں! شرافت جو صبر کا میٹھا پھل دیتی ہے۔ جو تاریکی کو نور سے بدل دیتی ہے جو فرشتے کی طرح سامنے کھڑے ہو کر انسان کو اس کی خواہشوں سے روکتی ہے---- ارادوں سے باز رکھتی ہے۔

نہیں نہیں---- میں شرافت کی کنواری پیشانی کا جھومر نہیں نوچوں گا۔ محبت کی کنواری مانگ کی کہکشاں نہیں مٹاؤں گا۔ اس کی کنواری آنکھوں سے مریم کا تقدس نہیں چھینوں گا۔

نہیں نہیں---- میں نفس کی اس بے وقت پکار سے اس کی دوشیزگی مجروح نہیں کروں گا---- جذبات کے تند و تیز سازوں کی لوری کا ساتھ نہیں دوں گا۔

کیا پتہ کل کیا ہو؟

میں اس کی کنواری گود میں پیار کے بیج بو دوں۔ یہ بیج پھوٹیں گے' پروان چڑھیں گے--- اور جب ان پر بہار آئے گی تو ان کی نکہتیں شمسہ کے زرد چہرے کی کہانی گھر گھر سنائیں گی۔ اس وقت ماں باپ اور بھائی اور دنیا سے پوچھے گی۔ کہاں ہے وہ مالی! جو تیرے چہرے پر بہار کی زردیاں بکھیر کر چلا گیا---؟

تب وہ دل میں سوچے گی--- کون تھا وہ--- کہاں گیا وہ بڑا آدمی۔ جو اس کی جھولی میں ندامت کا سرمایہ پھینک کر چلا گیا؟

کون مانتا ہے کہ یہ پیار کا تحفہ ہے۔ کون مانتا ہے کہ یہ سچی لگن کا پھل ہے۔ کوئی بھی دو جسموں کے فطری اتصال کو بے غرضی تسلیم نہیں کرے گا۔

بالکل یہی صورت شادی کے ایک لفظ سے امتیاز اور فخر کا باعث بن جاتی ہے اور بالکل یہی صورت سماج کی اجازت کے بغیر لعنت کا طوق بن جاتی ہے۔

تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں رہ کر دنیا کے اصولوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"شمسہ اٹھو شمسہ! آنکھیں کھولو"۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے آنکھیں بھی نہ کھولیں۔ وہ اپنے ہونٹ ایسی بے رحمی سے کاٹ رہی تھی جیسے ان کا لہو نکال کر چاٹ لے گی۔

میں نے دوبارہ اسے جھنجھوڑا۔

"دیکھو شمسہ! میں تمہیں سونے نہ دوں گا۔ میں تمہیں بالکل سونے نہ دوں گا!

وہ بدستور خاموش تھی۔ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔

"دیکھ لے یہ تیرے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ تیرے ہونٹ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن ان کے چھونے سے تجھے نیند آ جاتی ہے۔ اب میں انہیں نہیں چھوؤں گا۔ میں شراب نہیں پلانا چاہتا۔ کیونکہ شراب پی کر انسان اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے۔ لاؤ میں تمہاری پیشانی چومتا ہوں۔ دیکھا ہونٹوں اور پیشانی میں کتنا

فاصلہ ہے۔ دونوں میں کتنا تفاوت ہے۔ ایک کا راہی ستاروں کی طرف پرواز کرتا ہے' اور دوسرے کا مسافر پاتال کی گہرائیوں میں پہنچنا چاہتا ہے۔ شمسہ! ہم پاتال کی گہرائیوں میں کیوں ڈوب جائیں۔ ہم اس راہی کا ساتھ کیوں نہ دیں جس کی منزل ستاروں کی دنیا میں جگمگا رہی ہے"۔

شمسہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ دیر تک اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھیں۔ چپ چاپ اور خاموش۔

پھر وہ ہولے سے بولی--- "ندیم!"

"جی!" میں بے حد احترام سے بولا۔

شمسہ کے ہونٹ تھرتھرائے اور دوسرے لمحے اس نے میری پیشانی چوم لی۔ اس کے جسم کا تناؤ ڈھیلا اور اس کی گرفت بھی نرم پڑ گئی۔ زبان سے وہ کچھ نہ بولی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب وہ اٹھ جانا چاہتی ہے' میں آہستہ سے اٹھ بیٹھا' وہ بھی چپکے سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی--- کافی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ آنکھیں جھکائے اپنے پاؤں کو تک رہی تھی--- اور میں دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔

"میں اب جاؤں؟" اس کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

میں ہنس پڑا--- "ابھی تو شام بہت دور ہے"۔

شمسہ نے سر جھٹک کر میری طرف دیکھا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟"

شمسہ کا کھسیانہ پن بے حد دلفریب تھا۔ میں اور کھل کر ہنس پڑا۔

"چائے منگواتا ہوں۔ گرم گرم چائے پی لو گی--- تو شاید میری ہنسی بری نہ لگے"۔

"دیکھو ندیم---" وہ تڑپ اٹھی--- "میں کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کروں گی"۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں شمسہ کہ تم کبھی اپنی شکست تسلیم نہ کرو"۔

وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

"میں کبھی ہار نہیں مانوں گی۔ میں کبھی ہار نہیں مانوں گی ندیم۔ میں تم سے کبھی نہیں ہاروں گی"۔

میں نے مسکراتے ہوئے اسے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔ وہ غڑاپ سے سارا گلاس پی گئی۔

"دیکھو شمو! تیری ہار مجھ سے الگ چیز نہیں ہے۔ اور تیری جیت بھی مجھ سے الگ چیز نہیں ہے۔ ایک کشتی کے سوار ڈوبتے ہیں تو ایک ساتھ ڈوبتے ہیں۔ کنارے پر پہنچتے ہیں تو ایک ساتھ پہنچتے ہیں۔ تم جو کچھ چاہتی تھیں۔ میں بھی وہی چاہتا تھا اور جو کچھ تم نہیں پا سکیں' میں بھی اس سے محروم رہا ہوں۔ ہمارا نقصان برابر کا نقصان ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا برا یا بھلا اس میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ شمسہ تم کبھی خیال بھی نہ کرو کہ میں اپنے مفاد کی خاطر یا اپنی برتری کی خاطر تمہارے مفاد کو یا تمہاری عزت نفس کو بھول جاؤں گا"۔

وہ کرسی سے اٹھ کر پھر پلنگ پر آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر نفسیاتی کھچاؤ کی بجائے طمانیت کی ہلکی سی لہر پھیل گئی۔ شمسہ نے میرا ہاتھ اٹھا کے بڑی عقیدت سے چوم لیا۔

"ندیم! کیا ہم ساری زندگی دوست نہیں رہ سکتے؟"

"کیوں نہیں شمو۔ کیوں نہیں رہ سکتے"۔ اس نے یہ سوال بڑے خلوص سے کیا تھا--- "لیکن شوہر اور بیوی کا رشتہ تو سب سے قوی اور مقدس ہوتا ہے۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتیں؟"

"نہیں ندیم! یہ بات نہیں۔ تم اچھے شوہر بن سکتے ہو۔ لیکن تم دوست بہت اچھے ہو۔ تمہاری دوستی میرے لئے باعث فخر ہو گی"۔

"شمسہ! دوستی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ محبت کا ایک ذرہ دوستی پر ہزار گنا بھاری ہے۔ محبت ہمارے تمام احساسات پر غالب ہے۔ دوستی میں وہ شدت نہیں

ہوتی جو محبت میں ہوتی ہے۔ دوستی کا ناطہ تو کسی مرحلے پر آ کر ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ مگر میاں بیوی کا ناطہ محبت کا ناطہ ہوتا ہے اور محبت کا ناطہ کبھی نہیں ٹوٹتا"۔

وہ مسکرائی۔ وہ میرے بالوں سے کھیلنے لگی۔ اس کی چوڑیاں چھنک اٹھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ پھر چوم لئے۔

وہ ایک دم بپھر گئی۔

"دیکھو ندیم! مجھے پیار نہ کیا کرو۔ بس مجھے پیار نہ کیا کرو"۔

میں ہنس پڑا۔ میں سمجھ گیا۔ شمسہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ یہ انکاری کیفیت کس جذبے کی محرک ہے اور اس فرار میں عورت کی سپردگی کا احساس کس انداز میں ابھرتا ہے۔

"میں تم سے پیار کیوں نہ کروں شمو۔ مجھے تم سے واقعی پیار ہے' میری قربت بڑی بے داغ اور صحت مند ہے۔ میرے من میں کسی پاپ کی پرچھائیں نہیں۔ پھر بتاؤ میں تم سے پیار کیوں نہ کروں؟ اگر میری شکتی میری کمزوری پر غالب آ سکتی ہے تو میں تمہاری شکتی پر اعتماد کیوں نہ کروں۔ میں تمہیں اپنے دوش بدوش دیکھنے کی تمنا کیوں نہ کروں؟"

وہ چڑ کر بولی---- "ہٹ جاؤ پرے ہٹ جاؤ---- بس مجھ سے بیٹھ کر باتیں کرو"۔

میں نے دیکھا سچ مچ اس کے ماتھے پر تیور آ گئے تھے۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔

"دیکھو شمسہ! زیادہ بننے کی کوشش مت کرو"۔

لیکن دوسرے لمحے ایک چھنک کے ساتھ اس کے زعفرانی سیٹ کی دو چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور اس کے ٹکڑے بستر پر بکھر گئے۔ شمسہ نے تیز احتجاجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

مجھے واقعی افسوس ہوا۔

چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اسے بہلانے پھسلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ منہ پھلائے رہی۔ بار بار اس کے کان مروڑے۔ ہلکے ہلکے طمانچے لگائے۔ لیکن اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئی۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ اور زور سے چیخا۔ "شمسہ!"

شمسہ نے نظریں اٹھا کر میرے تیور دیکھے۔ دوسرے لمحے چپکے سے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اکٹھے کئے اور پھر پرس کھول کر اس میں ڈالنے لگی۔ میں نے سارے ٹکڑے اس کے ہاتھ سے لے لئے۔ شمسہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے سارے ٹکڑے بڑے پیار سے اٹیچی کیس کے ایک کونے میں رکھ دیئے۔ وہ یہ سب کچھ بڑے اطمینان سے دیکھتی رہی۔

اب میں نے دوبارہ اسے پیار کیا۔ تو وہ معصوم بچے کی طرح میری گود میں سر رکھ کر مسکرانے لگی۔ اس لمحے وہ مجھے اور زیادہ پیاری لگی۔

"شمو! تم کتنی بے ہودہ لڑکی ہو۔ لیکن میں تمہیں کتنا زیادہ پیار کرتا ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو اتنا نہیں چاہا"۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اور ہنس رہی تھی۔ میرے ننگے بازو پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے پارے کی طرح چمکتے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ پھر اس کے بند گیلے گیلے غلافی پپوٹوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا۔

وہ واقعی سو گئی تھی۔

میں مسکرایا۔ میری نگاہیں اس کے زعفرانی رخساروں پر جم گئیں۔ اس کی گز بھر کی لمبی زبان اور خوبصورت دانت اس کے شریر ہونٹوں کے زعفرانی محل میں سو گئے تھے۔ اس کی گردن پر پسینہ آ گیا تھا اور اس کے سر کے بال اس سے چپک گئے تھے۔ اور اس کے مساموں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے اور وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

لیکن جلد ہی یہ خواب ٹوٹ گیا---- گرمی اور پسینے کی وجہ سے اس کی آنکھ

کھل گئی۔ وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔ گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔

"ارے واہ--- تم نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔ پروین میرا انتظار کر رہی ہو گی"۔

وہ دوپٹہ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھا جی۔ کل پروین بھی میرے ساتھ آئے گی۔ انٹرویو کے لئے تیار رہنا"۔

میں بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے میرا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔

"اچھا بائی بائی"۔

اور وہ چلی گئی------



اگلے روز میں بالکنی میں کھڑا بازار کی چہل پہل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ آج شمسہ کے ساتھ پروین بھی آئے گی اور میرا انٹرویو بھی لے گی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ کسی گرجے سے گھنٹیاں بجنے کی صدا آ رہی تھی۔

"جی ہاں وہ گھنٹیاں گن رہے ہیں!"

معاً کمرے میں ایک قہقہہ گونجا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ شمسہ پلنگ پر لیٹی ہنس رہی تھی۔ اس کے بغل میں ایک سانولی سلونی لڑکی بیٹھی شرما شرما کر اور مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

شمسہ اٹھ بیٹھی۔

"جناب یہ ہیں میری سہیلی پروین اور آپ ہیں ندیم صاحب"۔

"آداب عرض"۔

"آداب عرض"۔

ایک گھنٹی سی بجی۔ نقرئی سی گھنٹی--- شمسہ نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کی آواز میں بڑی کھنک ہے۔ چاندی کی سی۔

"دیکھئے جناب! ہم پندرہ منٹ سے بیٹھی ہوئی ہیں اور آپ بالکنی میں کھڑے

گرجے کی گھنٹیاں گن رہے ہیں"۔

"جی نہیں۔ میں موٹر اور رکشے گن رہا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔"

"مگر ہم پیدل آئی ہیں جناب" شمسہ میری بات کاٹ کر بولی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ پروین بھی ہنس رہی تھی۔

میانے قد کی سڈول جسم والی خوبرو لڑکی۔ تیکھے تیکھے تیور۔ اجلا اجلا لباس' سامنے کے دونوں دانتوں میں ذرا سا فاصلہ۔ نہ صرف اس کی نیک بختی کی دلیل تھی۔ بلکہ اس کے حسن میں چھوٹے بچوں کی سی معصومیت کا اضافہ کر رہی تھی۔

"دیکھو۔ میری سہیلی پر ریجھ نہ جانا!"

شمسہ کے اس فقرے کی صدائے بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔۔۔

خوبصورتی کی جتنی شکلیں سامنے آتی ہیں۔ انسان اس کی جھلک کسی نہ کسی رنگ میں محسوس کرتا ہے۔ کبھی یوں کہ دیکھا۔ محسوس کیا اور بھول گیا۔ کبھی چپکے سے ذہن کے کسی گوشے میں گم ہو گیا۔ اور کوئی مستقل صورت اختیار کر کے حسن کہلایا۔

حالات نے کسی کو پروان چڑھایا۔ کسی کو تھپکی دے کر سلا دیا اور کسی کو مجبوری کہہ کر رخصت کر دیا۔ لیکن تینوں صورتوں میں حسن نے محسوس ضرور کروا دیا کہ میرا نام حسن ہے۔ میں سچائی ہوں۔ میں سینوں میں اتر کر اپنی حقیقت منوا لیتی ہوں۔

میں سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروین مسکراتی نگاہوں سے میری اور شمسہ کی تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ شمسہ نے اس کے کندھے پر ٹھونکا دیا۔

"ادھر کیا دیکھتی ہو۔ تصویر والے دونوں تیرے سامنے موجود ہیں"۔

"بھئی وہ سوچ رہی ہیں کہ ان کی قسمت کب جاگے گی"۔

"جی نہیں"۔ پروین شرمانے لجانے کے بجائے نڈر ہو کر بولی۔ "میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ یہ جوڑ کچھ مناسبت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟"

شمسہ نے گویا اپنے آپ کو شاباش دی۔

"یہ موم کی گڑیا نہیں جناب جو ماچس دکھا کر پگھل جائے گی۔ یہ شمسہ کی سہیلی

ہے شمسہ کی"۔

میں نے لقمہ دیا۔۔۔ "تو پھر کیا خیال ہے آپ کا؟"

بولی۔ "معاملہ کچھ جچا نہیں۔ یہ چڑیل تو آپ کے مقابلہ میں بالکل کمزور سی ہے"۔

شمسہ نے اسے گھورا۔ "تو پھر کیا خیال ہے۔ تمہاری صحت تو قریب قریب ان کے مساوی ہے"۔

میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "یہی تو ان کا مطلب ہے"۔

پروین بولی۔ "اب آپ دونوں کی یہی مرضی ہے تو پھر مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

شمسہ نے دھ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

"بے شرم کہیں کی۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی۔ تو بکواس سے باز نہیں آئے گی"۔

پروین "اوئی" کر کے ہنس پڑی۔

"ندیم صاحب ادھر پلنگ پر آ جایئے۔ اور خدا کو حاضر ناظر جان کر مجھے گواہ بنا کر ان کا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ بس میں توبہ کرتی ہوں"۔

میں ہنس رہا تھا۔ شمسہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی ادا میں ایک تصنع سی آ گئی تھی۔ شرماتے ہوئے بولی۔

"ڈھیٹ کہیں کی"۔

"دیکھئے ندیم صاحب!" پروین جلدی سے بولی۔ "میں سچ مچ ڈھیٹ نہیں ہوں۔ یہ میری انٹروڈکشن تھی۔ میرا تعارفی انداز یہی ہوتا ہے۔ اور پھر آپ کے متعلق تو ہم اتنی باتیں کر چکی ہیں کہ گویا آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ پھر بھی ہم آپ کی شخصیت سے کافی گھل مل چکی تھیں۔ میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو اجنبی نہیں سمجھ سکی۔ اور پھر میں ہوں بھی بہت زود آمیز"۔

مجھے اس کی صاف گوئی بہت اچھی لگی۔

"پروین صاحبہ آپ نے واقعی ثابت کر دیا کہ شمسہ اپنے ذوق کے مطابق اپنے دوستوں کے انتخاب میں کبھی غلطی نہیں کرتی"۔

"نہیں نہیں ندیم صاحب!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "داد مجھے ملنی چاہیے۔ مجھے۔ اس نے مجھے انتخاب نہیں کیا۔ میں نے اسے انتخاب کیا ہے"۔

"جی ہاں"۔ شمسہ احساس برتری کے لہجے میں بولی۔ "بالکل کسی چھوکرے کی طرح میرے پیچھے پڑی رہیں۔ مردوں کی طرح عشق فرماتی ہیں مجھ سے!"

"بالکل ٹھیک ہے ندیم صاحب! بس یوں سمجھ لیجئے' جیسے یہ آپ کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اور اب ہوٹلوں میں ماری ماری پھرتی ہیں"۔

"چپ ری کم بخت!" شمسہ نے ایک اور دھپ جمایا۔

"ہائے!" پروین نے احتجاج کیا۔ "دیکھ لیجئے ندیم صاحب! اس کے ہاتھ بھی چلیں اور زبان بھی۔ اور آپ تماشہ دیکھئے' مسکراتے رہیں"۔

دونوں کی نوک جھونک بے حد دلچسپ تھی۔ میں نے رائے دی۔

"صلح کر لو۔ صلح۔ ورنہ تم تو منٹوں میں ایک دوسرے کے راز اگل دو گی"۔

دونوں ہنسنے لگیں۔

پروین واقعی دلچسپ اور زندہ دل لڑکی تھی۔ وہ بولی۔

"ندیم صاحب! آپ نے ہمیشہ دوسروں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ دوسروں کے دل کی دھڑکنیں سنائی ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ اپنے ذاتی احساسات اور اپنے دل کی دھڑکنیں کس انداز میں سناتے ہیں؟"

"آپ کا مطلب اپنی کہانی سنانے سے ہے؟"

"ہاں" وہ ہنس پڑی۔ "میں سمجھتی ہوں۔ ہر شاعر اور ادیب پہلے کوئی محبت کرے۔ اس کے بعد لکھنا شروع کرے"۔

"تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے پروین!۔ میں آج تمہاری اس چڑیل کو پا کر محسوس کرتا

ہوں۔ اس سے پہلے بھی یہی احساسات تھے۔ تب وہ ایک خیالی شمسہ تھی۔ اب وہ جنم لے کر وجود بن گئی ہے۔ وہ بھی مجھ سے پیار کرتی تھی۔ یہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اسے من کی آنکھیں دیکھتی تھیں۔ اسے تن کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ تڑپ دونوں کی ایک جیسی تھی۔ تسکین دونوں کی ایک جیسی ہے"۔

"سن رہی ہو مس صاحبہ! تمہارے مطلب کی باتیں ہیں"۔ پروین نے اس کا پائینچہ کھینچا۔

"تم ہی غور سے سنو۔ میں تو یہ سب کچھ سن چکی ہوں" شمسہ نے بظاہر بے اعتنائی سے کہا۔

"لیکن ذکر حضور کا ہو رہا ہے"۔

"تم نہیں جانتی پروین۔ وہ ہمہ تن گوش ہے۔ یہ بے نیازی تو بس برائے نام ہے"۔

شمسہ مسکرائی۔ پروین بولی۔

"وہ تو میں سمجھ رہی ہوں۔ مگر چھوڑیئے اس بحث کو۔ چلئے کہیں باہر چلیں سینما یا گھومنے' سمندر کے کنارے۔ کیماڑی یا کلفٹن؟"

"بھئی واہ" میں نے داد دی۔ "مزہ آ جائے گا۔ میں نے ابھی تک کیماڑی اور کلفٹن دیکھی نہیں"۔

"لیکن کلفٹن جانا تو ذرا رسکی ہے"۔ شمسہ نے خطرے کا اظہار کیا۔ "آج اتوار ہے سلمٰی کئی دنوں سے پروگرام بنا رہی تھی"۔ پروین جھٹ سے بولی---

"تو کیماڑی سہی۔ کشتی میں بھی سیر ہو جائے گی"۔

اور دوسرے لمحے پروگرام طے ہو گیا۔ دو رکشے لئے۔ ایک میں۔ شمسہ اور پروین بیٹھ گئیں۔ دوسرے میں۔ میں اکیلا۔ دونوں رکشے چل پڑے۔ ان کا رکشہ آگے تھا۔ دونوں کے درمیان کبھی دس پندرہ اور کبھی بیس گز کا فاصلہ پڑ جاتا۔

رکشے ٹھنڈی ہوا کی چادر کو پھاڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شمسہ اور پروین کے

رنگیلے آنچل فرفر لہرا رہے تھے۔ شمسہ بار بار مڑ کر دیکھتیں۔ اور وہ بے حد خوش تھی۔ خود میرا دل ایک عجیب کیفیت سے سرشار تھا۔

دونوں سرگوشی سی کرتیں۔ مڑ کر دیکھتیں اور پھر کھٹ کھٹ ہنس پڑتیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھا۔ صاف دیکھ رہا تھا۔ دو حسین لڑکیاں' دو نازک جوانیاں' دو خوبصورت دل' ایک مرکز پر محو اختلاط تھے۔

ایک فخر کر رہی تھی۔ دوسری اس کے فخر کو تقویت پہنچا رہی تھی۔ ایک پیار کر رہی تھی۔ دوسری اس کے پیار کے رنگوں میں رنگینیاں بھر رہی تھی۔ مسرت کا ایک تکون تھا۔ جس کے دو زاویے اُس رکشے میں اور ایک زاویہ پچھلے رکشے میں تھا---- سکون تھا' اطمینان تھا' خوشی تھی' مسرت تھی۔ غم کا تو کوسوں نام و نشان نہیں تھا۔

گھاٹ پر پہنچے۔ لانچ تیار تھی۔ پروین بولی۔

"لانچ پر نہیں بیٹھتے۔ میرا تو زیادہ آدمیوں میں دم گھٹتا ہے۔ اکیلی کشتی ٹھیک رہے گی"۔

شمسہ نے بھی تائید کی۔ تینوں کشتی میں بیٹھ گئے۔ شمسہ بیچ میں' پروین اس کے بائیں اور میں دائیں طرف۔

تین نوعمر مکرانی لڑکوں نے جلدی جلدی بادبان کھولا---- کشتی پانی کے سینے پر ڈولنے لگی---- سمندر کا یہ حصہ قدرے پرسکون تھا۔ شمسہ نے بتایا۔

"یہ دراصل سمندر کا مصنوعی حصہ ہے۔ یہاں نیوی کے سپاہی ٹریننگ لیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے جہاز یہاں حفاظت سے ٹھہرتے ہیں۔ سمندر تو ابھی آگے ہے۔ کشتی سے اتر کر پیدل جانا ہو گا"۔

لڑکوں نے ہوا کو کاٹنے کے لئے بادبان کا رخ بدلا۔ تو کشتی بالکل ایک طرف کو لڑھک گئی۔ شمسہ کا بوجھ پروین پر اور میرا بوجھ شمسہ پر آ پڑا۔

شمسہ بولی۔

"شامت میری آئی' جو بیچ میں بیٹھ گئی۔ ادھر کو لڑھکو۔ تو ان کا بوجھ' ادھر لڑھکو تو ان کا بوجھ"۔

پروین نے گرہ لگائی۔

"میرا ہی بوجھ فالتو ہے ورنہ ندیم صاحب کا بوجھ تو یہ کمزور شانے اٹھا سکتے ہیں"۔ "تیرا سر!" شمسہ نے اس کی چوٹی کھینچی۔ "تجھے تو بکواس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اتنا ہی شوق ہے تو ادھر بیچ میں آ کر تو بھی اپنے حصہ بانٹ لے"۔

"نا بابا نا! مجھے یہ بندر بانٹ پسند نہیں۔ آدھے آدھے سے تو کسی کا بھی کام نہیں بنے گا۔ کیوں ندیم صاحب؟"

بھئی خوب۔ اگر کشتی میں نہ آتے تو اتنے سوال کہاں سے جنم لیتے"۔

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ندیم صاحب!"

"ہاں جی" شمسہ نے "جی" کو ذرا کھینچا---- "اسے اپنے مطلب کا جواب دو نا----"

"میں تو اتنا چاہتا ہوں پروین! کہ اگر اس چڑیل سے پہلے آپ مل جاتیں تو شاید میں آپ کو بھی یہ مقام دے دیتا"۔

شمسہ نے اس کی چٹکی لی---- "لو ہو گیا نا کام۔ بس اب مٹھائی بانٹو"۔

لیکن پروین نے ہم دونوں کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور ایک نیا موضوع چھیڑ دیا۔

"ندیم صاحب! آپ کے جواب سے ایک اور نیا سوال پیدا ہو گیا؟"

"کیا؟"

"یہ تو آپ تسلیم کریں گے ناکہ گلاب کے زرد پھول اور سرخ پھول دونوں میں پسندیدگی کی گنجائش موجود ہے؟"

"بالکل!"

"اور یہ بھی تسلیم کریں گے موتیے کی خوشبو اور رات کی رانی کی مہک دونوں

میں ایک مسرت پنہاں ہے؟

"اس میں بھی کوئی شبہ نہیں"۔

"تو گویا حسن جس رنگ اور جس شکل میں بھی سامنے آئے۔ ہم اسے قبول کرنے پر مجبور ہیں؟"

"یقیناً!"

"تب ایک لڑکی کیوں کر ایک مرد پر اعتماد کر سکتی ہے کہ وہ ساری زندگی چاہی جائے گی۔ جبکہ شمسہ کی طرح مجھ میں بھی وہ لپک موجود ہے۔ کسی تیسری میں بھی موجود ہو گی۔ اور کسی چوتھی میں بھی؟"

"یہ سب ٹھیک ہے پروین! مگر اس کے باوجود بھی پسند کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ نیلے پیلے، سرخ سفید اور سنہری فیروزی، ہر رنگ میں ایک تسکین ہوتی ہے۔ مگر ایسے میں بھی جب پسند کا ایک معراج سامنے آتا ہے تو ان سب رنگوں میں آدمی اپنا محبوب رنگ چن لیتا ہے اور وہی انتخاب دنیا کی ان گنت بکھری ہوئی سعادتوں میں سب سے بڑی سعادت ہوتی ہے۔ یہی سعادت کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ انتہا حسن ہوتا۔ یہ حسن محبت ہوتی ہے اور یہ محبت شمسہ بن جاتی ہے۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ پروین کوئی کیوں اپنے انتخاب سے دغا کر سکے گا۔ کوئی کیونکر اپنی محبت کو دھوکہ دے سکے گا اور کوئی کیونکر اپنی شمسہ کو آخری دم تک نہ چاہے گا؟"

"واہ ندیم صاحب!" پروین نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "آپ کی باتوں سے تو من کی ساری کدورت دور ہو گئی---- یہ سوال، یہ شکوک عرصے سے میرے سینے میں پل رہے تھے۔ آج آپ نے یہ کہہ کر میرے سارے غم دور کر دیئے کہ یہ چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں، یہ ننھی ننھی مسرتیں، یہ جائز جائز تسلیاں سب اس بڑی سعادت کی اولاد ہیں جس کا نام محبت ہے"۔

میں نے شمسہ کی طرف دیکھا۔ فرط مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ وہ بے حد مسرور تھی۔

کنارہ آ گیا تھا۔ ایک لڑکا بولا۔

"بابو جی تختہ لگ گیا ہے"۔

ہم تینوں اٹھے۔ پہلے شمسہ، پھر پروین اور آخر میں میں اتر گیا۔

ساحل پر بے حد رونق تھی۔ کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ کچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اور کچھ کنارے کنارے ٹہل رہے تھے۔ رنگ، حسن، جوانیاں عجیب سی ہماہمی تھی۔

شہر کے ہنگاموں کی نسبت یہاں تازگی اور شگفتگی زیادہ تھی۔ یہاں بازار کی طرح کاروباری خودغرضی اور بے اعتنائی نہیں تھی۔ کھلی فضا، پکنک کا سا ماحول، لوگ کھا رہے تھے، پی رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

بچے ماؤں سے اور مائیں بچوں سے، دوست دوست سے، سکھی سہیلی سے، اور محبوبہ محبوب سے محو گفتگو تھی---- ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دور تک پھیلے ہوئے تر و تازہ اجنبی چہرے ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ تفریح کی روح، ساگر کی اتھاہ گہرائیوں کی طرح سچے موتیوں کی چمک دمک سے آباد ہوتی ہے۔

پروین بولی۔ "ندیم صاحب! وہاں---- ان چٹانوں پر چلیں گے۔ سمندر کی لہریں اچھل اچھل کر جب ان کو اپنے سینے میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہیں تو بڑا مزاہ آتا ہے۔ لہروں کی سیمیں چادریں اٹھ اٹھ کر آتی ہیں اور پھر ٹوٹ ٹوٹ کر واپس چلی جاتی ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے"۔

"لیکن وہ تو بہت سنسان جگہ ہے"۔ شمسہ نے اعتراض کیا۔ "یہیں کہیں الگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دور بھی بہت ہے"۔

"دوری کی فکر نہ کرو۔ جس نے ہاتھ پکڑا ہے وہ کندھا بھی دے سکتا ہے اور پھر تیرا پھول جتنا وزن ہے۔ ندیم صاحب ذرا مدد کیجئے"۔

میں ہنس پڑا۔ "بھئی میں تو بالکل تیار ہوں"۔

"لو بہناں۔ آؤ، بیٹھ جاؤ"۔ پروین نے شمسہ کی طرف خاص نظروں سے دیکھا۔

"تو ہی بیٹھ جا کم بخت۔ بعد میں ڈوب مرنا ہو تو سمندر قریب ہے"۔

لیکن پروین باز آنے والی کب تھی۔ بولی۔

"میری وجہ سے آپ کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ ندیم صاحب۔ یہ منحوس دل میں مجھے گالیاں نکال رہی ہو گی۔ ورنہ یہ سماں' یہ نرم نرم ریت' یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور سمندر کا کنارا۔۔۔۔ خیر آج تو مجھے برداشت کرنا ہی ہو گا"۔

اسی طرح نوک جھونک کرتے محظوظ ہوتے' ہم چٹانوں تک پہنچ گئے۔ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ایک اونچی اور چوڑی چٹان پر بیٹھ گئے۔ دور۔۔۔۔ حد نظر تک سمندر کی لہریں پیچ و تاب کھاتی نظر آ رہی تھیں۔

تینوں نے جوتے اتار کر پیچھے رکھ دیئے تھے اور پاؤں آگے لٹکا دیئے تھے۔ کوئی بپھری ہوئی اونچی لہر آتی اور چٹانوں سے ٹکرا کر، اچھل کر ہمارے پاؤں چھو جاتی۔ پروین کے سانولے سلونے پاؤں بھی خاصے خوبصورت تھے۔ مگر شمسہ کے سپید' بے حد حسین پاؤں سے ذرا کم خوبصورت تھے۔ پروین بولی۔

"ندیم صاحب! اگر یہاں میرے اور آپ کے پاؤں ہوتے تو یہ لہرا اچھل کر نہ آتی۔ یہ تو محض دودھ کی طرح سفید اس کے خوبصورت پاؤں کو چومنے کے لئے اچھلتی ہے"۔

"ہاں" میں نے تائید کی۔۔۔۔ "مبالغہ آمیزی نہ ہو۔ چشم بد دور۔ اس کے پاؤں اس کے چہرے سے زیادہ خوبصورت ہیں"۔

"ارے!" پروین اچھل پڑی۔ "یہ بات اس سے میں نے بھی کی تھی۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ اگر حسینہ پا کا انتخاب ہو تو۔ تو تو ہی حسینہ عالم منتخب ہو"۔

"بالکل بکتی ہے"۔ شمسہ نے اس کے گلے میں لہراتا ہوا آنچل کھینچا۔

"سچ کہتی ہوں ندیم صاحب! میں اس کی دلکش ہنسی اور پاؤں پر ہی عاشق ہو کر اس کی دوست تھی"۔

"تب تو آپ کی اور میری پسند تقریباً ایک جیسی ہے"۔

"کم از کم اس معاملے میں"۔

"معاملہ یہیں تک کیوں محدود رکھتی ہو"۔ شمسہ نے وار کیا۔ "معاملہ تو بڑا لمبا چوڑا بھی ہو سکتا ہے۔ صحت دونوں کی ایک جیسی ہے۔ خیالات بھی تقریباً ملتے جلتے' خوبصورت بھی مجھ سے زیادہ ہو۔ چاہو۔ تو میں تم دونوں کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہوں"۔

"نا بابا نا۔۔۔۔" پروین کان پکڑ کر بولی۔ "تم تو اتنی تیز ہو کہ کراچی سے لاہور تک کمند پھینک لیتی ہو اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ بعد میں نہ جانے کیا کر بیٹھو"۔

"یقین نہ آئے تو لکھوا لو"۔

"پروین تم ٹھیک کہتی ہو"۔ میں نے پروین کی سائیڈ لی۔ "میرے معاملے میں بھی پہل اس نے کی تھی"۔

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔ پہلا خط تم نے لکھا تھا۔ پہل تم ہی نے کی تھی نا"۔

"ہاں کی تھی۔ کی تھی۔ کی تھی۔ پھر؟"

"پھر ڈوب مر"۔

"اور تو؟"

"میں ندیم صاحب کے آنسو پونچھ لوں گی"۔

"اور میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔ بے حیا کہیں کی"۔

میں ہنس پڑا۔ پروین نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔ ہنستے ہنستے اس نے سر شمسہ کی گود میں رکھ دیا۔

دور۔۔۔۔ ساگر کے پانیوں میں سورج کی طلائی طشتری آدھی ڈوب چکی تھی۔ اور باقی آدھی کی سرخیاں سمندر کی سطح پر بکھری ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی چٹانیں جو پہلے ننگی تھیں۔ اب پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ شمسہ پروین کے کانوں کی لوؤں سے کھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ ہنستے کھیلتے واپس چلے گئے۔

دوسرے دن میں بیڈ ٹی پی رہا تھا کہ ہوٹل کا بیرا آ گیا۔

"صاحب آپ کا فون"۔

میں اٹھ کر چلا گیا۔ چونگا اٹھایا۔ تو شمسہ کی آواز سنائی دی۔

"ارے تم! صبح صبح' آنکھ کھلتے ہی فون۔ خیر تو ہے نا----- اچھا تو تم ہمیں چائے پلا رہی ہو---- گلبرگ کیفے' چار بجے ٹھیک ہے--- اچھا بھائی جان بھی ہوں گے اور پروین---- واہ بھئی یہ خوب رہی--- گویا اب جھوٹ بھی بولنا پڑے گا---- لیکن اگر کہیں راز فاش ہو گیا تو---- بھئی میں تو ایکٹنگ کر لوں گا۔ مگر تم سے غلطی نہ ہو جائے اور وہ پروین بھانڈا نہ پھوڑ دے--- ہاں تم اسے اچھی طرح سمجھا دو--- دونوں ذرا سنجیدہ رہنا---- اچھا بھائی جان چالاک ہیں تو کیا ہوا۔ ہم بھی کسی سے کم ہوشیار نہیں---- ہاں یہ ٹھیک ہے۔ بھائی جان پر دلچسپی تو ظاہر کرنی ہے---- ارے نہیں بھئی یہاں کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا کھڑا ہوں---- اچھا بائی بائی"۔

عجیب چیز ہے محبت بھی۔

آج سورج کی پہلی کرن نے ہمیں جھوٹ کا پروگرام دیا ہے۔ آج سورج کی آخری کرن ڈوبنے تک ہم جھوٹ بولتے رہیں گے۔ آج ہم بہت خلوص سے جھوٹ بولیں گے۔ آج ہم انتہائی نیک نیتی سے جھوٹ بولیں گے۔ آج ہم اس جذبے کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولیں گے۔ جو اللہ نے محبت کے نام سے ہمارے دلوں میں پیدا کیا ہے۔ آج ہم بھائی جان پر ظاہر کریں گے کہ ہم سب پہلی بار مل رہے ہیں۔ چار بجے کی چائے پر۔ بھائی جان محض اس حیثیت سے ملیں گے کہ میں ان کے پسندیدہ فلمکاروں میں سے ہوں۔

مجھے خواہ مخواہ ایک مصنوعی سنجیدگی اور وقار کا سہارا لینا پڑے گا۔ تول تول کر اور سوچ سوچ کر بولنا پڑے گا۔ مثالی آدمیوں کی سی گفتگو کرنا ہو گی۔ عجیب بات ہے۔ انسان کبھی کبھی مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی مجبور ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کی ایسی

مجبوری کو سمجھ جائے تو اسے کتنا کمینہ سمجھے۔ مگر ہوتا یہی ہے--- ہر آدمی اپنی کمینگی کو سمجھتا ہے۔ مگر اس کا گلا گھونٹ نہیں سکتا۔ الٹا وہ فخر کے نام سے ہمارے سینوں میں پلتی ہے۔

ساڑھے تین بجے میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ گلبرگ کیفے' میرے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل جانے میں پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ شمسہ نے ٹیلی فون پر سب کچھ بتا دیا تھا کہ اگر میں پہلے پہنچ جاؤں تو منیجر سے اپنا تعارف کروا دوں۔ وہ ایک ریزرو میز پر مجھے بٹھا دے گا۔ اور اگر وہ لوگ پہلے پہنچ گئے تو بھی میں ان کی میز کی طرف آنے کے بجائے منیجر سے ہی رجوع کروں۔

ابھی چار بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ میں کیفے پہنچ گیا۔ لیکن یہ سوچ کر ٹھیک چار بجے اندر جاؤں گا۔ سڑک کے اس پار کیفے کے بالمقابل انتظار کرنے لگا۔

عین اس لمحے جب چار بج رہے تھے۔ ان کی کار کیفے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شمسہ ہی کی طرح ایک دبلا پتلا نوجوان اسٹرنگ پر بیٹھا تھا۔ یقیناً یہی بھائی جان ہوں گے۔ شمسہ اور پروین نے ایک ساتھ مجھے دیکھ لیا۔ دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑیں۔ میں بھی مسکرایا-- پروین بالکل سبز پری بنی ہوئی تھی۔ شمسہ سفید ساٹن کی شلوار اور سرخ رنگ کی پھول دار قمیض پہنے ہوئی تھی۔

وہ تینوں اندر چلے گئے۔ میں نے ان کے پیچھے پیچھے جانا مناسب نہ سمجھا۔ پانچ منٹ لیٹ کرنے سے ایک تو انتظاری کیفیت بن جائے گی۔ دوسرے ذرا اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

میں خاصی رونق تھی۔ شاید کوئی میز خالی ہو گی۔ چاروں طرف ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر میں منیجر کی میز تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مصنوعی انداز میں ہنس پڑا۔ فوراً گھنٹی بجائی۔ بیرا آیا تو اس سے بولا۔

"صاحب کا انتظار نمبر چار پر ہو رہا ہے"۔

نمبر چار پر پہنچ کر بیرا بولا۔ "صاحب! آپ کا گیسٹ"۔

بھائی جان میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ "شاید آپ-----"

میں نے بات کاٹ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "جی ہاں میں ندیم ہوں"۔

شمسہ اور پروین نے مصنوعی عقیدت سے میری طرف دیکھا۔ بھائی جان بولے۔

"گلیڈ ٹو سی یو۔ مجھے ضمیر الدین کہتے ہیں اور یہ ہیں میری بہن شمسہ، صبح اسی نے آپ کو فون کیا تھا۔ اور یہ ان کی سہیلی مس پروین"۔

"آداب عرض!" میں نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"آداب عرض"۔ دونوں ایک ساتھ بڑے احترام سے بولیں۔

"تشریف رکھئے"۔

ہم چاروں ایک ساتھ بیٹھ گئے۔

ساگر کے کنارے والی شوخ و شنگ پروین شرما شرما کر گویا پہلی ملاقات کا تاثر دے رہی تھی۔ شمسہ تو بالکل چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی تھی۔

بھائی جان ہنس کر بولے۔

"میرا اندازہ تھا۔ آپ کی عمر چالیس پینتالیس سے کم نہ ہو گی۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی کم عمر نکلے۔ اس عمر میں اتنے خوبصورت خیالات کا پرچار تو ہمارے ملک کی بڑی خوش نصیبی ہے"۔

شمسہ نے مسکرا کر پروین کی طرف دیکھا۔ پروین پہلے ہی ہونٹ چبا چبا کر مسکرا رہی تھی۔ میں بھی ہنس پڑا۔

"یہ سب میرے کرم فرماؤں کا ذوق نظر ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"۔

"نہیں یہ تو کسر نفسی ہے آپ کی"۔ ضمیر صاحب بولے۔ "میں نے آپ کو پہلے نہیں پڑھا تھا۔ شمسہ آپ کی کتابوں کا پورا سیٹ لائی۔ میں نے ایک کتاب پڑھی تو بڑا لطف آیا۔ اس کے بعد ساری پڑھ ڈالیں۔ تب مجھے واقعی شمسہ کی ہم نوائی کرنا پڑی"۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ شمسہ نے چائے بنانے کے لئے ٹرے اپنی طرف کھینچ لی۔

"کراچی تشریف آوری کیسے ہوئی؟" بھائی جان نے بڑے روزمرہ کے انداز میں پوچھا۔

سوال متوقع ضرور تھا۔ لیکن اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ شمسہ چونکی۔ پروین نے بھی میری طرف دیکھا۔ مگر میں سنبھل گیا تھا۔

"کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ایک ادارے سے بات کرنی تھی"۔

شمسہ نے چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھائی۔ "چائے لیجئے"۔

میں چائے پینے لگا تو شمسہ بولی۔

"لیجئے، یہ پیسٹری لیجئے۔ یہ شامی لیجئے"۔

بھائی جان نے شمسہ کی تائید کی--- "ہاں ندیم صاحب کھائیے نا۔ یہ سموسے تو بہت لذیذ ہیں"۔

"کھا رہا ہوں ضمیر صاحب"۔ میں ہنس پڑا۔ "سموسے واقعی لذیذ ہیں۔ شامی بھی اچھے بنے ہیں اور میٹھا میں زیادہ پسند نہیں کرتا"۔

"مگر یہ شمسہ تو بہت پسند کرتی ہے"۔ پروین ایسی بے ساختگی سے بولی جیسے وہ تینوں سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ میں مسکرایا۔ شمسہ نے ہنسی دباتے ہوئے چائے کی دوسری پیالی میری طرف بڑھائی۔

"اگر آپ نمکین چیزیں پسند کرتے ہیں تو پھر کسی روز آپ کو گھر پر ہی چائے پلائیں"۔

پروین نے چونک کر اس طرح داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو--- "لو دیکھو! لڑکیاں یوں بات نکالتی ہیں"۔

ضمیر صاحب نے شمسہ کی اس بات کو کوئی خاص لفٹ نہ دی۔ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر انہوں نے خالی پیالی پرچ میں رکھ دی اور بولے۔

"کب تک یہاں ٹھہرنے کا خیال ہے؟"

"بس تین چار روز اور۔ اگر بات طے ہو گئی تو شاید کل پرسوں ہی چلا جاؤں"۔

شمسہ مسکرا پڑی۔ بھائی جان بولے۔

"خیر آپ سے ملاقات تو پھر ہو ہی جائے گی"۔

"ضرور! میں خود حاضر ہوں گا"۔

ان کے انداز گفتگو سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب اس ملاقات کو مزید طول دینا نہیں چاہتے۔ انہوں نے بل پے کیا۔ تو میں نے اجازت چاہی۔ بھائی جان بولے۔

"کہیں ضروری اپائنٹمنٹ ہے؟"

"جی نہیں۔ مجھے ذرا کلفٹن دیکھنے کا شوق ہے۔ بہت تعریف سنی ہے۔ اب اتفاق سے آیا ہوں تو دیکھتا ہی جاؤں"۔

"تو کیا آپ بس سے جائیں گے؟" شمسہ نے گویا موٹر میں لفٹ دینے کی گنجائش نکالی۔

"ٹیکسی یا رکشہ پکڑ لوں گا"۔

"نہیں نہیں۔ ہماری گاڑی جو ہے۔ دس منٹ کا تو سارا راستہ ہے۔ ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں"۔

"مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں چلا جاؤں گا"۔

"لیکن حرج ہی کیا ہے۔ ندیم صاحب"۔ ضمیر صاحب بولے۔ "ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں"۔

کیفے سے باہر نکلے' بھائی جان سب سے آگے تھے۔ پروین اور شمسہ نے کچھ کھسر پھسر کی۔ پروین نے اثبات میں سر ہلایا اور ہنس پڑی--- موٹر کے قریب پہنچے تو پروین لپک کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ کھسر پھسر کیوں ہوئی تھی۔ یقیناً ضمیر صاحب ان دونوں کو پچھلی سیٹ پر اور مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے۔ مگر اب یہ

امکان ختم ہو چکا تھا۔ صورت حال دیکھ کر ضمیر صاحب نے ہمارے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"تشریف رکھئے"۔

سب بیٹھ گئے۔ بھائی جان نے کار اسٹارٹ کی۔ پروین نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم تینوں مسکرا رہے تھے۔ شمسہ میرے بائیں ہاتھ بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جھولی میں رکھے تھے۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے داہنے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر میری طرف۔

اب کار کلفٹن جانے والی روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ بھائی جان نے لمحہ بھر کے لئے مڑ کر دیکھا۔

"کہیئے ندیم صاحب! کراچی پسند آئی؟"

"جی ہاں"۔ میں نے شمسہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "کراچی بہت خوبصورت شہر ہے۔ اگر یہاں اردو کثرت سے نہ بولی جاتی۔ تو میں یہی محسوس کرتا کہ کسی دوسرے ملک میں آگیا ہوں"۔

ضمیر صاحب ہنس پڑے۔ "واقعی کراچی شہر ہی ایسا ہے"۔

کار اب کلفٹن کی چڑھائی عبور کر رہی تھی۔ شمسہ بولی۔

"یہ سارا علاقہ کلفٹن کہلاتا ہے"۔

میں نے شمسہ کی طرف دیکھا۔ اور اس کا ہاتھ دبایا۔ کار جھٹکے سے رک گئی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے شمسہ کا ریشمی دوپٹہ اڑ کر میرے گلے سے لپٹ گیا تھا۔ اس کی لمس میں ایک البیلی سی تسکین اور راحت تھی۔ بھائی جان بولے۔

"یہیں اتریں گے یا آپ کو نیچے چھوڑ آئیں؟"

"شکریہ! میں کچھ دیر یہیں بیٹھ کر ساری فضا کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"تو پھر ہم چلیں"۔ بھائی جان نے بے حد خلوص سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ضرور۔ بہت بہت مہربانی"۔

"بائی بائی!"

"آداب عرض"۔ شمسہ اور پروین باری باری بولیں۔

کار اوجھل ہونے سے پہلے شمسہ نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے دلکش دانت ایک لہرا سی چھوڑ گئے۔ میرا احساس دیر تک اس لہرا سے محظوظ ہوتا رہا۔

کلفٹن واقعی خوبصورت جگہ تھی۔

صبح میں شیو کر رہا تھا کہ شمسہ نے چپکے سے آ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ شمسہ کی لو جیسی انگلیوں کا لمس بھلا میں کاہے کو نہ پہچانتا۔ میں نے جھٹ سے صابن لگا کر برش اس کے ہاتھوں پر پھیر دیا۔

"اوئی!" کر کے وہ پیچھے ہٹی اور تولیے سے ہاتھ پونچھنے لگی۔ "عجیب ہو تم بھی"۔

"ہاں!" میں نے لپک کر اس کے چہرے پر بھی صابن مل دیا۔

"وہ بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ میں نے آئینہ اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم سچ مچ ساری زندگی مجھے اسی طرح ستاؤ گے؟"

"ہاں" میں نے تولیے سے اس کا منہ صاف کیا" ا

"گر تقدیر میں ستانا ہی لکھا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" "اف خدایا---!" وہ پھر ہنس پڑی۔ اف خدایا وہ اس بے ساختگی سے بولی، جیسے کسی نئی مسرت کا سرچشمہ پھوٹ پڑا ہو۔

"دیکھو جی! تم نے مجھے باتوں میں لگا کر مجھ سے اصل بات ہی بھلا دی۔ جانتے

ہو میں اتنے سویرے کیوں آ گئی؟"

"میں کیا جانوں؟"

"میں تم سے لڑائی کرنے آئی ہوں"۔

"مگر کیوں؟"

"گویا تمہیں علم ہی نہیں--- کل تم نے کتنا بور کیا ہمیں؟"

"لو--- کھودا پہاڑ نکلا چوہا"۔

"اجی نہیں! میں سچ کہتی ہوں۔ تم نے بھائی جان پر ذرا بھی رعب نہیں ڈالا۔ بالکل عام آدمیوں کی طرح بات چیت تھی تمہاری"۔

"میں ہوں بھی تو عام آدمی۔ تم زیادہ توقعات باندھ لیتی ہو تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"دیکھو ندیم! مجھے تمہاری یہ بننے کی عادت بالکل پسند نہیں"۔

"بننا نہیں۔ احساس کمتری کہہ لیجئے"۔

"اور احساس برتری کیوں نہ کہوں؟"

"تمہاری مرضی۔ جو ہوں تمہارے سامنے ہوں"۔

"ندیم یہ اچھی بات نہیں۔ میں ہر بات نیک نیتی اور خلوص سے کہتی ہوں۔ تم اسے غلط رنگ دے کر سنجیدہ ہو جاتے ہو"۔

"میری بدقسمتی!"

"کیا---؟" وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"یہی نا کہ میں تمہارے خلوص اور نیک نیتی کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہوں"۔

"ایسا ایک آدھ بار ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے"۔

تو ہونے دو مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں۔

"تمہیں کوئی افسوس نہیں۔ ندیم یہ اچھی بات نہیں"۔

"نہ سہی۔

"ندیم!" وہ زور سے چلائی۔

میں شیو کرتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔

"دیکھو شمسہ! اگر تمہیں مجھ کو عام آدمی سمجھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ مجھے خود کو عام آدمی کہلوانے میں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ تم پہلے اس بات کو سمجھ لو۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو"۔

وہ بالکل روہانسی ہو گئی۔

"گویا میں آج پھر نئے سرے سے سوچنا شروع کر دوں------ ہنسا کر رلا دینا تم لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پل سے پل میں تم نے بات سے بات نکال کر اپنی اہمیت جتا دی۔ اور مجھے حقیر بنا دیا۔ کیا اس لئے کہ میرے خلوص کی شہ رگ تمہارے ہاتھ میں ہے؟ کیا اس لئے کہ میں نے خود کو کمزوری کہہ کر تمہارے قدموں میں رکھ دیا ہے؟"

"تم اب بھی زیادتی کر رہی ہو شمسہ! تم اپنے خلوص کو کمزوری اور محبت کو جنس کی طرح ترازو میں تول کر مجھے اس کا وزن بتا رہی ہو"۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں"۔

"میں جو بھی سمجھا۔ غلط ہی سہی۔ پر اتنا تم بھی سمجھ لو کہ جو پیار جتا کر پیار کرتا ہے وہ کبھی پیار نہیں کرتا"۔

وہ تقریباً رونے پر آ گئی۔

"تم لفاظی کے زور سے میرے خلوص کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہو۔ تم فقروں کی جھنکار سنتے ہو۔ ان میں میری بے بسی اور پیار کی گونج نہیں سنتے۔ یہی تو کہا تھا نا میں نے کہ تم نے بھائی جان سے عام آدمی کی طرح گفتگو کی۔ تم نے اس سے اپنے مطلب کا تاثر لے کر یہ نہ سوچا کہ میں نے یہ سب کچھ کس جذبے کے تحت کہا تھا۔ تم لفظوں کو پکڑ کر اس کی سزا دیتے ہو۔ نیت کو پا کر اس کا پھل نہیں دیتے!"

"میں غسل کر کے آتا ہوں۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے اس کمرے کی دیواروں

سے پوچھنا۔ اس آئینے میں جھانکنا۔ اس سنگھار میز پر پڑی ہوئی ایک ایک چیز سے پوچھنا کہ میں تمہیں کیا نہیں دے سکا اور کیا بچا سکا ہوں"۔

وہ خاموش تھی۔ میں نہانے چلا گیا۔

غسل خانے میں میں خوب ہنسا۔ جذباتی لڑکی کو میں نے کتنی آسانی سے رلا دیا تھا۔ اس کی پریشانی اور کوفت میں کتنا حسن تھا۔

اب سوچ رہی ہو گی۔ میں ناراض ہو گیا ہوں۔ غسل کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ پیار کیسی عجیب شے ہے۔

یہ سختی، نرمی اور دھوپ چھاؤں میں ایک طرح سے پروان چڑھتا ہے۔ نرمی میں یہ سینے کے اندر مچلتا ہے۔ سختی میں یہ آنسو بن کر چمکتا ہے۔ چھاؤں میں یہ بند کلی کی طرح مراز ہوتا ہے۔ دھوپ میں یہ چٹک کر ساری دنیا کو ہمراز بنا لیتا ہے۔

آس بھی پیار۔ یاس بھی پیار۔ خوشی بھی سچائی۔ غم بھی سچائی۔

نہا کر باہر نکلا تو شمسہ فرش پر نظریں گاڑے گہری سوچوں میں مستغرق تھی۔ میں نے کنگھی کی۔ وہ اسی طرح خاموش تھی۔ میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں بظاہر سنجیدہ، مگر دل میں مسکرا رہا تھا۔ وہ اسی طرح فرش کو تک رہی تھی۔ یہ سناٹا بڑا ذو معنی تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں"۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہی پھر بولی۔ "میں اس لئے آئی تھی کہ کل گیارہ بجے تم ہمارے گھر آ جانا۔ مینو اور اماں سے بھی مل لو گے۔ سلمیٰ اور زاہدہ کو بھی دیکھ لو گے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھانا"۔

"بھائی جان نے اجازت دے دی کیا؟"

"نہیں۔ ان سے ابھی بات نہیں ہوئی۔ اماں کو بتا دیا تھا۔ وہ ان سے بات کر لیں گی"۔

"اور ابا جان؟"

"وہ تو گھر گھر کی بک بک سے دور ہی رہتے ہیں۔ سارا اختیار بھائی جان کا ہے"۔

"میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا"۔

بات جیسے ختم ہو گئی۔ وہ اکتا کر بولی۔ "تو پھر میں جاؤں"۔

"جانا ہے تو چلی جاؤ"۔

وہ زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"جاتی ہوں۔ چلی جاتی ہوں!"

آنسو پیتے اور ہونٹ چباتے وہ دروازے تک گئی۔ کھیل کافی ہو چکا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا—— "ٹھہرو شمسہ!"

وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی مجروح آنکھوں میں ایک عجیب بے بسی رقص کر رہی تھی۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر مسکرا پڑا۔ اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"بیٹھ جاؤ"۔

"تم بہت ظالم ہو!" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ "سب کچھ سمجھتے ہوئے سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم جھوٹے وقار کی خاطر دوسروں کے احساسات سے کھیلتے ہو"۔

"تم تو لڑنے کی شوقین تھیں۔ بس اتنے میں ہی ہتھیار ڈال دیئے"۔

"لڑا اس سے جاتا ہے جو اپنے سے کمزور ہو۔ یا برابر کا ہو۔ طاقتور سے تو جو بھی لڑے گا۔ اپنا سر پھوڑنے کے سوا اور کیا کرے گا؟"

میں نے اٹھ کر اس کے آنسو پونچھے۔

"بیوقوف! مساوی یا کمزور سے تو ہر آدمی ٹکرا جاتا ہے۔ شان تو یہ ہوتی ہے کہ اپنے سے زیادہ طاقتور کو پچھاڑ دیا جائے"۔

"میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی"۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہاری محبت ابھی خام ہے۔ تم اس پر بھروسہ نہیں کر

سکتیں"۔

"یہی سمجھ لو۔ اگر یہ سچ نہ ہوتا تو میں اب تک جا نہ چکی ہوتی"۔

"تمہارا رکنا تمہاری کمزوری نہیں' میرے خلوص کی طاقت ہے۔ میرے پیار کا صلہ ہے۔ میری چاہت کی پختگی ہے"۔

"خیر میں ٹھہروں گی نہیں۔ مجھے اب جانے دو۔ میرا موڈ آف ہو گیا ہے"۔

"اور میں اس وقت موڈ میں ہوں۔ تمہیں میرے موڈ کا خیال رکھنا پڑے گا"۔

"اور تم پر بھی یہ لازم ہے کہ میرے موڈ میں نہ ہونے کا خیال کرو اور مجھے جانے دو"۔

"تبھی تو روک رہا ہوں۔ راستے میں کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔ موٹر تلے نہ آ جاؤ۔ مر جاؤ گی تو پھر میں کیا کروں گا"۔

"میرا لہو پی لینا۔ اب بھی تم یہی کر رہے ہو"۔

"خوب خوب" میں ہنس پڑا۔ "ڈرامہ بول رہی ہو"۔

"ڈراماٹسٹ جو سامنے ہے"۔

"گویا میری شخصیت ڈرامے کی تخلیق کا باعث بن رہی ہے۔ تب تو میں بہت کام کی چیز ہوں۔ سنگ پارس کی طرح جو بھی چھو جائے' سونا بن جائے"۔

"مگر مجھے تو الٹا خود پر پیتل کا گمان ہو رہا ہے۔ رنگ سونے کا قیمت پیتل سے بھی کم"۔

"کسی سنار یا جوہری سے اپنی قیمت پوچھی ہوتی؟"

"جوہری ہی نے تو یہ احساس دیا ہے ورنہ میں تو جانے کس غلط فہمی میں مبتلا تھی"۔

"کیا غلط فہمی تھی تمہیں؟"

"یہی کہ میں بہت حسین ہوں' بے حد انمول ہوں' ہر دوسرے' تیسرے اور چوتھے اور آخری مرد کی نگاہوں میں میں نے یہی پیغام پڑھا ہے۔ لیکن مجھ جیسی لڑکیوں

کو اپنی اصلی قیمت کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب تم جیسے مغرور آدمی کے ہتھے چڑھتی ہیں!"

"خوب! تم نے ساری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی۔ لیکن محترمہ یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ مرد تمہیں اس لئے نہیں دیکھتا کہ تم حسین ہو۔ وہ صرف عورت سمجھ کر تمہیں دیکھتا ہے۔ حسن اور چیز ہے۔ عورت دوسری چیز ہے۔ حسن تمہیں آئینہ دیتا ہے' اس لئے کہ آئینے میں تم خود کو دیکھتی ہو۔ اور خود سے کوئی نفرت نہیں کر سکتا۔ دوسرا شخص جو تمہیں حسین کہتا ہے۔ تمہارا چاہنے والا ہوتا ہے۔ اور جسے تم بھی چاہتی ہو۔ تمہاری چاہت اس کی ذات کو ایک امتیاز اور فخر بخشتی ہے۔ وہ اس امتیاز اور فخر سے پیار کرتا ہے۔ گویا اپنے آپ سے پیار کرتا ہے اور اس صلے میں وہ تم کو حسین کہتا ہے!"

شمسہ حیرت سے میرا منہ تک رہی تھی۔

"تو تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں مجھ سے پیار نہیں۔ تم صرف اس لئے مجھے پسند کرتے ہو کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں؟"

"یہی تو ہوتا ہے پیار۔ اس بات کو تم یوں بھی کہہ سکتی ہو کہ چونکہ میں تمہارے لئے تڑپتا ہوں۔ اس لئے تم بھی میرے لئے تڑپتی ہو۔ گائے کسی اور گائے کے بچھڑے کو نہیں چاٹتی۔ ماں کو اپنی کوکھ سے نکلے ہوئے بچے کو دودھ پلانے سے جو راحت ملتی ہے' دوسرے کے بچے سے نہیں ملتی۔ تمہاری تڑپ سے مجھے اس لئے ہمدردی ہے کہ وہ میرے لئے ہے۔ میری تڑپ سے تمہیں اس لئے ہمدردی ہے کہ وہ تیرے لئے ہے۔ ماں بچے کو اپنا وجود سمجھ کر چاہتی ہے۔ بعینہ تم خود کو میری شبیہہ میں چاہتی ہو۔ اور میں اپنے آپ کو تمہاری شکل میں---!"

شمسہ ہکا بکا میرے منہ کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کتنے خطرناک آدمی ہو۔ تم نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

میں ہنس پڑا۔

"اس لئے کہ پہلے مجھے کسی نے چاہا بھی تو نہیں تھا۔ مجھے اس کا تجربہ ہی نہیں ہوا تھا اور ممکن ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کسی کو چاہا ہو۔ تم نے بھی کسی کو چاہا ہو۔ مگر ہو سکتا ہے کہ ہم نے جسے چاہا ہو۔ وہ اس سے پہلے کسی کو چاہ رہا ہو۔ اس صورت میں ہمارا مایوس ہونا قدرتی تھا۔ مگر جب تم نے مجھے پیار کا سندیسہ دیا تو میں نے بن دیکھے بن پرکھے تم سے پیار شروع کر دیا۔ محض اس لئے کہ مجھے چاہے جانے کی خواہش تھی اور میری اس خواہش کی تکمیل ایک ان دیکھا وجود کر رہا تھا۔ یہ وجود کیا تھا' کیسا تھا۔ اس پر غور ہی نہ کر سکا۔ مگر چاہے جانے کی خواہش نے مجھے تمہارے تئیں مخلص بنا دیا۔ یہ اخلاص حسن کہلایا اور یہ حسن پیار کہلایا!"

شمسہ نے ایک لمبی آہ بھری۔ جس میں تکلیف اور تسکین کی ملی جلی کیفیت تھی۔ بولی۔

"مگر یہ بات تو اپنی جگہ پر پھر بھی ثابت ہو گئی کہ پیار جن حالات میں بھی جنم لیتا ہے۔ انتہا اس کی صداقت ہوتی ہے"۔

"یقیناً شمسہ یہی ہوتا ہے اس لئے کہ اپنے آپ سے پیار کرنا بھی ایک سچائی ہے۔ خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس سے پیار کریں۔ انسان کی طرح وہ بھی چاہے جانے کا خواہشمند ہے۔ چاہے جانے کی خواہش ایسی صحت مند خواہش ہے جو بکھری ہوئی کڑیوں کو زنجیر کی طرح متحد کر دیتی ہے۔ تمہاری وجہ سے خاندان کے بہی خواہوں کو اپنا سمجھوں گا۔ اسی طرح بہی خواہوں کے دوست' ان دوستوں کے دوست۔ یہ حلقہ وسیع اور وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ دوستی بڑھے گی۔ محبت بڑھے گی۔ دو دل ان گنت دلوں کو پیار کی لڑی میں پروتے ہیں!"

"اوہ-----" وہ دونوں مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور مجھے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

"افسانوں میں تم بالکل اور آدمی تھے۔ اب تم بالکل مختلف آدمی نظر آ رہے ہو"۔

"یعنی!"

"یعنی اتنا زیادہ ذہین ہونا کسی حد تک خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے"۔

"وہ کیوں؟"

"اب میں ساری زندگی تم سے سہمی رہوں گی۔ تمہاری ذہانت ساری عمر میرے حواس پر چھائی رہے گی۔ مجھے ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہے گا کہ تم میرے دل کی ہر بات سمجھ رہے ہو"۔

"اگر تمہارے دل میں کوئی کھوٹ پیدا نہ ہو گی تو یہ خدشہ فضول ہے۔ میں نے اپنا عقیدہ تمہیں بتا دیا ہے کہ جب تک اپنے آپ سے پیار کرو گی۔ میرا پیار بھی زندہ رہے گا۔ خود سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تب تمہارے سہمے رہنے کا خیال ہی بے بنیاد ہے"۔

وہ ہنس پڑی۔

"تم بڑے زیرک ہو۔ ہر بات سے ہوئے کی طرح ڈراتے ہو۔ اور پھر تسلی بھی دیتے ہو"۔

"میری خوش قسمتی کہ تم اتنی بے وقوف ہو کہ ہر بات سے ڈر بھی جاتی ہو اور پھر مطمئن بھی ہو جاتی ہو"۔

اسے جیسے بیوقوف کہلانے پر خوشی ہوئی۔ اترا کر بولی۔

"لیکن تم تو مجھے بڑا عقلمند سمجھتے تھے"

"وہ بھی تمہیں بیوقوف بنانے کا ایک انداز تھا"

"بہر حال مجھے اس بیوقوفی پر فخر ہے جو تمہیں لاہور سے کراچی کھینچ لائی۔ جس نے تمہیں لاکھوں کے شہر میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر رکھا ہے لیجئے میں پھر تم سے صلح کی باتیں کرنے لگی ہوں۔ تم نے آج مجھے بلاوجہ رلایا ہے میں اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔ لو میں اب چلتی ہوں"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو!"

"میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کا بٹھا دیا اور خود بھی کرسی سے اٹھ کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

"جو سزا دینی ہو۔ ابھی دے دو"۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اپنے رخسار پر دے مارا۔

"لو مارو۔ زور زور سے مارو۔ تمہاری قسم! میں نے تمہیں جان بوجھ کر رلایا تھا"۔

"چھوڑو بھی یہ کیا کر رہے ہو"۔ وہ ایک دم جذباتی ہو گئی۔۔۔۔ سوکھ جائیں۔ میرے ہاتھ جو تم پر اٹھیں۔ میرے منہ میں خاک۔ جو انتقام کی بات کی۔ رلایا ہے تو اچھا کیا ہے اور رلاؤ۔ خدا کی قسم تمہارے رلانے میں بھی ایک شان ہے!"

"دیکھ شمو!" میں نے شمسہ کا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔ "تم اتنی اچھی لڑکی نہ بنا کرو کہ مجھے تم پر رشک آنے لگے۔ کبھی کبھی بدتمیز بن کر مجھ سے لڑ بھی لیا کرو"۔

"ارے۔۔۔۔ لڑاکا تو میں جہان بھر کی ہوں۔ منٹ منٹ میں لڑتی ہوں۔ گھر میں تو مجھ سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ پر نہ جانے تمہارے سامنے بھیگی بلی کیوں بن گئی ہوں"۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے تم پر ناجائز قسم کا رعب ڈال دیا ہے۔ تمہاری فطرت کا خون کر رہا ہوں۔ یہ بات تو میرے لئے اچھی نہیں شمو"۔

"اجی نہیں یہ بات نہیں۔ میں کچھ نفسیاتی طور پر تم سے دب گئی ہوں۔۔۔ پر ساری زندگی شریف تھوڑی بنی رہوں گی۔ بس چند دن کے بعد لڑنے لگ پڑوں گی"۔

میں ہنس پڑا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بولا۔

"شمو تم بہت دلچسپ ہو۔ تمہارے ساتھ زندگی بڑی خوشی سے کٹے گی"۔

شمسہ نے میری چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ "میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں ندیم!"

"شمو!" میں اس کے ہونٹوں کے قریب منہ لے جا کر بولا۔

"جی!"

"کل آؤں تو اماں سے رشتے کی بات کر لوں نا؟"

اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"نا بھئی نا۔ ابھی نہیں۔ بالکل نہیں!"

"تو پھر کب شمو؟"

"بس کراچی سے جاتے وقت بھائی جان سے کہہ دیجئے گا۔ وہ اماں سے بات کریں گے۔ اماں مجھ سے پوچھیں گی تو میں اپنی مرضی کہہ دوں گی"۔

"اچھا بتاؤ شمسہ! جب اماں تم سے پوچھیں گی تو تم کیسے ہاں کہو گی؟"

"واہ۔۔۔! اب یہ تھوڑا کہوں گی کہ مجھے تم سے عشق ہے"۔

"پھر بھی کچھ تو کہنا ہی ہو گا نا؟"

"بس کہہ دوں گی کہ آدمی معقول ہے"۔

"بس۔۔۔؟" میں نے اس کی چٹکی لی۔

"تو اور کیا۔۔۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ ذرا مغرور ہے' پر میں ٹھیک کر لوں گی"۔

ہم دونوں ہنس پڑے۔ دوپہر کا کھانا وہیں ہوٹل میں کھایا۔

پھر وہ چلی گئی۔

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا۔ تو میری طبیعت بے حد ہشاش بشاش تھی۔ آج مجھے محبوب کے گھر جانا تھا۔ طبیعت میں بڑی ہلچل تھی۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ گیارہ بجے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ ایک دو گھنٹہ اماں سے باتیں ہوں گی۔ پھر کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ شمسہ نہ جانے خانسامے سے کیا کیا پکوائے گی۔ بے چاری کو مجھے بھی اٹینڈ کرنا ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے بھی کچھ نہ کچھ بنائے گی۔ اور ادھر یہ بھی سننے کے لئے بے تاب ہو گی کہ اماں اور میرے درمیان کیا گفتگو ہو رہی ہے۔

اتنے میں سلمٰی اور زاہدہ آ جائیں گی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ میں اماں کے پاس بیٹھا ہوں۔ تو تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک جائیں گی۔ شرمائیں گی۔ لجائیں گی۔ قدرتی طور پر ایک نئے آدمی سے ملنے پر خوشی اور خوف کی ایک ملی جلی کیفیت ہو گی۔

پینو تو شاید میری گود سے ہی نہ اترے۔ بھابی جان بہت خوش ہوں گی۔ کسی عورت کا خلوص جیتنا ہو تو اس کی اولاد سے جی بھر کر پیار کرو---- ماں اپنی اولاد سے پیار کرنے والوں سے کبھی دور نہیں رہ سکتی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کم ان!" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"ارے آپ!" میں نے حیرت اور خوشی سے پروین کو دیکھا۔

"آداب عرض!" وہ مسکراتے ہوئے اندر آ گئی۔

"آداب عرض! تشریف رکھئے"۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

"آپ تو تیار بیٹھے ہیں۔ شاید دعوت کی تیاری ہے"۔

"ہاں! یہی خیالی پلاؤ پکا رہا تھا"۔

وہ پھر ہنس پڑی۔

"تو آپ کا خیالی پلاؤ سچ مچ کا خیالی پلاؤ بن کر رہ گیا"۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"شمسہ اور ضمیر بھائی میں لڑائی ہو گئی"۔

"لڑائی--- کیا میری وجہ سے؟"

"ہاں! ضمیر بھائی چائے کی دعوت ہی کو کافی سمجھتے تھے"۔

"اور کیا ہوا؟"

"بہت کچھ! تو تو میں میں تک نوبت آئی۔ شمسہ پر جب جذباتی لہر آتی ہے، تو وہ آگا پیچھا نہیں دیکھتی"۔

"گویا اس نے میرے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر دیا؟"

"ہاں! بھائی جان کے علاوہ سب گھر والوں کو بھی اس نے جتا دیا ہے کہ وہ آپ کو پسند کرتی ہے"۔

"یہ تو اس نے بڑی جلد بازی کی۔ یہ سب کچھ بڑے اطمینان اور تسلی سے بھی بتایا جا سکتا تھا"۔

"ہاں ایسا ہو سکتا تھا۔ مگر آپ کو مدعو کرنے کے بعد بھائی جان کے انکار سے اس کی سبکی ہوتی تھی۔ اس لئے اس کا بھڑنا قدرتی تھا"۔

"مگر بھائی جان نے ایسا کیوں کیا؟ آخر شمسہ نے کہیں شادی تو کرنی ہے، جس گھر میں لڑکیوں کو دوستوں کے انتخاب میں آزادی ہو، وہاں شادی کے معاملہ میں بھائی کو بہن کے انتخاب پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے"۔

"اس کی بھی ایک وجہ ہے"۔ پروین رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "ضمیر بھائی جس فرم میں ملازم ہیں۔ اس کا مالک شمسہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ شمسہ کی جذباتیت کی وجہ سے فرم کے مفادات ہاتھ سے نکل جائیں"۔

"اوہ!" میں بالکل سٹپٹا گیا۔ "تو بھائی جان اتنے چھوٹے آدمی ہیں۔ مگر کیا شمسہ یہ سب کچھ جانتی ہے"۔

"وہ نہ جانتی تو میں کیسے جانتی۔ مگر اس میں شمسہ کا کیا قصور۔ کوئی خواہ مخواہ کسی کو پسند کرے، کسی کے لئے آہیں بھرے تو دوسرا اس کا ناک نہیں کاٹ سکتا"۔

پہلی بار میرے ذہن میں شک کی چنگاری سلگ اٹھی۔

"پروین! مجھے یاد آیا۔ ایک بار شمسہ نے بھی اس فرم کے مالک کا ذکر کیا تھا۔ شمسہ نے اس کا نام بڑے احترام سے لیا تھا"۔

"احترام اور چیز ہے ندیم صاحب! محبت اور--- اتنا میں جانتی ہوں کہ شمسہ اس سے پیار نہیں کر سکتی۔ شمسہ بہت مثالی لڑکی ہے۔ آپ سے تعلقات کی ایک ایک بات میں جانتی ہوں۔ اگر ان صاحب سے بھی کوئی بات ہوتی تو وہ بھی میں ضرور

جانتی"۔

"آپ میرا اور اس کا مقابلہ نہ کریں۔ میرے ساتھ کوئی بھی لڑکی ناطہ جوڑ کر فخر محسوس کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ادھیڑ عمر کے دولت مند سے ناطہ جوڑ کر اپنے ضمیر کا چور نہیں بنا سکتی"۔

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اس سے بڑی آسانی سے شادی کر سکتی تھی"۔

"یہ تو آپ نے بڑی سطحی بات کہی پروین! شادی سے زیادہ قابل ملامت بات یہ ہے کہ انسان چند اغراض کی خاطر دولت کے سامنے سرنگوں ہو جائے"۔

"ندیم صاحب! برا نہ مانیئے گا۔ آپ کو اس بات پر تو غصہ آگیا کہ شمسہ نے ایک اجنبی کا ذکر احترام سے کیا تھا۔ لیکن آپ کو اس بات پر خوشی نہیں ہوئی کہ اس نے آپ کی خاطر بھائی سے جھگڑا مول لیا۔ گھر والوں کے سامنے ذلیل ہوئی"۔

"میرے لئے ذلیل ہونا اس کی عزت ہے پروین! لیکن کسی شخص سے پیار نہ کرتے ہوئے محض اس کی دلچسپی کو عزت دینا کسی طور سے مستحسن نہیں ہے"۔

"لیکن ندیم صاحب! اگر اپنے چاہنے والوں سے انسان محبت نہیں کر سکتا تو نفرت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ میں نے خود کئی بار محسوس کیا ہے کہ جو لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ان سے قلبی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود بھی میں ان کے لئے نیک جذبات رکھتی ہوں۔ اسے انسانی کمزوری کہہ لیجئے"۔

"مجھے اس سے اتفاق ہے۔ مگر اس حد تک کہ چاہنے والے کا جذبہ خلوص پر مبنی ہو۔ لیکن جب احترام کے جذبے میں چاندی کی جھنکار سنائی دے یا اس سے محض جنسی آسودگی کا پہلو نکلے تو یہ برداشت کی چیز نہیں رہتی پروین!"

پروین ہنس پڑی۔

"آپ تو سچ مچ بہت سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ میں بحث کرنے نہیں آئی---- مگر پھر بھی اتنا عرض کروں گی کہ اس وقت آپ کی باتیں مجھے بالکل غیر قدرتی لگ رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ شمسہ کو حقیر سمجھنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ شاید یہ رویہ آپ

کے احساس برتری کے جذبے کو غیر ارادی طور پر تسکین دے رہا ہے۔ ورنہ کسی کی چاہت کی نیت جس رنگ میں بھی ہو' محبوب کی کسی خاص ادا سے جنم لیتی ہے۔ ایسے میں نہ تو چاہنے والے کی نیت پر الزام آ سکتا ہے نہ محبوب کی فطری ادا گردن زدنی ہو سکتی ہے!"

"چلو یہی سہی۔ اگر آپ اتنی وسیع النظر اور عالی ظرف ہیں تو مجھے کہنے دیجئے کہ اس وقت آپ مجھے بہت حسین لگ رہی ہیں۔ آپ کی بات کرنے کی ادا' آپ کے لب لعلین کی جنبش مجھے ترغیب دے رہی ہے کہ آپ کو سینے سے لگا لوں کیا آپ میری اس فطری خواہش کو پورا کریں گی؟"

وہ پھر ہنس پڑی۔ لجا کر بولی۔

"آپ تو انتہا پسندی پر اتر آئے ہیں۔ میں انسانی احساسات کا ایک لطیف پہلو بتا رہی تھی"۔

"میں نے آپ ہی کی بات ذرا واضح کر کے کہی ہے۔ اگر ہر کہ و مہ کی پسند کو عزت دینے کی گنجائش رکھی جائے تو مجھے بوسہ دینے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے صرف زندگی کے اقدار مجروح ہوں گے۔ ذاتی طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ الٹا ہم دونوں کو راحت ملے گی"۔

وہ گھبرا کر بولی۔ "آپ تو موضوع سے بہت دور چلے گئے ہیں"۔

"میں موضوع کے قریب آگیا ہوں۔ آپ گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کا بوسہ نہیں لوں گا۔ میں جس نظریئے پر عقیدہ رکھتا ہوں اس کی ایک قدر یہ بھی ہے کہ آپ جو تن تنہا میرے کمرے میں میرا اعتماد لے کر آئی ہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر زندگی کی قدریں کچھ پابندیاں عائد کرتی ہیں تو وہ قبول کر لی جائیں۔ شمسہ اگر مجھ سے محبت کرتی ہے تو وہ صرف مجھ سے محبت کرے۔ زندگی کی قدروں کی طرح بوسے کی تسکین بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹنے والی چیز نہیں ہوتی"۔

"تو آپ مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ مجھے پسند کرتے ہیں ان سے

نفرت کروں؟"

"میرا مطلب یہ نہیں۔ میں صرف اپنا عقیدہ بتا رہا ہوں کہ بوسے کی تقسیم معاشرے میں انتشار کا باعث بنتی ہے۔ میں شمسہ کے بوسے کی سعادت کا واحد امین بننا چاہتا ہوں۔ اس کی جذباتی لگن کے پھیلاؤ کو برداشت کرنے کی مجھ مین بالکل ہمت نہیں ہے۔ میں اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ وہ سینہ سپر ہو کر اپنے پیار کی حفاظت کرے۔ مگر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ امارت سے مرعوب ہو کر اس کے سینے میں کسی کے احترام کا جھوٹا جذبہ پروان چڑھے۔ میں اس کے حسن کی تعریف کرنے والوں کے لئے گھر کا دروازہ کھلا نہیں رکھ سکتا!"

پروین لاجواب ہو کر بولی۔

"آپ اپنی دعوت اور بہن بھائی کی لڑائی کی بات تو بھول بیٹھے ہیں"۔

"نہیں پروین! میں اسے بھولا نہیں ہوں۔ لیکن اس نئے انکشاف نے اس کی اہمیت کم کر دی ہے۔ جو لڑکی بھرے گھر میں اپنے حق کے لئے آواز بلند کر سکتی ہے' یقیناً وہ اپنی محبت میں ناکام نہیں ہو سکتی۔ مگر سوال یہاں نظریاتی اختلاف کا ہے"۔

پروین نے مسکرا کر پرس سے ایک خط نکالا۔

"یہ لیجئے۔ میرے خیال میں شمسہ بالکل وہی لڑکی ہے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔ اس خط میں ساری تفصیل لکھی ہے۔ ہاں مجھے اب اجازت دیجئے"۔

وہ ہنس کر کھڑی ہو گئی۔

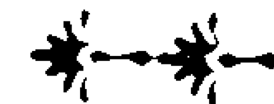
"دیکھئے! آج دعوت کھانے نہ آئیے گا۔ میرے آنے کا خاص مقصد یہی تھا"۔

میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"نہیں آؤں گا---- لیکن وہ آپ کی سہیلی کی ہلکی میٹھی' اسٹرونگ چائے کا وعدہ؟"

"وہ وعدہ ہی کیا جو ایفا ہو گیا"۔

ہمیشہ کی طرح ایک دلکش قہقہے کی گونج کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔



شمسہ کا خط انتہاپسندانہ جذبات کا رنگین مرقع تھا۔ شک کی چنگاری خط کے افسانوی تاثر نے بجھا دی تھی۔ بلکہ اس کے احترام کا جذبہ دل میں کچھ اور شدید ہو گیا تھا۔

اپنے طویل خط میں اس نے ایک جگہ لکھا تھا۔

ندیم ایک بات عجیب ہوئی۔ اس لڑائی میں میں نے بھائی جان کو ایک تنکے کے سماں سمجھا تھا۔ میں تنہا تھی۔ مگر میں بہت دلیر ہو گئی تھی۔ بہت مستقل مزاج۔ میرے اندر بے حد خوداعتمادی آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری کائنات ایک طرف ہو جائے تو میں ساری کائنات کو للکار کر آپ کی آغوش میں پہنچ جاؤں گی۔

ندیم! آپ میرے ابا اور میرے بھائی کے گھر نہ آ سکے۔ اس بات نے مجھے ایک عجیب سا احساس دیا ہے' سوچتی ہوں کہ ایک باپ کے گھر میں بیٹی کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ اگر خدا بھی آدمی کا روپ دھار لے اور کوئی بیٹی اسے اپنے گھر بلائے تو باپ

اور بھائی اس پر بھی اعتراض کریں اور اس طرح بیٹی کی نگہداشت کے فریب میں رحمت حق سے محروم ہو جائیں۔

کتنا افسوس کا مقام ہے ندیم۔ کیسی اندھیرنگری ہے اس سماج میں، کتنی جانبداری سے انسانوں کی فطرت کو روندا جاتا ہے۔ کیسی بے تکی بات ہے۔

بھائی جان کہتے ہیں---- "میں جذبات کی رو میں اندھی ہو گئی ہوں!" میں پوچھتی ہوں۔ اگر یہ بات ٹھیک بھی ہو تو کون سی بری بات ہے۔ آخر جذبات مجھ میں کہاں سے آ گئے۔ میں نے یہ کسی سے چھینے نہیں۔ کسی سے مانگے نہیں، چوری نہیں کئے۔ یہ بھی تو میری سانس کی طرح مجھ میں رواں دواں ہیں۔ میرے دل، میری آنکھیں، میری روح، میرے ہاتھوں اور پیروں کی طرح جذبات بھی میرے وجود کا ایک حصہ ہیں۔ اگر وہ اندھے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ وہی تو ان کی اصلی شکل ہے۔ ہاتھ سے انسان چھو سکتا ہے۔ ناک کی طرح سونگھ نہیں سکتا۔ آنکھ دیکھنے کے لئے ہوتی ہے زبان کی طرح چٹخارے نہیں لے سکتی--- پھر جذبات سے دنیا لاش کی طرح بے حس ہونے کی توقع کیوں رکھتی ہے؟

جسم میں دوڑنے والے خون سے بھی لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی مرضی سے حرکت کرے---- کیسی غیر فطری طلب ہے۔ کتنے اوچھے لوگ ہیں یہ۔ بس چلے تو بادلوں سے کہہ دیں ہمارے کھیت سے باہر نہ برسو۔ ہوا کو گرہ لگا دیں۔ ستاروں سے روشنی چھین لیں۔ دھوپ سے تمازت چھین لیں۔ پانی سے روانی چھین لیں۔

بے رحم دنیا---- کہتی ہے پتھر بن جاؤ، طلوع سحر کو محسوس کرنا چھوڑ دو، چشم آہو کا تصور بھول جاؤ، پھول کی خوشبو کو محسوس نہ کرو۔

پاپی اور اندھی دنیا---- دل کی دھڑکنوں پر بھی اپنی رضا اور حکومت چاہتی ہے۔ ان کے خیال میں ہماری بصارت کا نور بھی ان کی آنکھوں میں سما گیا ہے--- پڑھے لکھے جاہل، اجڈ اور خودغرض۔

تعلیم اگر اپنے مقصد سے بھٹک جائے تو ایک ان پڑھ خودغرض کے مقابلے میں انتہائی منجھے ہوئے خودغرض کو جنم دیتی ہے۔

پر ندیم! آپ مطمئن رہیں۔ میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ میں آپ کی ہوں۔ میں آپ ہی کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔ میں آپ ہی کی رہوں گی---- میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی!

میں نے یہ خط بار بار پڑھا۔ اور ہر بار ایک نئے رنگ میں محظوظ ہوتا رہا۔ رات بھی اسے پڑھتا رہا۔

آج وہ آئی۔ تو میں نے بے تحاشہ اسے چوما۔ لیکن وہ خلاف معمول خاموش کھڑی رہی اور پھر سنجیدگی سے بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا--- اس کے ہاتھوں کو سہلایا۔ بالوں کو چوما، پاؤں کو چھونے پر بھی اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب بھی میں نے اس کے پاؤں کو چومنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تڑپ تڑپ گئی تھی۔

لیکن آج اس نے برا نہ منایا۔ غصے نہ ہوئی۔ تو میں سمجھ گیا کہ وہ روٹھی ہوئی ہے۔ میں نے اسے مزید چھیڑا تو بولی۔

"مجھے افسوس ہے کہ ایک آوارہ لڑکی نے آپ کو خواہ مخواہ بلا کر دھوکا دیا ہے!"

اچھا یہ بات ہے"۔ میں ہنس پڑا--- "غالباً" پروین نے سب کچھ کہہ دیا ہے"۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے نہیں بتانا چاہیے تھا"۔

"جی نہیں! اس نے اچھا کیا کہ میرے احساسات تم تک پہنچا دیئے ہیں۔ میں اپنی محبت میں کوئی شریک برداشت نہیں کر سکتا"۔

اس نے میری طرف گھمبیر نگاہوں سے دیکھا۔

"مگر آج تو یہ سوال تمہاری آنکھوں میں نہیں ہے؟"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا--- اس کا پائنچہ قدرے اوپر کو سرک گیا تھا۔ اس کی آدھی پنڈلی ننگی تھی۔ اس کی پنڈلی پر ننھی ننھی لویں تھیں۔ ان لوؤں کو دیکھ کر میری روح میں ایک عجیب گدگدی سی ہوئی۔ میں چند لمحے ان ریشمی لوؤں اور مرمر جیسی پنڈلی کو دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ شمسہ بھی میری طرف متوجہ ہوئی۔ ایک دو لمحے کو دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔

"کیوں جی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے جی کہ کل میں واپس جا رہا ہوں"۔

شمسہ نے ایک دم چونک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا--- "نہیں ندیم نہیں۔ ابھی نہیں!"

"نہیں شمو اب مجھے چلا جانا چاہیے"۔

"مگر ندیم-------" اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"اری بیوقوف! اب تم پھر رونے لگیں"۔ میں نے اسے سینے سے لگایا۔ "آیا ہوں تو کیا جاؤں گا نہیں؟"

"مگر اتنی جلدی"۔ اس نے احتجاج کیا۔ "ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ روز بھی نہیں

ہوئے"۔

"شمسہ!" میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ "یہ تڑپ تو اب روز بروز بڑھے گی۔ بچوں کی طرح رو کر مجھے روکنا اس کا علاج نہیں ہے۔ بلکہ اب سوچنا یہ ہے کہ کیسے اور کیونکر ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں"۔

وہ ایک دعوئ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے اس پر سوچ لیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ کوئی دیوار ہمیں الگ نہیں کر سکتی۔ آنسو تو مجھے خواہ مخواہ آ جاتے ہیں۔ ندیم۔ رونا کوئی میری کمزوری تو نہیں ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ سمندروں کی تہہ تک جانے کے لئے تیار ہوں"۔

میں اس کے نرم ہاتھ کی ریشمی ریکھاؤں کو دیکھنے لگا۔

"شمو! تمہارے ارادوں کی گونج بہت پیاری ہے۔ لیکن اگر سانپ مرجائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے تو یہ زیادہ اچھی بات ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارا پیار بہت طاقتور ہے' مگر مزہ تو جب ہے کہ انسان طاقت کا احساس کرا دے اور پھر اس سے کام نہ لے"۔

"ہو گا بھی یہی"۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں نے بھائی جان کو محسوس کرا دیا ہے کہ زندگی کے ساتھی کے انتخاب میں میں کسی کا جبر قبول نہیں کروں گی۔ آپ اسے کھانے پر نہ بلائیں کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب میں بھی آپ کی طرح اپنے گھر پر فخر کروں گی"۔

اپنے گھر کے دعوئ اور فخر سے شمسہ کا جذباتی پن نمایاں تھا۔ سچ مچ اس لمحے اس کے چہرے پر غرور اور متانت کی شان تھی۔ شوہر کے گھر کا تصور اور گھر کی دیوی کی آن بڑی حسین تھی۔ گاہے گاہے تکبر' خودی کا روپ دھار کر آئے تو بے حد حسین لگتا ہے۔ اگر لفظوں کے معنی چند لمحوں کے لئے عاریتاً" لئے جا سکتے تو غصے اور رعونت کو سچائی کہنے میں' میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کرتا"۔

اطمینان کی اس آگ میں زندگی کا پورا نشہ تھا۔

”تو پھر میں چلا جاؤں شمسہ؟“ میں نے بے حد پیار سے پوچھا۔

”نہیں!“ وہ اکڑ کر بولی۔ ”تم میری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے!“

”مگر اجازت ہی تو مانگ رہا ہوں“۔

”جانا ہے تو چلے جانا۔ مگر اپنے طور سے ذکر کر کے نہیں۔ جب میں چاہوں تب۔ میں تمہیں بور ہونے کی حد تک نہیں ٹھہراؤں گی۔ جب مناسب سمجھوں گی کہہ دوں گی“۔

میں ہنس پڑا۔

”یعنی تم ایک طرح سے ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تمہاری اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا“۔

”ہاں!“ اس نے مٹھی بھر کے میرے بال کھینچے۔ ”کم از کم تمہارے معاملے میں تو مجھے اختیار ہونا چاہیے کہ جو چاہوں کر سکوں۔ ایک لڑکی کو زندگی میں ایسے لمحے ضرور میسر آنے چاہئیں کہ وہ اپنے پیار کی قوت کا انتہائی مظاہرہ کر سکے“۔

”خوب! یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ پیار میں دلیل اور وکیل کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ انتہا پسندی پر ہی سچا پیار موقوف ہوتا ہے“۔

”کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ اگر پیار میں ہنگامہ نہ ہو' شہرت کی حد تک بدنامی نہ ہو' مرنے مارنے کی ہمت نہ ہو تو وہ پیار نہیں۔ لذت پسندی کی کوئی شکل ہو گی“۔

”تم جو کچھ کہہ رہی ہو۔ کاش یہ کتابوں سے لیا ہوا افسانوی تاثر نہ ہوتا!“

وہ تڑپ اٹھی۔

”تم بار بار اس بات کو کیوں دہراتے ہو۔ ندیم کہ میں دوسروں کے خیالات سے تراشیدہ مصنوعی کتابی لڑکی ہوں۔ تم مجھے سنگ مرمر کی گھڑی گھڑائی مورت کیوں سمجھتے ہو۔ تم یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ میں ذاتی احساسات کی پابندی میں سربلندی محسوس کرتی ہوں؟“

”لاشعوری طور پر جذباتی ہو جانے والے لمحے واقعی آفاقی ہوتے ہیں شمسہ! مگر ان کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ اس اختصار میں سچ ضرور ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے تلخ حقائق اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں“۔

وہ چمک کر بولی۔

”یعنی غیر شعوری جذبات کی رعایت سے تم میرا بھروسہ کرتے ہو۔ مگر شعوری لڑکی ہونے کے اعتبار سے میری حیثیت ختم ہو جاتی ہے“۔

”نہیں شمسہ میرا مطلب یہ نہیں۔ فہم و ادراک اور جذبات کا انتہائی پن اپنی اپنی جگہ دونوں مضر ہوتے ہیں۔ دونوں کا اعتدال ہی زندگی کو حسین بناتا ہے۔ جذبات کا راہی نیک نیتی سے اچھائی برائی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اچھا تو ہوتا ہی ہے لیکن برا بھی سچ کے لئے بنتا ہے۔ مگر عقلمند آدمی سچ میں نقصان کا پہلو دیکھ کر دامن بچا جاتا ہے۔ پر برا نہیں کہلاتا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں جذبات کی مصلحت کوشی شعور کی مصلحت بینی پر فضیلت پاتی ہے“۔

وہ ہنس پڑی۔

”یہ تو تم میرے ہی خیال کی تائید کر رہے ہو۔ میں پیار کے لئے تخریب پسندی کی قائل ہوں۔ یہی بات بدل کر تم نے دوسرے رنگ میں کہہ دی“۔

”یہ تمہارا خیال نہیں شمسہ۔ تخریب پسندی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے میں ایک گونج ہے۔ اس گونج میں ایک شہرت ہے اور اس شہرت کے ہاتھوں انسان بے سوچے سمجھے کھلتا ہے“۔

”مگر اس طرح تو ایک شبہہ اور پیدا ہو جاتا ہے ندیم!“

”کیا؟“

”کہ اگر انسان فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے اور اس کی فطرت تخریب پسندی ہے تو پھر گناہ کا تصور اور معاشرے کی قید کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی“۔

”ٹھیک ہے۔ اگر خدا کا تصور ذہن سے نکل جائے تو فطرت پسندی ہی زندگی کا

معیار بن جائے۔ مگر اس طرح شر نسبتاً بڑھ جائے گا۔ اپنی پسند کو فطرت کہہ کر دوسرے کی ناپسندیدگی اور انکار کا احترام ختم ہو جائے گا۔ دوسرے معنوں میں قوت، فطرت کا روپ دھار کر عصمتیں لوٹے گی۔ مگر خدا کا تصور ایک ایسی مرکزی روشنی ہے۔ جس میں زندگی کا یہ انتشاری پہلو صاف نظر آتا ہے"۔

شمسہ سٹپٹا گئی۔

"مجھے تو خاک سمجھ نہیں آئی ندیم! ادھر تم فطرت کے تقاضوں کو جائز سمجھتے ہو، ادھر خدا کے تصور کو لافانی بتاتے ہو"۔

"میرا مطلب صاف ہے شمسہ! میں خدا کی ہستی سے انکار نہیں کرتا۔ میں خدا کی دی ہوئی فطرت کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ مگر جذبات اور عقل کی طرح فطرت کے تقاضوں میں بھی اعتدال پسندی کا قائل ہوں۔ فطرت پر ناجائز پابندی جہاں قتل معصوم کے مترادف ہے۔ وہاں سرکش فطرت کی بے مہار آزادی انسانی تہذیب کی تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے"۔

"تمہاری یہ باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن تم نے اس خیال کو بے کار داد دی تھی کہ پیار کے لئے مرمٹنا زندگی کی خوبصورت انتہا ہے"۔

"بے شک! ایسی موت حسین ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی تحریک کا جذبہ اختیاری نہ ہو۔ اس قسم کی موت میں دو پہلو ہوتے ہیں۔ کبھی یہ ہوس کی غیر تکمیلی صورت میں جنسی تڑپ کی شکل میں سامنے آتا ہے اور کبھی اس میں خود کو داستانوی کردار بنانے کی خواہش کارفرما ہوتی ہے"۔

شمسہ ٹک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ پھر ایک خاص توقف کے بعد بولی۔

"تم نہایت ہی خطرناک قسم کے ذہین آدمی ہو۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھتے ہو اور پھر دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ پہلے میں محبت کے لئے قربان ہونا ہی سب کچھ سمجھتی تھی۔ اب تم نے میرے دل میں یہ شک ڈال دیا ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو گویا اپنی ذات کے لئے مروں گی"۔

"بالکل درست! ہم اپنی ذاتی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔ جب اس کے حصول کا کوئی وسیلہ باقی نہیں رہتا تو موت کی گود میں پناہ لیتے ہیں"۔

"گویا یہ حقیقی موت نہیں ہے"۔

"میرے نزدیک یہ ایک انفرادی فعل ہے جو انتہائی محرومی کی ایک فراری شکل ہے۔ دو چاہنے والوں کے درمیان ایک خاص غرض کا رشتہ ہوتا ہے۔ اسے ہم جسم یا بوسے کا رشتہ کہہ سکتے ہیں۔ دنیا میں اور رشتے بھی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کا، بہن بھائی کا، لیکن جب بہن مرتی ہے تو بھائی روتا ہے۔ خودکشی نہیں کرتا۔ اسی طرح بیٹا مرتا ہے تو ماں ماتم کرتی ہے۔ باپ بھی روتا ہے۔ مگر بیٹے کے ساتھ قبر میں کوئی نہیں جاتا---- یہ سب اس لئے کہ بہن بھائی کا رشتہ یا ماں بیٹے کا رشتہ خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ غرض سے بے نیاز---- بہن یا بیٹا مرتا ہے تو ان سے وابستہ کسی غرض کا انتقال نہیں ہوتا---- لیکن جب دو چاہنے والوں میں سے کوئی مرتا ہے تو ساتھ ہی غرض کی بھی موت ہو جاتی ہے۔ بوسے کی تسکین ادھوری رہ جاتی ہے۔ یوں طالب و مطلوب ایک دوسرے کے لئے خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ موت حقیقی موت نہیں ہوتی۔ بلکہ غرض کی موت اس موت کی محرک اور بنیاد ہوتی ہے!"

شمسہ بالکل ڈوبتے ہوئے بولی۔

"تو تم یہ کہو نا کہ محبت سچائی نہیں محض خودغرضی ہے؟"

"بے شک اسے خود غرضی بھی کہہ لو۔ لیکن فطرت کے رنگ میں رنگی ہوئی۔ یہ خودغرضی گالی نہیں ہے۔ فطرت کی پکار ہے۔ قدرت تخلیق بند نہیں کر سکتی۔ تخلیق کے لئے خودغرضی بھی ضروری ہے۔ اب ایسی خودغرضی کو جس پر کوئی بس نہ چلے جو بیک وقت دیدنی ہو۔ آفاقی بھی ہو۔ محبت کہہ لو۔ سچائی کہہ لو۔ وہ ایک نہ بدلنے والی حقیقت ہے!"

شمسہ تڑپ تڑپ گئی۔

"تم کیا بھول بھلیاں انسان ہو ندیم! تم زندگی کی اقدار کی ساری شمعیں بجھا

رہے ہو۔ تم محبت کو فریب کہتے ہو۔ اور فریب کو محبت کہتے ہو۔ اور پھر محسوس کراتے ہو کہ جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو"۔

"یقیناً میں ٹھیک کہتا ہوں شمسہ! ورنہ تم اسے تسلیم نہ کرتیں جو بات سمجھ میں آ جائے اس میں سچ کا شائبہ ہوتا ہے۔ ورنہ ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ ایسی باتیں فوری طور پر نئی اس لئے لگتی ہیں کہ چاہت کے نشے میں یہ لطیف فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اور پھر دنیا کی کتابوں میں پیار کا مفہوم اتنا واضح اور پھیل گیا ہے کہ اس کے لئے ایک خاص طرح کا جینا اور مرنا ہمارے دلوں میں ایک خاص عقیدے کی طرح مستحکم ہو گیا ہے۔ دنیا کے رومانی قصوں کو ہمیشہ داد ملتی رہی ہے۔ اس لئے محبت کی انتہائی صورت پر قطعی یقین کرنے میں ہم جانبدارانہ فیصلہ کرتے ہیں"۔

شمسہ اپنی ذہنی گرہ کھولتے ہوئے بولی۔

"میں تو صرف اتنا جانتی ہوں ندیم! کہ جب بھی تمہارے لئے میرے آنسو نکلے ہیں، میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ میرے ایک آنسو کی قیمت ساری خدائی پر بھاری ہے۔ ایسے لمحوں میں مجھے خدا کی ذات کی طرح اپنی محبت کی سچائی پر یقین آیا ہے"۔

"شمسہ! جوانی اس پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہے، اس لئے کہ جوانی بھی بذات خود ایک سچائی ہے مگر ایک مدت بعد جب جوانی کے چہرے پر جھریاں پڑتی ہیں تو حسن باسی باسی لگنے لگتا ہے اور جوانی کے چند سالوں کے بعد یہ راز کھل جاتا ہے کہ پیار کے پاؤں ڈگمگانے لگے ہیں"۔

شمسہ میری ہر بات کے تردیدی انداز سے گھبرا کر بولی۔

"تمہاری ہر بات میں تجربے کی درشتی اور سختی پائی جاتی ہے۔ تم حسن، جسم اور محبت کی بات کرتے ہو تو ایک لمحے کے لئے بھی کنوارے نہیں لگتے۔ تمہاری ہر بات کنوارپنے کی معصوم لغزشوں کی بجائے زندگی کی روکھی حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے"۔

میں ہنس پڑا۔ "تو کیا تمہیں میری یہ حقیقت پسند نہیں کہ تمہیں حقائق کا پتہ دوں؟"

"یہ بات نہیں" اس کا لہجہ بدستور مشکوک تھا۔۔۔ "مگر میں حیران ہوں کہ دس برس بعد کی ہونے والی نفرت کی پیش گوئی کیونکر کرتے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک تجربہ کار آدمی ہو۔ تمہاری زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں اور وہ تمہارے نظریات کا شکار ہوتی گئیں۔ اور ایک روز میں بھی اس نفرت کی نذر ہو جاؤں گی!"

"بیوقوف لڑکی!" میں نے پیار سے اس کا کان کھینچا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو میں اپنے شکار کو نظریات کا ہوا دکھا کر ڈرانے کی حماقت نہ کرتا۔ میری بات کی تہہ تک پہنچو۔ آنکھ روح میں نہیں جھانکتی، خد و خال سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ چہرے کی شگفتگی اور پژمردگی سے زاویہ نگاہ بدلتی رہتی ہے۔ دور کیوں جاتی ہو۔ اگر ہم ایک دوسرے کے معیار پر پورا نہ اترتے تو اب تک میرے فریب کا حلقہ اور تمہارے یقین کا طلسم دونوں ٹوٹ چکے ہوتے"۔

اس نے ایک نئی پناہ لی۔

"مگر تم نے تو اپنے خطوط میں لکھا تھا کہ تم میری صورت کے نہیں، میری روح کے پرستار ہو۔ کیا وہ جھوٹ تھا؟"

"شاید وہ جھوٹ ہو۔ ہو سکتا ہے یہ جھوٹ میرے ذہن کے کسی پردے میں چھپا بیٹھا ہو۔ تب مجھے اس کا علم بھی نہ ہو۔ میں نے روح کی پرستاری کا دعویٰ بھی نیک نیتی سے کیا ہو۔ مگر اس کے باوجود میں فریب کی حد تک اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ تم حسین ہو گی۔ اور پھر اپنے چاہے جانے کی خواہش اتنی دلکش تھی کہ تمہارے اوسط درجے کا حسن بھی تمہاری لگن کی وجہ سے انمول بن گیا تھا۔ ہو سکتا ہے تم بھی میری طرح سوچتی رہی ہو۔ مگر مجھے دیکھنے کے بعد تم نے بھی اپنے شکوک پر اخلاص کی مہر لگا دی ہو"۔

وہ خاموشی سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ کچھ بولے گی۔ لیکن اس کی پر اسرار خاموشی گھمبیر ہوتی چلی گئی۔ اس کی خاموشی کے اسرار کو سمجھتے ہوئے

میں نے کہا۔

"دیکھئے نا۔ خطوط میں اخلاص کی بھرمار کے باوجود اگر ہم ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے تو یہ اچنبھے کی یا انوکھی بات نہ ہوتی۔ کم از کم میں تو اس قدرتی ناپسندیدگی کو بے وفائی ہرگز نہ کہتا۔ روایات کی خاطر دل پر جبر تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر کیا فائدہ ایسی قربت کا جس میں سچائی نہ ہو۔ جس کی بنیاد پھسلتی ریت پر ہو"۔

"مگر ان سب باتوں کا نچوڑ یہ نکلا نا کہ چند برس بعد ہماری محبت کے چہرے پر چیچک کے داغ نکل آئیں گے۔ ہماری لگن کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ اور آپس کی کشش ختم ہو جائے گی؟؟"

"ہاں بالکل یہی ہوتا ہے جس پیار کو سیب جیسے رخساروں نے جنم دیا ہو۔ جو دلکش آنکھوں اور رسیلے ہونٹوں کا داعی ہو۔ اس کی عمر تو ان دلکشیوں تک محدود ہو گی۔ مگر قدرت نے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ تب تم میرے بچوں کی ماں بن جاؤ گی۔ میں تمہارے بچوں کا باپ بن چکا ہوں گا۔ ایک طرف ماں کی ممتا ہو گی۔ دوسری طرف باپ کی شفقت ہو گی۔ تم ممتا کے جوش میں میری بڑھی ہوئی توند کو بھول جاؤ گی اور میں معصوم نکھرے ہوئے چہروں اور تمتماتے رخساروں والے بچوں کو دیکھ کر تمہارے پچکے ہوئے گالوں کا خیال نہیں کروں گا۔ تم شوہر کے ذاتی کارناموں پر خوش ہونے کی بجائے اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے والے باپ پر فخر کرو گی۔ اور میں بیوی کے ذاتی اوصاف بھول کر اپنے بچوں کو پیار کی تھپکی دے کر گود میں سلا دینے والی مہربان ماں کے تصور سے مست ہو جایا کروں گا۔ اور یہ زندگی اسی طرح شفاف ندی کی طرح بڑھتی چلی جائے گی!"

"ہائے ندیم!" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "تم کتنے خطرناک آدمی ہو!"

وہ کٹے پتنگ کی طرح میرے شانے پر آ گری۔ اور میرا بازو دانتوں سے کاٹنے لگی۔ میں نے اسے چوٹی سے پکڑ کر کھینچا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو دمک رہے تھے۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"ارے ندیم! ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جس سے دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ تو مجھے زندگی میں ایک دن ہی چاہ لے، مگر سچے دل سے، اس چاہت میں تمتماتے رخساروں کا واسطہ نہ ہو، مے بھری آنکھوں کی سفارش نہ ہو، شہد آگیں لبوں کا لالچ نہ ہو۔ صرف ایک لمحہ ہی چاہ لو۔ لیکن ہر ہوس سے پاک، ہر آلودگی سے آزاد، ہر کیف سے بے نیاز، مجھے اپنے سینے میں چھپا لو ندیم۔ مگر اس طرح جیسے کلی چٹخنے سے پہلے خوشبو کے راز کی امین ہوتی ہے۔ میرا بوسہ لے لو ندیم۔ مگر اس طرح جیسے چاند کی کرن چپکے سے پھول کی پنکھڑی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ مجھے ڈرایا نہ کرو میرے ساجن، میرے ساتھی، میرے محبوب۔ میرا ننھا ننھا سا دل پاش پاش ہو جائے گا۔ تم مجھے پیار کے حدود اربع نہ سمجھایا کرو پیارے ندیم، تم مجھ سے پیار کی باتیں کرو صرف پیار کی۔ نفرت کرنا ہے تو کرنا۔ مگر جتانا نہیں کہ یہ نفرت ہے۔ تم مجھے ستاؤ، رلاؤ، تڑپاؤ، تمہارے ساتھ زندگی کا ایک ایک لمحہ آنسوؤں کے ایک ایک قطرے کے عوض بھی مہنگا نہیں۔ مگر کہنا کہ مجھے تم سے پیار ہے! پیار کی بنسی بجانا۔ میں تمہارے ساتھ پاتال تک چلی جاؤں گی۔ پیار کی بین بجانا۔ میں تمہارے ساتھ سیاہ اژدھے کے منہ میں چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی جاؤ پیارے، جنت میں جہنم میں، میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔ میری روح تمہارے قدموں میں دیپ جلاتی رہے گی!"

شمسہ نے سچ مچ اس طرح اپنا سر میرے سینے میں چھپا لیا تھا، جیسے مرغی کے بچے باز کو منڈلاتا دیکھ کر ماں کے پروں میں چھپ جاتے ہیں۔ ساری بحث کا خطرہ تسلی بن کر معصوم بچے کی طرح میری آغوش میں سما گیا تھا۔

دو دن اور ٹھہرانے کے بعد شمسہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور آج میں جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ آتے وقت شمسہ مجھے اسٹیشن پر لینے نہیں آئی تھی۔ مگر آج جاتے وقت الوداع کہنے آئے گی۔ ٹھیک تین بجے ٹرین چھوٹنی تھی۔ وہ آدھ گھنٹہ پہلے آ گئی۔ آج بھی وہ پہلے دن کے ملاقات کے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ ہاتھ میں دو لفافے تھے۔ مجھے دور ہی سے دیکھ کر مسکرا پڑی۔ پہنچتے ہی بولی۔

"کہیں ٹرین میں بیٹھ جائیں۔ مجھے کوئی دیکھ نہ لے"۔

میں نے "ٹرین میں کیسے بیٹھیں گے۔ میرے کمپارٹمنٹ میں چار پانچ شریف آدمی اور بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے ہم پیار کی الوداعی باتیں کیسے کریں گے"۔

وہ ہنس پڑی۔ میں نے مزید کہا۔

"ہنسنے کی بات نہیں۔ رات تم نے بھی کچھ کہنے کی آخری باتیں سوچی ہوں گی۔ میں نے بھی سوچی ہیں۔ آج ہم ذرا اوورایکٹنگ کر کے مصنوعی انداز میں الوداع ہوں گے"۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ "شاید میں نے تو کچھ سوچی بھی ہوں۔ مگر تم نے تو کچھ بھی نہ سوچا ہو گا"۔

"یہ سراسر بہتان ہے۔ میں تو کل سے یہ سب سوچ رہا ہوں۔ بیچارے دوستوں کو بھی جانے کی اطلاع نہیں کی۔ محض تمہارا الوداعی بوسہ لینے کے لئے!"

"بوسہ" وہ ہنس پڑی۔ "بھئی اب کہیں بیٹھو گے بھی۔ یہاں تو ہم سب لوگوں کا مرکز نگاہ بنے ہوئے ہیں"۔

"سب میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے۔ آؤ آگے چلیں"۔

ٹرین کے آخری سرے پر پہنچ کر ہم ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ شمسہ نے دونوں لفافے میری جھولی میں رکھ دیئے۔ ایک آسمانی زمین کی بے حد قیمتی ٹائی تھی اور دوسرے میں چار خوبصورت رومالوں کا سیٹ۔ دونوں چیزوں سے اس کے مزاج کی نفاست کا اظہار ہوتا تھا۔

"شکریہ شمو!" میں بے حد جذبے سے بولا۔ "اچھا بتاؤ آج تم کتنے آنسو لائی ہو---؟"

"یعنی---" شمسہ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

"بھئی یہی کہ جب ٹرین کا وقت ہو جائے گا تو تم ضرور آنسو بہاؤ گی۔ انہیں کے متعلق پوچھ رہا ہوں"۔

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ میں آنسوؤں سے تمہیں متاثر کروں گی۔ غلط بات ہے۔ میں پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ رووں گی نہیں۔ ایسا ہی غرور ہے تو منہ دھو لو۔ ان آنکھوں سے ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکے گا"۔

"ضد میں آ کر حقیقت کو نہ جھٹلاؤ۔ کیا فائدہ میرے جانے کے بعد راستے میں یا گھر جا کر آنسو بہاؤ اور میں اس سے لطف اندوز نہ ہو سکوں"۔

بات میں ذرا گنجائش پا کر بولی۔

"مگر تم تو اسے حقیقی نہیں مصنوعی آنسو کہتے ہو"۔

"نہیں" میں نے اسے دوبارہ چھیڑا۔ "میں اسے حقیقت اور تصنع کے بیچ کا کوئی مقام دینا چاہتا ہوں"۔ عورتوں کی سچائی اور تریا چلتر قدم بقدم ساتھ ساتھ چلتے ہیں!"

"بالکل واہیات!" وہ بپھر گئی۔ "میرا موڈ آف کرنے کی کوشش نہ کرو"۔

"بھئی میں کیا کروں تم فوراً آپے سے باہر ہو جاتی ہو۔ اچھا بتاؤ کس موضوع پر بات کریں؟"

وہ سنجیدہ منہ بنا کر بولی۔

"کم از کم دو دوست جو ایک نامعلوم عرصے کے لئے جدا ہو رہے ہوں۔ اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کبھی نہیں کرتے"۔

"اچھا آؤ--- ہم دونوں گلے مل کر زار زار روئیں تاکہ سب لوگوں کو علم ہو جائے کہ آج لیلیٰ اور مجنوں ایک دوسرے سے بچھڑ رہے ہیں"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عجیب ہوتے ہیں یہ رائیٹر لوگ بھی۔ انہیں پڑھو تو ارسطو کا گمان ہوتا ہے مگر ان سے ملو تو بچوں کی طرح ستاتے ہیں"۔

پھر اچانک اس نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے چونک کر دیکھا چار پانچ قدم کے فاصلے پر ایک صاحب نظریں نیچے کئے ٹہل رہے تھے.اور مسکرا رہے تھے ۔ شاید اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔

"تمہیں جانتا تو نہیں؟"

"نہیں"۔ شمسہ سرگوشی میں بولی۔ "مگر یہ کون سی شرافت ہے کہ وہ اس طرح دوسروں کی باتوں میں مخل ہو"۔

"مگر یہ کون سی تک ہے کہ ہم اس طرح بے وجہ لڑیں جھگڑیں"۔

وہ آدمی ہماری سرگوشیوں کو سمجھ کر کھسک گیا۔ شمسہ نے گھڑی دیکھی اور اچھل پڑی۔

"لو پانچ منٹ رہ گئے"۔ اس کے لہجے میں تردد اور پریشانی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"اچھا شمسہ! خط بالکل باقاعدگی سے لکھتی رہنا"۔

"جی ہاں! یہ بات تو مجھے کہنی چاہیے تھی۔ تم ہی خط دیر سے لکھتے ہو"۔

"میری اور بات ہے۔ ملازمت کی ذمہ داریاں ہیں"۔

"جی نہیں۔ تمہاری مصروفیات میری پریشانی سے قیمتی نہیں۔ تمہیں میرے لئے وقت نکالنا پڑے گا۔ تمہیں چاہیے کہ میری خوشی کو ہر چیز پر مقدم سمجھو"۔

اچانک گارڈ نے سیٹی بجائی۔ گاڑی کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف لپکے۔

پائدان پر کھڑے ہو کر میں اس کی طرف مڑا۔ وہ سراپا شوق و محبت بنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کپکپا رہی تھی اور وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پگلی!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھتی نہیں۔ ساری دنیا تمہیں دیکھ رہی ہے!"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ لیا۔ آنسو آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ گارڈ نے آخری سیٹی دی۔ گاڑی دھیرے دھیرے چل پڑی۔ شمسہ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں پائدان پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی احتیاط برت رہی تھی اور اب اسے اپنے رونے کے سوا کسی سے غرض تھی اور نہ کسی کی پروا۔

پیار زندگی کی ہر احتیاط پر غالب آ گیا تھا۔

جب تک وہ نظر آتی رہی۔ میں پائدان پر کھڑا رہا۔ شمسہ نے دوبارہ گاڑی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ لوگ ادھر ادھر جاتے رہے وہ اسی طرح ہاتھوں میں منہ چھپائے کھڑی رہی۔

حتیٰ کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مگر ایک لہراتا ہوا احساس چھوڑ گئی۔ اس احساس میں کتنی تسکین ہوتی ہے کہ کوئی تمہارے لئے روئے--- شمسہ کا انتہائی روپ کئی انداز میں ابھرا۔ وہ خوشبو کی طرح محسوس ہوئی--- رعد کی طرح چمکی--- اور روشنی کی مانند سامنے آئی۔

اس کی ابتداء انتہا کی طرح طوفانی تھی۔

خوشی کیا ہے۔ کیا نہیں ہے؟

قوس قزح نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ میں دو گھڑی کا جیون لائی ہوں۔

دسمبر کی چمکتی دھوپ اور جون کی ٹھنڈی چاندنی بھی ہمیں اپنا راز نہیں بتاتی وہ لمحے جو یاد ماضی بن کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں بیتی خوشی کی یاد دلاتے ہیں۔ مگر وہ اپنے وقت پر وہ لمحے بھی ہمیں نہیں بتاتے کہ ہم کتنے قیمتی ہیں۔

آنے والی گھڑیوں میں بھی شاید اسی قسم کی مسرت مخفی ہو۔ مگر کیا پتہ ہمیں علم نہ ہو اور وہ دبے قدم گزر جائیں۔

شاید عنقا کی تلاش ہی زندگی ہے؟

شمسہ مجھ سے دور رہ گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔

انسانی ذہن کا کیا اعتبار۔ وہاں سینکڑوں خیال آتے اور گزر جاتے ہیں۔ ہزاروں تصویریں بنتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔

کیا پتہ آنے والے کل شمسہ جانے والے کل کی شمسہ سے کتنی مختلف ہو۔

جس ذہن میں فطرت نے اتنی لچک ڈال دی ہو۔ وہاں سنگ مرمر کے بت کی طرح ترشے تراشے مجسمے کا کیا اعتبار۔

اگر متاثر ہونا فطری فعل ہے تو الزام کیسا؟

گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ کبھی ریگستانوں کا سینہ چیر کر اور کبھی سرسبز و شاداب وادیوں میں سے۔

مگر ریل کی پٹڑی کی شکل ہر جگہ ایک تھی۔

اور شمسہ ریل گاڑی نہیں تھی کہ ساری عمر پٹڑی سے نہ اتر سکے۔ اس کے پاس آنکھیں تھیں جو کوسوں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے پاس کان تھے جو نئے نئے نغموں سے اثر پذیر ہو سکتے تھے۔

سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں چھ سات آدمی بیٹھے تھے۔ ہر آدمی کی شکل نے ایک الگ تاثر دیا تھا۔۔۔۔ کوئی بہت اچھا لگا' کوئی بس ٹھیک ہی لگا اور کوئی اچھا نہ لگا۔

سب اجنبی تھے۔ دوست کوئی نہ تھا۔ دشمن بھی کوئی نہ تھا۔ بات کسی سے نہ ہوئی تھی۔ مگر محسوس کرنے کے جذبے اپنے اپنے طور سے اپنے اپنے رنگ میں موجود تھے۔

بچھو کی دم کی طرح نوکیلے مونچھوں سے خدا واسطے کے بیر۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں اور پچکے ہوئے گالوں پر خواہ مخواہ کی ملامت۔ کوئی ڈکار لینے کی وجہ سے برا لگے۔

اور کسی کی آنکھوں میں خواہ مخواہ کا تقدس محسوس ہو۔

کوئی خد و خال کی وجہ سے اچھا لگے۔۔۔ اور کوئی اپنے مسخرے پن کی وجہ سے بھا جائے۔

یہ ہے انسانی ذہن۔۔۔۔۔

جو بن جتائے پیار کرتا ہے۔ بن جتائے نفرت!

جب زندگی میں اتنی غیرجانبداری سے پسند اور ناپسند کے مواقع موجود ہوں۔

وہاں محبت پر یقین کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے؟

یہ بالکل نئی سوچ تھی۔

پیار کے معاملے میں زیادہ حساس ہونا بھی زندگی سے سکون چھین لیتا ہے۔ آخر اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ میں اس کی جدائی کا نفسیاتی تجزیہ کروں۔ اس کے ساتھ بیتے ہوئے لمحوں میں تسلی کے عنوان بھی تو بہت ہیں۔ وہ انسان سہی۔ اس کے پاس انسان کی فطرت سہی۔ کل وہ چلی بھی جائے مگر آج تو اس کی ہے۔۔۔۔ کل کے غم میں' اس کل کے غم میں جو سوچوں کی وادی میں جنم لے رہا ہے۔۔۔۔ آج کی خوشی سے لطف اندوز نہ ہونا کتنی بڑی حماقت ہے۔

خزاں کے ڈر سے بہار کی رنگینیوں کو نظرانداز کرنا بیوقوفی ہے۔

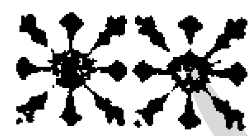
موت کی اٹل حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد ہی زندگی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نہیں! شمسہ میری ہے۔ اس کے آنسو میرے لئے بہے ہیں۔ وہ جگنو میرے لئے چمکے تھے۔ وہ نسوانی پندار میرے سامنے سرنگوں ہوا تھا۔

مرکز میں ہوں!

منبع میں ہوں!

سرچشمہ میں ہوں! میں۔۔۔۔ میں!!۔۔۔۔ میں!!!



اگلے دن میں ڈیوٹی پر حاضر ہوا۔ تو ریڈیو اسٹیشن کا ماحول ہی کچھ اور تھا۔ ہر طرف ناہید کے چرچے تھے۔ ہر زبان پر اس کے حسن کا ذکر تھا۔ خوبصورتی کے معاملے میں ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ہر دل' ہر زبان اور ہر آنکھ ایک ہی معیار پر متفق نظر آئے۔ وہاں بن دیکھے چونکنا بالکل فطری ہے۔

میرے دل میں قدرتی طور پر اسے دیکھنے کی تمنا پیدا ہوئی۔

ناہید ایم اے کی طالبہ تھی۔ اس کے والد کارپوریشن میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ حال ہی میں اس کا معاہدہ ریڈیو والوں سے ہوا تھا۔ وہ روزانہ شام کو مقامی خبریں نشر کرتی تھی۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اس کی آواز میں بڑی کھنک ہے۔ جب سے اس نے لوکل خبریں سنانی شروع کی ہیں۔ روز ایک آدھ خط اس کی تعریف میں آ جاتا ہے۔ چپڑاسی سے لے کر اسٹیشن ڈائریکٹر تک سب اس کے مداح ہیں۔ سب اس کا دم بھرتے ہیں اور سب اس کا احترام کرتے ہیں۔

بہت سے لوگ ڈیوٹیاں ختم ہونے کے باوجود ریڈیو اسٹیشن میں ٹھہرے رہتے ہیں۔ تاکہ شام کو وہ خبریں سنانے آئے تو اسے ایک نظر دیکھ سکیں اور پھر وہ خلیق اتنی

ہے کہ بلا امتیاز ہر چھوٹے بڑے کو بے حد خلوص سے سلام کرتی ہے۔ اس بات نے اسے اور زیادہ ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا کہ میری غیر موجودگی میں پچھلے ہفتے میرا لکھا ہوا ڈرامہ نشر ہوا تھا تو ناہید نے اس کی بے طرح داد دی تھی۔ یہ غائبانہ داد مجھے ایک غائبانہ سا رشتہ محسوس ہوا۔

چار بجے میں ڈیوٹی سے فارغ ہوا' خبریں شام کے چھ بجے نشر ہوتی تھیں۔ گویا ابھی اس کے آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ ڈرامہ سیکشن کے مسٹر رضوی نے مجھ پر زور دیا کہ میں اسے ضرور دیکھوں۔ اس اصرار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے تعارف کی آڑ میں خود اسے بھی گفتگو کا موقع مل جائے گا۔ ویسے میرے ذہن میں اسے دیکھنے کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں تھا۔

خبریں سننے کے بعد اس کے لہجے کی متانت اور آواز کا لوچ واقعی مجھے اچھے لگے۔ رضوی اور میں کنٹین آئے۔ وہاں اور لوگوں کے علاوہ ننھے منوں کو پریوں کی کہانیاں سنانے والی آپا جہاں آرا بھی تشریف فرما تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے بھاری بھر کم جسم سمیت اچھل پڑیں۔

"ارے تم ــــ کب آئے ندیم؟"

میں ہنس پڑا۔ "ڈیوٹی پر تو آج ہی آیا ہوں آپا! ویسے لاہور کل پہنچا تھا"۔

"ارے ان سے ملو"۔ آپا نے سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "یہی تو ہیں اپنے ندیم۔ ملک کے مشہور ادیب"۔

ناہید مسکرائی اور اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھا کر سلام کیا۔

"اری ٹھہرو بھی۔ پہلے تعارف تو مکمل کر لینے دو"۔

آپا خوب زور سے ہنسیں اور میری طرف دیکھ کے بولیں۔

"یہ ہیں ناہید۔ اپنی لوکل خبروں کی اناؤنسر!"

"اچھا!" مجھے اس اچانک ملاقات پر حیرت ہوئی۔ "آداب عرض"۔

ناہید نے مسکرا کر آہستہ سے آداب عرض کہا۔

رضوی بے چارے کے تعارف کرانے کا سارا پروگرام آپا جہاں آرا بیگم نے تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا اور اب وہ خواہ مخواہ ہنس ہنس کر پارٹی میں شریک رہنے کا احساس دلا رہا تھا ــــ اور باری باری سب کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔

"ارے چائے دو ان کو"۔ آپا نے گویا جیسے بیرے کو ڈانٹا۔ دراصل وہ بہت خوش مزاج عورت تھی۔ اٹھائیس تیس سال کی عمر ہو گی۔ شادی ہوئی تھی مگر اولاد سے محروم تھی۔ اس لئے موٹاپے کے باوجود زیادہ عمر کی نہیں لگتی تھی۔ ننھے منوں کی آپا تھی۔ اس لئے بڑے اور چھوٹے سبھی اس کو آپا کہتے تھے۔

ناہید اور آپا کاؤنٹر سے لگی چائے پی رہی تھیں۔ جب ہمارے لئے چائے آ گئی تو آپا کی تجویز پر سب ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ان مختصر لمحوں میں میں نے سرسری طور پر ناہید کا جائزہ لیا۔

کھلتا رنگ، بے حد سبک خدو خال کی لڑکی، واجبی حد تک بھرا بھرا جسم۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے موٹاپے اور دبلے پن کے درمیان موزوں اور خوبصورت جسم کی جو ایک خاص حد مقرر کی ہو گی۔ وہ اسی قسم کا شاہکار ہو گا۔

بلا شبہ اس کے جسم کے زاویے بے حد تیکھے اور نسائیت سے بھرپور تھے۔ میں نے سوچا۔ اگر ناہید کی گردن کاٹ کر اس کی جگہ ایک عام خدو خال کی لڑکی کا سر جوڑ دیا جائے تب بھی اس قیمتی جسم کی خطرناک حد تک دلفریبی کم نہ ہو گی۔

میرا یہ انداز فکر فطری ہونے کے باوجود بے ضرر نہیں تھا۔

جنسی طور پر ایک عورت کے حسن سے خطرناک حد تک متاثر ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ شمسہ اور ناہید کی اس لگن میں مجھے کوسوں فاصلہ محسوس ہوا۔

بظاہر میں آپا جہاں آرا بیگم سے مخاطب تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے

میں ہر بات ناہید سے کر رہا ہوں۔ ناہید ہی کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے لب و لہجے اور بات کرنے کے ڈھنگ پر بھی شبہہ ہوا۔ میری مسکراہٹ مصنوعی، گفتگو غیر فطری اور انداز میں روزمرہ پن نہیں رہا تھا۔

میرا یہ رویہ ایک عجیب سی مجرمانہ ذہنیت کا غماز تھا۔

آپا نے کراچی کے سفر کی وجہ پوچھی تو وہ بھی میں نے بالکل کاروباری بتائی۔

ناہید چپ چاپ چائے پیتی رہی، مسکراتی رہی اور ہماری باتیں سنتی رہی۔

رضوی بھی ہماری باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کا زندگی کے بارے میں رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسرے کے کھوج میں لگا رہتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ بات اہم نہیں تھی کہ ناہید کو کون کون آدمی چاہتا ہے۔ بلکہ یہ تو ہر آدمی کی جائز خواہش ہو سکتی تھی۔ بلکہ یہاں سوال ناہید کی پسند، ناہید کی چاہت کا تھا۔

ناہید جس دن جھکے گی، جس کی طرف جھکے گی۔ بس انکشاف کا دن تو وہی ہو گا۔

اگر پسندیدگی کے لئے حسن معیار نہیں ہے تو ہم سب ناہید کی بجائے کسی اور پر یا آپا جہاں آرا پر کیوں نہیں مرتے۔ لیکن اگر حسن ہی معیار ہے تو ناہید کے لئے اپنے سے کم تر کی طرف مائل ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بس وہ اسی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ جہاں تک ہو سکے ناہید سدا محروم رہے ــــ ایک طرح سے ناہید کی محرومیت میں اس کے کسی مجروح جذبے کی تسکین کا کوئی پہلو مخفی تھا ــــ یا یہ کہ ناہید کی فرضی محرومیت اس کی اپنی حقیقی محرومیت کی صدائے بازگشت ہو۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ شہرت کے باوجود ناہید کے چہرے پر کوئی غیر معمولی بشاشت نہیں ہے۔

اس بات سے اسے گونہ تسلی ہوئی۔

"ارے ہاں بھئی۔ تم بھی کچھ بولو"۔ آپا جہاں آرا نے ناہید کی طرف دیکھا۔

ناہید ہنس پڑی۔ اس کے خوبصورت دانت چمکنے لگے۔

"میں کیا بولوں۔ آپ کی باتیں اتنی دلچسپ ہیں کہ بولنے سے سننے میں زیادہ مزہ آتا ہے"۔

"لو بھئی مزے کی بات ہی کون سی ہوئی ہے۔ میں کم بخت ہی بولتی رہی ہوں۔ وہی بک بک جو میری عادت ہے۔ البتہ ندیم کو موقع دیتی تو یہ اپنے ڈراموں کی طرح بڑے خوبصورت ڈائیلاگ بولتے ہیں!"

سب ہنس پڑے۔ رضوی بولا۔

"تو گویا آپ ان پر الزام لگا رہی ہیں کہ یہ روزمرہ کے بجائے تصنع سے کام لیتے ہیں؟"

"واہ!" آپا نے مزاحمت کی۔ "اسے تم لوگ الزام کیوں کہتے ہو۔ جس شخص کو اللہ نے تحریر کے ساتھ تقریر کا جوہر بھی دیا ہو اسے تصنع کہنا کتنی بھونڈی بات ہے۔ ندیم بولتا ہے تو سننے والا لفظوں کے جال میں الجھ جاتا ہے۔ سچ پوچھو۔ میں تو انہیں بہت مانتی ہوں"۔

"مانتے تو ہم بھی ہیں مسزبٹ"۔ رضوی کو پوزیشن صاف کرنی پڑی۔ "ندیم سے پانچ منٹ تک بات کرنے والے کو ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہوتے دیکھا ہے۔ چونکہ بات سے بات نکلی تھی۔ اس لئے میں نے اسے تصنع کہہ دیا"۔

"تم ہمیشہ غلط بات کہہ کر اس کی صفائی پیش کرنے کے عادی ہو رضوی۔ اب تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ مجھے مسزبٹ نہ کہا کرو۔ بے شک میں مسزبٹ سہی لیکن جو اپنائیت اور مٹھاس آپا میں ہے۔ اس سے دگنی غیریت مسزبٹ میں ہے۔ کہو تمہیں دکھ پہنچانے میں کیا مزہ آتا ہے؟"

ناہید پہلی بار کھل کر ہنسی۔ رضوی نے جھٹ معافی مانگی۔

"سوری آپا سوری! دراصل آپ نے آج پہلی بار وضاحت سے آپا اور مسزبٹ کا فرق بتایا ہے چونکہ اس بارے میں آپ کا احساس بڑا نازک اور سبک ہے اس لئے آئندہ پوری احتیاط برتوں گا"۔

"ضرور رضوی صاحب ضرور"۔ ناہید پہلی بار اپنے طور سے گفتگو میں حصہ لے کر بولی۔ "چونکہ آپا کا جذبہ بڑا نیک اور بین الاقوامی قسم کا ہے۔ اس لئے اس جذبے کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہونا چاہیے"۔

"بات یہ ہے ناہید"۔ رضوی کے جواب سے پہلے ہی آپا بول پڑیں۔ "آپا کے سوا مجھے دنیا کا ہر تخاطب کچھ اجنبی سا لگتا ہے۔ اگر میرا بس چلتا اور سماجی اور اخلاقی قدریں آڑے نہ آتیں میں مسٹربٹ سے بھی کہتی کہ مجھے آپا کہا کرے"۔

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ میں نے کہا۔

"آپا۔۔۔ آپ نے تو لو میرج کی ہے۔ کبھی شادی سے پہلے بھی ایسا خیال آیا تھا آپ کو؟"

"ارے نہیں بھئی۔ میں تو اب بھی اسے چاہتی ہوں۔ وہی جذباتی وابستگی ہے۔ یہ تو محض آپا کہلوانے یا آپا کے لفظ سے شیفتگی کی ایک مثال ہے"۔

"بھئی میں تو مان گئی"۔ ناہید نے تائید کی۔ "اپنے جذبے اور احساس کی ترجمانی اس سے بہتر اور خوبصورت انداز میں نہیں کی جا سکتی"۔

بات تھی بھی سچ۔۔۔ آپا جہاں آرا بیگم کا جسم جتنا پھول گیا تھا۔ دل اتنا ہی ننھا اور معصوم تھا۔ اولاد سے محرومی کے ردعمل نے ہر ماں کے بچے کو اس کا اپنا بچہ بنا لیا تھا۔ وہ سچے دل سے ان سے پیار کرتی تھی اور اس سچائی کی بازگشت ماں کی ممتا کی پوری تقدیس کے ساتھ ریڈیو کی لہروں پر پھیل جاتی تھی۔

پروگرام میں شامل ہونے والے بچے مرغی کے بچوں کی طرح اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ کوئی ادھر سے کھینچتا' کوئی ادھر سے کھینچتا۔

"آپا میری کہانی سنو۔۔۔ میرا لطیفہ سنو۔۔۔ نہیں آپا میرا سنو۔۔۔ میں نے آج ہی لکھا ہے"۔

وہ کسی کو پیار کرتی۔ کسی کو تنبیہہ کرتی۔ کسی کے کان کھینچتی اور کسی کے ہلکا سا چپت جماتی۔ سب کھیل رہے ہیں' کود رہے ہیں' ہنس رہے ہیں' خوش ہو رہے

ہیں۔ آپا اپنی گرہ سے کسی کو لڈو کھلا رہی ہے۔ کسی کو بسکٹ اور کسی کو چاکلیٹ۔ بچے خوش ہیں تو آپا خوش ہے۔

اسی خوشی نے پھیل کر سارے ریڈیو سٹاف کو آغوش میں لے لیا تھا۔ سٹاف کا ہر آدمی آپا کے سامنے ننھا بچہ تھا۔

بعض نمائندہ روحیں شاید اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے مثال کے طور پر بھیجتا ہے۔ آپا جہاں آرا بیگم بھی ان میں سے ایک تھیں۔

تقریباً ایک ہفتہ یونہی گزر گیا۔

روز کی ملاقاتوں کے باوجود ناہید کے رویہ میں ذرہ بھر تغیر نہ آیا۔ وہی مخصوص متین سی مسکراہٹ جو دوسروں کے حصے میں تھی۔ میرے حصے میں بھی آئی۔ نہ نفرت نہ محبت، یہ میانہ روی، عام سا سلوک مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ شمسہ سے ذہنی اور روحانی لگاؤ کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ناہید میری غیر معمولی احتیاج بنتی جا رہی ہے۔

کئی بار میں نے اس خیال کو دبانا چاہا۔ مگر وہ جوں کا توں میرے سینے کے کسی گوشے میں موجود اور محفوظ رہا۔ ناہید نے وہ تڑپ تو نہیں چھینی تھی جو شمسہ کے لئے تھی۔ مگر ایک نئی خلش کو اس نے ضرور جنم دے دیا تھا۔ شمسہ کے لئے وفا کے ایک ناقابل شکست جذبے کی موجودگی کے باوجود ناہید کی کشش ایک اٹل حقیقت تھی۔

اس اثنا میں شمسہ کا خط آیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ محبت نامے کی بجائے بالکل رسمی خط ہے۔ میں بے طرح شمسہ پر برس پڑا۔

یہ تم نے کیسا بے ہودہ خط لکھا ہے۔ بالکل روکھا پھیکا۔ نہ اس میں تمہارا والہانہ پن ہے۔ نہ پیار نہ کیف اور نہ وہ جنونی کیفیت جو تمہارے مزاج کا خاصا ہے۔

حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ شمسہ کے خط میں وہی جذباتی پن، وہی رنگینی اور وہی رعنائی تھی جو اس سے پیشتر ہوا کرتی تھی۔ دراصل بات یہ تھی کہ ناہید کے رویے نے میرے جذبہ محبت کو اور زیادہ شدید کر دیا تھا۔ میرے چاہے جانے کی خواہش دگنی ہو گئی تھی۔ اور شاید میں اس کی کو شمسہ سے پوری کرنا چاہتا تھا۔

خوبصورت عورتیں تو میں نے اوز بھی بہت دیکھی تھیں۔ لیکن گھڑی دو گھڑی کے لمحاتی تاثر کے سوا اتنا گہرا اثر میں نے کبھی نہیں لیا تھا۔ اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ میں نے ناہید کی طرف بڑھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی ہو۔ بلکہ مجھے دکھ تھا تو یہی کہ میری کسی کوشش کو شرف باریابی کا موقع بھی نصیب نہ ہوا۔

وہ روز ملتی، ہم اکٹھے چائے پیتے۔ باتیں ہوتیں، بحث ہوتی، ادب پر، فلم پر، ہر دنیاوی موضوع پر---- کئی بار خود کو دل کی دھڑکنیں سنانے پر آمادہ کیا۔ کئی بار اظہار کرنا چاہا۔

مگر ناہید کی پراسرار متانت اور دلفریب شائستگی نے ہر بار میری ہمت کا گلا گھونٹ دیا۔

میں---- جو اپنے افسانوں میں جنس اور محبت کے موضوع پر حرف آخر سمجھا جاتا تھا---- میں---- جو جنسی نفسیات کے تقاضوں کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ عملی زندگی میں مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح بے بس ہو گیا تھا۔ کس طرح کہوں کہ میں تمہاری موہنی صورت کا دلدادہ ہوں۔ کیسے کہوں کہ میں تمہارے حسین جسم، کے تیکھے زاویوں کا بسمل ہوں---- کیوں کر کہوں کہ تم میری کمزوری ہو؟

اگر ناہید نے برا منایا تو! اگر وہ روٹھ گئی تو؟

شاید زندگی بھر اس سے آنکھ نہ ملا سکوں۔

میں سوچتا---- شمسہ کا پیار تو بہت طاقتور تھا۔ میں نے اسے پوری دیانتداری اور خلوص سے چاہا تھا۔ اب بھی اسے سچے دل سے پیار کرتا ہوں۔ سچے دل سے اسے رفیق زندگی بنانا چاہتا ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے بھی اس سے بے وفائی کا خیال دل میں نہیں لا سکتا۔ لیکن یہ ذہنی کشمکش، یہ ناہید کی کشش کیا چیز ہے۔ کیا شے ہے۔ کیا سراب ہے۔ جس نے مجھے دام فریب میں جکڑ کر میرا سکون چھین لیا ہے۔

شمسہ کا طاقتور پیار اس دام فریب کی گرہیں کیوں نہیں کھول پاتا---- وہ تسلیم شدہ وفاداری جو میرے اور شمسہ کے درمیان ہے، کیوں اس طلسمی حلقے کو توڑ نہیں

پاتی۔

نیک و بد کے امتیاز کے باوجود میں بدی کی طرف مائل کیوں ہوں۔ کیوں مجبور ہوں۔۔۔؟

بدی کے خیال سے میں چونکا۔ مگر دوسرے لمحے خیال آیا کہ میں اسے بدی کیوں کہوں۔ میری یہ کشش فطری ہے۔ شمسہ کی طرح یہاں بھی خلوص و مہر کی ایک جھلک موجود ہے۔ یہاں بھی جذبات و احساسات کی وہی لہریں وہی موجیں' ہیں جو شمسہ کے دامن کو چھوتی رہی ہیں۔

اس لمحے اخلاق اور زندگی کا کوئی سہارا میرے کام نہ آیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ زندگی کے چند نمائندہ اقدار کی روشنی میں شمسہ سے وفاداری پر حرف آئے گا۔ میں نے اس کشمکش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

اور آخر میں' میں نے یہ فرض کر لیا کہ جس کشش کو فطرت نے میرے استقلال سے زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ اس میں میری خواہش کے ساتھ قدرت کی منشا بھی شامل ہو گی۔

اس صورت حال میں' میں نے شمسہ اور ناہید دونوں سے اپنی وفاداری تسلیم کر لی تھی۔ اگرچہ اس کی شکل ابھی واضح نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف ایسی لڑکی کا پیار تھا جو مجھ سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ مجھ سے شادی پر رضامند نہیں بلکہ اسے عین سعادت سمجھتی تھی۔۔۔۔ اور دوسری طرف ایسی لڑکی کا مسئلہ تھا جو میرے لئے معمہ تھی جسے میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر جس کا پیار مجھے حاصل نہیں تھا۔

جو چیز اپنی ہو' جسے انسان اپنا کہہ سکے۔ نسبتاً" اس چیز کے مقابلہ میں کم قیمتی ہوتی ہے جو پرائی ہو اور جسے حاصل کرنے کی خواہش تڑپائے۔

اب اگر ناہید بھی کسی وقت مجھے شمسہ کی طرح چاہنے لگے تو یہ راز کھلے کہ میں کس کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ یا کسے کس پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایک طرح سے یہ بہت کڑا امتحان ہوتا۔ اور یہ امتحان اس لئے بھی دلچسپ ہوتا کہ میں دنیاوی یا معاشی امتیاز سے

متاثر ہو کر فیصلہ نہ کرتا۔ بلکہ یہ فیصلہ بالکل ذاتی احساسات پر مبنی ہوتا۔ اس میں جنسی تسکین کا عنصر تو شامل ہو سکتا تھا۔ مگر یہ بعید تھا کہ مالی منفعت میرے پیش نظر رہے۔

ہاں یہ بات قابل غور تھی کہ ایک کو اپنانے سے دوسری کی حق تلفی ہو جاتی۔۔۔۔ جہاں میں نے ناہید کو چاہنے کے لئے اپنی بے بسی کا جواز نکال لیا تھا' وہاں شمسہ کی بے بسی بھی اپنی جگہ قابل احترام تھی۔ میں اس کی جذباتی وابستگی کی قیمت سمجھتا تھا۔ اس لئے اگر میرا بس چلتا تو اپنے جسم کے دو ٹکڑے کر دیتا۔ ایک حصہ شمسہ کی عقیدت کا جواب بنتا اور دوسرے سے میں ناہید کو چاہتا!

یہ ذہنیت انتشاری سہی۔

مگر اس میں میری نیت اور خلوص کو ضرور دخل تھا۔

ظاہر تھا کہ شمسہ سے مجازی لگاؤ نے روحانی سمبندھ کی شکل اختیار کی تھی اور ناہید کی لگن محض اس کے صبیح و ملیح چہرے اور خارجی حسن تک محدود تھی۔ ایسے میں شمسہ کے پیار کا پلڑا یقیناً بھاری تھا۔ مگر جانے کیوں میں اس بات پر بضد تھا کہ ناہید ایک بار میری محبت کا دم بھرے۔

یہ بات بھی نہ تھی کہ ایک بار اسے جھکا کر کسی انتقامی جذبے کا شکار بناؤں۔ کیونکہ ناہید کے سلوک نے مجھے کبھی نادم نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی اس کے رویے سے میں نے کبھی تحقیر محسوس کی تھی۔

بلکہ وہ تو میری مداح تھی۔ میری عزت کرتی تھی۔ اس لئے میرا دل جذباتی لگاوٹ کے ساتھ ساتھ اس کے احترام کے جذبات سے بھی معمور تھا۔

ہاں یہ اور بات تھی کہ ناہید کی آنکھوں میں کوئی تحریص نہیں تھی اور اس کا برتاؤ ہر قسم کی ترغیب سے عاری تھا۔ حالانکہ اس کے انگ انگ میں ایک ایسی خاموش زبان تھی۔ جو سکوت کے پردے میں پکار پکار کر انسان کو دیوانہ بنا دیتی تھی۔۔۔۔ قدرت نے اس کے جسم کے تیکھے زاویوں کو زبان دے کر اس کی کم گوئی کو اس طرح متوازن کر دیا تھا۔

اب کے شمسہ کا خط آیا تو میں نے گلہ کیا نہ ڈانٹ پلائی۔ الٹا زار و قطار رونے لگا۔ جی ہلکا ہوا تو میں نے شمسہ کو ایک طویل خط لکھا۔ جس میں غم اور مایوسی کی عجیب سی چاشنی آگئی تھی۔ مثلاً ایک جگہ لکھا۔

"پیاری شمو! خدانخواستہ اگر ہم ایک دوسرے کو حاصل نہ کر سکے تو اس کی تلافی یوں ہو گی کہ میں پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں۔ تاکہ میری ہڈی ہڈی چور چور ہو جائے اور دوسرے روز جلی سرخیوں میں یہ خبر ملک کے سارے اخباروں میں شائع ہو---- تم بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دوسرے روز اسی چوٹی پر پہنچ کر چھلانگ لگا دو۔ اور یوں ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں اور اپنی محبت کو لازوال بنا دیں۔

شمو! تم نہیں جانتیں' ایسا سوچ کر مجھے کتنی تسکین ملی ہے۔ تم سوچو گی' پوچھو گی' کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خوشی کے لمحوں میں موت کی باتیں کرنے لگا ہوں۔ میرے پاس اس بات کا اس کے سوا اور کوئی جواب نہ ہو گا کہ میں ایسا لکھنے کے لئے مجبور تھا۔ مجھے ایسا لکھنے سے خوشی ہوئی ہے' بلکہ میرے سر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا ہے!"

یہ سب کچھ مجھ سے غیر ارادی طور پر ہوتا رہا۔

یقیناً یہ ناہید کی محبت سے محرومی کی صدائے بازگشت تھی۔ جو مختلف شکلوں میں ابھری۔ موت کی آرزو' اور محبت کو زندہ جاوید بنانے کا جذبہ نامرادی کا بدلا ہوا روپ تھا---- شاید میں ناہید سے ایک نہایت ہی بے ضرر اور غیر متعلق سا انتقام لینا چاہتا تھا---- شاید اس کے دل میں یہ حسرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کے بجائے کسی اور لڑکی کے لئے مرا۔

اور وہ جو شمسہ کا خط پڑھ کر میں زار زار رو پڑا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے مجھے بے حد پیار سے مخاطب کیا تھا۔ شمسہ اس سے پہلے بھی مجھے اسی طرح مخاطب کرتی تھی۔ مگر وہ جو ناہید کی وجہ سے میرے ذہن میں ایک مظلومانہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شمسہ کی باتوں نے اسے مرہم جیسی ٹھنڈک پہنچائی تھی۔ ظاہر ہے۔

مظلومیت کے احساس کے بعد ذرا سی ہمدردی سے بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ ان لمحوں میں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ شمسہ کے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی میرا سچا مونس و غمگسار نہیں ہے۔

اگلے روز آپا جہاں آرا بیگم مجھے ملیں تو مجھے ایسا لگا کہ بے اختیار رو پڑوں اور اس کی گود میں سر رکھ دوں۔ آپا میرے سر پر ہاتھ پھیرے۔ میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرے۔ میرے آنسو پونچھے اور میرے کانوں کی لویں انگلیوں میں دھیرے دھیرے مسلے۔

بالکل ماں کی ممتا کی طرح مسرت حاصل کرنے کے لئے میرا دل مچل رہا تھا۔ یہ باتیں سوچتے سوچتے میری آنکھیں ایک انجانی خوشی سے روشن ہو گئیں۔ میرے نتھنے پھول گئے۔ اپنی آواز کی لرزش چھپا کر میں آپا سے بولا۔

"آپا جی---- آج تو آپ کو پیار کرنے کو جی چاہ رہا ہے!"

"ارے مجھے!" آپا زور سے ہنس پڑیں۔ "مجھ بھینس کو پیار کرو گے---- اچھی سوجھی ہے۔ کسی افسانے کے لئے پلاٹ تلاش کر رہے ہو نا۔ پر ان تلوں میں تیل نہیں۔ مجھے تم دھوکا نہیں دے سکو گے چھوکرے"۔

"واہ آپا! آپ تو اسے مذاق میں ٹال رہی ہیں۔ اگر یہی بات میں ذرا جذباتی لہجے میں کہتا تو؟"

"تو میں بچی ہوں کیا۔ تیری شرارت نہ سمجھتی"۔

"نہیں آپا!" میں ایک دم جذباتی ہو گیا۔ "خدا کی قسم آپ کچھ بھی نہیں

سمجھتیں"۔

آپا چونک پڑیں۔

"ارے ۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ندیم؟"

"آپا چند لمحوں کے لئے آپ میری ماں بن جائیں۔ میں آپ کی گود میں سر رکھ کر بے اختیار رونا چاہتا ہوں"۔

آپا حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"کیا بات ہے ندیم! اتنے انوکھے تم کبھی نظر نہیں آئے؟"

"ہاں آپا! انسان واقعی عجیب ہے۔ کبھی کبھی اپنی مظلومیت میں اسے کیف ملتا ہے۔ رونے دھونے میں لطف ملتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے۔ چاروں افق اپنی بے بسی کا ڈھنڈورا پیٹے"۔

"آج شاید پھر ڈائیلاگ بولنے کا موڈ ہے"۔ آپا نے مذاق کا پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں آپا۔ دل جو چاہے پورا ہوتا رہے۔ تو شاید زندگی' زندگی نہ رہے۔ ایک جوان آدمی کسی بڑھیا کو محبوبہ سمجھ بیٹھے۔ یہ اتنا ہی بعید ہے جیسے کوئی جوان آدمی کسی جوان عورت کو ماں سمجھ بیٹھے"۔

"نہ یہ بعید ہے اور نہ وہ بعید ہے۔ کبھی کبھی انہونی بھی ہونی ہو جاتی ہے"۔

"ٹھیک ہے آپا۔ لگن سچی ہو تو سمندر بھی راستہ دے دیتے ہیں' لیکن اگر انسان' انسان کو اپنانے کا دعویٰ کرے گا تو شاید دھوکہ کھائے گا ؟"

"ارے واہ! آج تو تم اپنے نظریات کی تردید کرنے پر اتر آئے ہو۔ جن باتوں کا اپنے ادب میں پرچار کرتے ہو انہیں کو برا کہتے ہو"۔

ادب کی تخلیق کے لئے بڑے فہم و شعور کی ضرورت ہے آپا۔ میں بے چارہ کیا ادب کو سمجھوں گا۔ کل میں نے ایک بند کمرے میں ایک معصوم لڑکی سے کہا تھا کہ میں ساری دنیا میں تمہیں کو سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ اگر کل

مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکی تمہیں پیار کرنے لگے تب کیا ہو گا---- میں نے کہا جب بھی تمہیں پیار کروں گا---- بے شک' ہر پھول کا رنگ جدا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی خوشبو الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک میں پسند آ جانے کی کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے' مگر اس پھیلی ہوئی پسند کے باوجود پسند کی ایک انتہا بھی ہوتی ہے۔ کسی کو گلاب پسند ہوتا ہے' کسی کو نرگس اور کسی کو موتیا---- اور پسند کی یہی انتہا دنیا کے پھیلے ہوئے حسن میں سکون و تسکین کی ضامن ہوتی ہے"۔

آپا' لڑکی اور محبت کا ذکر سن کر چونکی---- مگر پھر میری بات پر توجہ دیتے ہوئے بولیں۔ "میرے خیال میں تم نے بڑا صحیح جواب دیا تھا"۔

"ہاں آپا! جواب صحیح ہو گا۔ بلکہ اس کی تائید میں میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بوسہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹنے والی چیز نہیں ہوتی۔ ورنہ معاشرے میں انتشار پیدا ہو جائے گا"۔

آپا نے تائید کی۔ "یہ بھی تم نے بالکل درست بات کہی تھی"۔

"یہی تو رونا ہے آپا کہ جن باتوں کو میں نے درست سمجھ کر کہا تھا۔ جن نظریات کو میں نے ہوا دی تھی اور جس بنیاد پر میں نے ادب تخلیق کیا تھا۔ وہ آفاقی نہیں تھا۔ اس نے حقیقت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ انسانی فطرت اور نفسیات سے ناآشنا تھا۔ وہ محض کتابی علم تھا۔ جو داد حاصل کرنے کے لئے تخلیق ہوا تھا۔ اور جسے آج میں جھوٹا ادب کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں"۔

"لو سنو---- جو ادب پورے ملک میں مقبول ہے' جس سے لاکھوں لوگ متاثر ہیں۔ وہ ایک تمہارے کہنے سے جھوٹا ہو جائے گا"۔

"ہاں آپا! وہ جھوٹا اس لئے ہے کہ اس کا تخلیق کنندہ ثابت قدم نہیں رہ سکا ہے۔ وہ جھوٹا اس لئے ہے کہ جن جذبوں کی اس میں ستائش کی گئی تھی۔ اس سے زیادہ موثر اور شدید جذبے اس کی تدفین کا سامان کر رہے ہیں۔ آپا جی جس ادب کا خالق ہی عملی زندگی میں اس ادب کی روح سے ہٹ گیا ہو---- بھلا اس کے

قارئین اس پر کیا عمل کر سکیں گے"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ سچی بات برے منہ سے بھی نکلے تو اس کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ مگر یہ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے۔ آؤ وہاں گھاس پر بیٹھیں"۔

نرم نرم گھاس پر بیٹھتے ہوئے آپا نے غور سے مجھے دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"یہ لڑکیوں وڑکیوں کا قصہ تم کیا لے بیٹھے۔ کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوتا ہے"۔

میں ہنس پڑا۔ اس ہنسی میں ہلکی سی خفت بھی شامل تھی۔ آپا بولیں۔

"یہ تو میں جان گئی ہوں کہ تمہیں کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ بھی تمہیں پیار کرتی ہے۔ مگر اب تمہیں کوئی اور لڑکی پسند آ گئی ہے۔ ہے نہ یہی بات؟"

"کسی حد تک"۔ میں ہنس پڑا۔

اچانک آپا کی نظریں اسٹوڈیو کے دروازے سے نکلتی ہوئی ناہید پر جا پڑیں۔ آپا چلائی۔

"اری ادھر آؤ ناہید۔ کچھ نئی خبریں سنو"۔

میں نے جھٹ آپا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں آپا اس سے کچھ نہ کہنا۔ خدا کے لئے!"

"اتنے میں ناہید مسکراتے ہوئے ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سبز رنگ کی مہین ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کہنی سے اوپر تک ننگے مرمر جیسے بازو اور بازو سے چمٹی ہوئی گول آستین۔ خوبصورت بھرے بھرے شانے' ننگی کمر کی مرمریں گولائی سے نور کے ہالے کی طرح کرنیں نکل رہی تھیں اور اس کے جسم سے نکہتیں پھوٹ رہی تھیں۔

میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ آپا بولیں۔

"سنا ہے تم نے۔ یہ مرد کتنے ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوں زندگی میں ایک دو بار محبت ضرور کریں گے"۔

ناہید نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں جھینپ سا گیا۔

"آپ تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں آپا"۔

"اری ناہید۔ اب تو یہ سیدھے منہ بات کر رہے ہیں۔ پانچ منٹ پہلے ان کی حالت دیکھتیں تو ان پر ترس آ جاتا۔ ان کا یہ دوسرا روپ میں نے آج دیکھا ہے"۔

مضمون دلچسپ تھا۔ ناہید کو بھی اچھا لگا۔ میری خفت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"بات کیا ہے ندیم صاحب؟"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"اب میں کیا بتاؤں۔ آپا تو خواہ مخواہ زبردستی کر رہی ہیں"۔

"لو---- اب زبردستی کا الزام بھی مجھ پر۔ خیر جانے دو۔ میں نے جو چند منٹ پہلے ان کی حالت دیکھی تھی۔ وہ ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں۔ ایک دو دن میں سبھی سن لیں گے"۔

آپا کے لہجے میں ہلکی سی سنجیدگی محسوس کر کے میں ہنس پڑا۔

"لو---- آپا تو روٹھ گئیں۔ حالانکہ بات روٹھنے کی نہیں۔ ان کی زیادتی کی ہے۔ اب خواہ مخواہ آپ کے سامنے میرا کچا چٹھا کھول رہی ہیں"۔

"واہ!" ناہید جیسے شکایتاً بولی۔ "تو گویا میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ جو بات آپا کے سامنے کہنا معیوب نہیں ہے۔ وہ میرے سامنے عیب سمجھی جائے"۔

آپا خوش ہو گئیں۔ "ہاں اب بولو"۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری آواز حلق میں پھنستے پھنستے رہ گئی۔

"نہیں ناہید۔ یہ بات تو نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ۔ آپ کو برا نہ لگے۔ آپ برا نہ مان جائیں--- آپ کا مزاج---- میرا مطلب ہے۔ آپ ساڑھی کی طرح مہین ہو۔ پھر تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر معاملہ برعکس نکلا تو مجھے بڑا دکھ ہو گا کہ میں نے آپ کو پریشان کیا"۔

"یہ تو خوب رہی۔ آپ نے میری ساڑھی کو مجھ سے زیادہ عزت دے دی ہے۔ سن لیا نا آپا؟"

"ہاں بھئی۔ سب سن رہی ہوں۔ یہ بات سے بات نکالنے میں بہت ماہر ہیں۔ وار کرنا ہو تو خنجر ریشم میں لپیٹ کر پھینکتے ہیں"۔

میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔

"بھئی آپا جو کہیں سو کہیں۔ پر میں آپ سے معافی چاہتا ہوں ناہید۔ ظاہر دیکھ کر باطن کی خوبصورتی نہ دیکھ سکا۔ واقعی یہ میری غلطی تھی۔ آپا مجھے ماہر کہہ رہی ہیں اور میں اتنا اناڑی ہوں کہ ساڑھی اور دل کی خوبصورتی میں کوئی تمیز نہ کر سکا"۔

"لو--- بے چارے کو دے دو معافی!" آپا نے پھر چوٹ کی۔ "ذرا سی ڈھیل ملی تو پلک جھپکتے میں ساڑھی سے لے کر دل کے حسن تک کو ٹٹول ڈالا"۔

وار بڑا کاری تھا۔ دونوں طرف ایک ساتھ پڑا۔ ناہید کو احساس ہوا کہ ساڑھی کو عزت دینے والی بات وہ شاید غلط کر گئی تھی۔ مگر میں اب بات کرنے کے موڈ میں تھا۔

"لیجئے مس ناہید! آپا نے آج سے مسٹر رضوی کی ڈیوٹی سنبھال لی ہے"۔

"کیا کہا! مسٹر رضوی کی ڈیوٹی"۔ آپا چلائی۔

"کوئی اتنی بری بھی نہیں آپا"۔ میرا لہجہ بڑا تیکھا تھا۔ "بے چارہ احساس کمتری کا مریض ہے۔ کسی نوجوان لڑکے اور لڑکی کو باتیں کرتے دیکھتا ہے تو جل بھن کر کباب ہو جاتا ہے"۔

ناہید سٹپٹا گئی۔ گفتگو کا دائرہ جیسے اس کے گرد محیط ہو گیا تھا۔ آپا برا ماننے کی بجائے ہنس پڑیں۔

"جا میں تیری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ اور ناہید کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے جو تیری باتوں سے مرعوب ہو کر کوئی ہوا دل میں بٹھا لے گی"۔

آپا نے گفتگو کو ہلکا رنگ دے کر واقعی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ ناہید بھی ہنس

پڑی اور اسے پیچھا چھڑانے کا موقع مل گیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں آپا"۔

"یہی تو کہہ رہی ہوں۔ بے چارے کو خواہ مخواہ غلط فہمی ہو گئی ہے"۔

اتنے میں ناہید کو آواز پڑی۔ خبروں کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ معذرت کر کے چلی گئی۔ اس کے بعد میں اور آپا ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

* * *

تین چار دن کی چھٹی کے بعد واپس آیا۔ تو مجھے چاروں طرف سے مسکراتی طنزیہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ریڈیو اسٹیشن کے ہر گوشے میں میرا نیا ڈرامہ قلوپطرہ ہی زیر بحث تھا۔

قلوپطرہ--- انطونی کی قلوپطرہ نہیں۔ شہزادہ سلیم کی انارکلی بھی نہیں۔ یہ کوئی تاریخی ہستی نہیں تھی۔ بلکہ اسی دور کا ایک چلتا پھرتا کردار۔ جسے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ جسے ہر کوئی حاصل کرنے کی تمنا بھی کر سکتا تھا۔ جو شجر ممنوعہ نہیں تھی مگر جو شجر ممنوعہ سے زیادہ ناقابل رسا تھی۔

جو سب کی تھی۔ ہر کسی کی نہیں تھی۔ جسے سب نے پایا۔ مگر جسے اپنا کوئی نہ کہہ سکا۔ سب احباب مان گئے تھے کہ بیسویں صدی کی قلوپطرہ کون ہے؟ میں خود حیران تھا کہ یہ میں نے کیا لکھ دیا ہے۔

بے خبری مین قلبی ردعمل کی ایک انوکھی مثال تھی۔

ناہید سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خطاب کرنے کا بڑا موثر لیکن اوچھا انداز تھا۔

ڈرامے میں ایک نامراد عاشق ایسی حسینہ سے مخاطب ہوتا ہے جسے فطرت نے جسمانی کشش اور شباب کی دل آویزیوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اسے شکوہ ہے کہ یہ جوانی

تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ پھر اس پر گھمنڈ کیسا--- سنا تو ہو گا۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔ اگر کوئی دو گھڑی اس چھاؤں میں بیٹھنا چاہے تو تیرا کیا بگڑے گا۔ کوئی پیاسا ہے تو اس کی پیاس بجھا دے۔ کیا پتہ تیرے شباب کا چشمہ اچانک سوکھ جائے--- کوئی بھوکا ہے تو اس کے کشکول میں بھیک ڈال دے۔ کیا پتہ تیرے گنج شباب کو کوئی رہزن لوٹ کر تجھے بالکل بے مایہ کر دے۔ اے شباب اور حسن کی دیوی! وقت بہت بڑا ڈاکو ہے۔ وقت کی پکار پر جو لوگ کان نہیں دھرتے۔ حیات انہیں دھوکہ دینے میں کبھی پیچھے نہیں رہتی۔

اے بیسویں صدی کی قلوپطرہ--- غرور کی آنکھ اندھی ہوتی ہے۔ ساون کے اندھے کو کون سمجھائے کہ دھرتی سدا ہری نہیں رہتی۔ برگ گل سدا ڈالی سے ہم آغوش نہیں رہتا--- وقت آتا ہے کہ ہوائیں بوئے گل سے خالی ہو جاتی ہیں۔ ٹھنڈے جھونکے لو کے تھپیڑے بن جاتے ہیں۔

جوانی قوس قزح کی طرح حسین ہوتی ہے۔ مگر قوس و قزح کی طرح کم زیست بھی ہوتی ہے۔

اے قلوپطرہ! زندگی بہت مختصر ہے۔ اسے حقیر نہ جانو۔
اس کے لمحے لمحے میں ڈوب جاؤ۔
گھڑی گھڑی میں کھو جاؤ۔
اس کے پل پل سے امرت چوس لو۔

جوانی ارمانوں سے عبارت ہے۔ ارمان زندگی کی صدائے بازگشت ہیں۔ اور جو زندگی اس صدائے بازگشت سے خالی ہو۔ وہ جیون کے اس سناٹے کا نام ہے' جس کا دوسرا نام موت ہے۔

لیکن یہ ڈرامہ جتنا دلچسپ تھا۔ اتنا ہی موضوع کے اعتبار سے ریڈیو کے لئے ناموزوں تھا۔ اس میں جنسی احتیاج و فریب کا پہلو اتنا نمایاں تھا کہ وہ ریڈیو پر نشر نہ ہو سکا۔ مگر پلاٹ کی جدت اور جنسی جذبات کی نامرادی اور کامرانی کا اس میں جس طرح

تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس دلچسپی نے یاران محفل کے لئے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیا تھا۔ اور اب اندرون محفل قلوپطرہ اور اس کے مصنف کو خوب خوب داد مل رہی تھی۔

رضوی کی مہربانی سے ناہید نے بھی ڈرامہ پڑھ لیا تھا۔

مگر آپا جہاں آرا کی طرح مسکرانے کی بجائے اس نے چپ سادھ لی تھی اور اس غیر متوقع چپ نے اسے بے حد سنجیدہ بنا دیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے اس ڈرامے کی تخلیق کی ذمہ داری اپنے اوپر ڈال دی تھی۔ نہ وہ ہر کہ و مہ سے خوش خلقی سے ملتی، نہ مسکراتی، ہنستی اور نہ قلوپطرہ بنتی۔

لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے ایک عجیب سا غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا۔ مجھ پر ڈھٹائی کا عنصر کچھ زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ یاروں کے طنز کا میں بہت تیکھا جواب دیتا۔ اور جہاں جواب نہ بن پڑتا۔ وہاں میرا رویہ بے حد تضحیک آمیز ہوتا۔ ناہید پر کہیں نظر پڑتی تو میں اس طرح آنکھیں پھیر لیتا جیسے شناسائی ہی نہ ہو۔ یا جان بوجھ کر نظرانداز کر کے اس کی سبکی مقصود ہو۔

ہو سکتا ہے یہ فرار کی کوئی شکل ہو۔ مگر بظاہر میں یہ احساس پیدا کرتا کہ مجھے تمہاری کبھی پروا نہیں رہی۔ دراصل یہ اپنے آپ کو بری الذمہ اور بے خطا ثابت کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش تھی۔

انسان جب خود کو اپنی نظروں میں حقیر محسوس کرتا ہے تو وہ ایسی ہی مصنوعی بے نیازی کی آڑ میں بڑے غلط طریقوں سے سے اپنے وقار کا دامن بچاتا ہے۔ مگر ایسی کوشش ہمیشہ ناکام ہوتی ہے اور س کی تذلیل میں بجائے کمی کے اضافہ ہی کرتی ہے۔

میں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ سرے سے میرا اقدام ہی غلط تھا۔ ڈرامے کی بنیاد پر اس تک رسائی کا خیال ہی بے ہودہ اور احمقانہ تھا۔ کوئی کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو۔ اتنی بے شرمی سے دعوت لب و بوسہ قبول نہیں کر سکتا۔ اور پھر ناہید

جیسی لڑکی جس کی ہر ادا اور ہر حرکت میں ایک تمکنت تھی۔ اور جو بظاہر بھی ایک تہذیبی اور اخلاقی مقام رکھتی تھی۔

اس داخلی سرزنش نے چند دن ہی میں میری ساری شیخی ختم کر دی۔ اور میں ان جذباتی لمحوں پر لعنت بھیجنے لگا جنہوں نے مجھے ڈرامے کے لئے اکسایا تھا۔

اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بعد میں مبالغے کی حد تک اس سے مغلوب ہوتا چلا گیا۔ چپکے سے آتا۔ چپکے سے چلا جاتا۔ کوشش یہی کرتا کہ سٹاف کے بہت کم لوگوں سے ملاقات ہو۔ اور جن سے ملاقات ناگزیر ہو۔ ان سے بھی محض رسمی اور محکمانہ فرائض سے بات آگے نہ بڑھے۔

آپا جہاں آرا بیگم جیسی عورت سے بھی میں پہلو تہی کرتا۔ ناہید کو دیکھ کر وہ بے نیازی برتنے والا انداز اب ندامت کے روپ میں بدل گیا تھا۔ اور اب دل ہی دل میں اس کی عزت کرنے لگا تھا۔ لوگوں کی نظریں بچا کر بڑی حسرت سے اسے دیکھتا مگر یہ خیال رکھتا کہ کہیں ناہید میری چوری نہ پکڑ لے۔

اس واقعہ کے بعد ناہید نے متانت کا جو خول چڑھا لیا تھا۔ اس کے لئے بھی خود کو مجرم سمجھتا۔ نہ میں اوچھے پن کا اظہار کرتا۔ نہ وہ اتنی ریزرو ہوتی۔ گویا خوشبو کا سا وہ رشتہ جو ناہید اور دوسرے لوگوں کے درمیان تھا۔ اس کا قاتل بھی میں ہی تھا۔

رضوی نے ہم دونوں کا کھچاؤ برابر محسوس کیا۔ لیکن اسے خوشی کی بجائے مایوسی ہوئی۔ ناہید کی دل آویز مسکراہٹیں محدود ہو گئیں۔ تو اسے ایک شدید خلا کا احساس ہوا۔ جیسے زندگی گونگی ہو گئی ہو۔

باغ کسی کا ہی ہو لیکن جب بہار آتی ہے تو اس کی رنگینیاں، نظر فریبیاں اور نکہتیں ہر راہی محسوس کرتا ہے۔

اس نے سوچا۔ وہ روز سینکڑوں چہرے دیکھتا ہے۔ ان میں سانولے بھی ہوتے ہیں، گندمی اور گورے بھی، کوئی معصوم، کوئی الھڑ اور کوئی شریر۔ کسی میں ممتا، کسی میں محبوبیت اور کسی کے لئے محض جذباتی لگن۔ حسن کے کئی رنگ ہیں اور اسے چاہنے

کے جذبے الگ---

ایک بے حد حسین لڑکی باپ کے سینے لگے تو اس چاہت کا جذبہ الگ--- بھائی کی محبت کا رنگ کچھ اور۔ دو چاہنے والوں کے لمس کی خوشی سب سے مختلف۔ لیکن جب ایک اجنبی اسے دیکھتا ہے تو اس کے دل میں بھی اس کے رنگ روپ سے ایک احساس جنم لیتا ہے۔ یہ احساس' باپ بھائی اور محبوب کے لمس سے مختلف ہوتا ہے--- کبھی یہ شہد کی طرح گاڑھا اور میٹھا اور کبھی خوشبو کی طرح لطیف ہوتا ہے۔

رضوی بھی اس اجنبی کی طرح تھا' جو اپنے حصے کی خوشی کسی نہ کسی رنگ میں وصول کر لیتا تھا۔ مگر اب یہ مسرت بھی دھندلی اور پھیکی پڑ گئی تھی۔ میری وجہ سے اسے ناہید کی رسمی رفاقت تو حاصل تھی اب وہ بھی گئی۔

مجھ سے رقابت کا جذبہ ان مایوسی سے کم درجے کی چیز ثابت ہوئی۔ بس اب اس کے دل میں اس کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا کہ اپنی نارسائی کا ماتم کرے۔

آپا جہاں آرا بیگم نے ناہید سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر مجھ پر مسلسل چوٹیں کرتی رہیں۔ مگر آپا کی چوٹوں سے میں خائف نہیں تھا۔ بس ہاتھ جوڑ کر مسکرا دیتا۔ آپا کہتیں۔

"ندامت کا اقرار تو تم نے اپنے آپ کر لیا ہے۔ اب چاہو تو صلح کرا دوں؟"

"نہیں آپا۔ صلح کی ہمت نہیں"۔ میں مسکرا کر کہتا۔ "مجھ سے بھلا کرنا ہے تو بس اس حرکت کا احساس نہ دلاؤ"۔

"ارے واہ۔ ایسا تم نے کیا جرم کیا ہے کہ بس بالکل نکو بن گئے ہو"۔ آپا اچانک میرا ساتھ دینے لگ جاتیں۔ "آخر فرشتہ تھوڑی ہے۔ اتنی سی لغزش کی اتنی بڑی سزا۔ بس ہو گئی بات۔ حوا کی بیٹی ہے۔ یہی کچھ سنے گی۔ ورنہ پھر کیا سنے گی"۔

"نہیں آپا۔ مجھ سے واقعی زیادتی ہوئی ہے"۔

"جاؤ رے! اب زیادہ برخوداری کا اظہار نہ کرو۔ کل چائے پر ملا دوں گی دونوں

کو---"

"ارے نہیں آپا۔ یہ غضب نہ ڈھانا۔ وہ سمجھے گی میں نے آپ کو مجبور کیا ہے"۔

"لو--- مجھے کون مجبور کر سکتا ہے"۔

"پھر بھی فی الحال یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا احساس مجھ پر چھایا ہوا ہے۔ مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکے گی۔ نہ معافی کی نہ صفائی کی۔ الٹا اور ذلیل ہو جاؤں گا"۔

"خیر تمہاری مرضی۔ تم نے خواہ مخواہ خود کو بہت زیادہ مجرم سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ تمہاری بزدلی ہے اور میں اس کی وجہ یہی سمجھتی ہوں۔ تم ناہید سے بہت مرعوب ہو۔ تم اسے بہت پسند کرتے ہو۔ اور یہ فرار پسندیدگی کی بدلی ہوئی شکل ہے"۔

"یہ بات ٹھیک ہے آپا۔ وہ میرے حواس پر چھا گئی ہے اس سے مجھے خوشی اور خوف دونوں ملے ہیں۔ لیکن میرے پاس ایسی کوئی شکتی نہیں کہ اس خوشی کو حاصل کر سکوں یا اس خوف کو دور کر پاؤں"۔

میں نے پہلی بار آپا کے سامنے کھلم کھلا اقرار کر لیا۔ آپا ہنس پڑیں۔

"ایسا سوچو گے تو مارے جاؤ گے۔ عورت کو یہ احساس کرا دو گے کہ تم اس پر مرتے ہو تو ساری زندگی سائے کی طرح اس کا پیچھا کرو گے۔ ہاتھ نہ آئے گی۔ مگر وحشیانہ طریقے سے مغلوب کر لو گے تو سائے کی طرح ساری زندگی تمہارے پیچھے پیچھے بھاگے گی۔ عورت وہ ذات ہے ندیم جو کھجور کے درخت کی طرح چھانٹنے سے اور زیادہ بڑھتی ہے"۔

"ٹھیک ہے آپا۔ مگر ابھی چھانٹی کا وقت نہیں آیا۔ آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہوا کا رخ دیکھنے دیں۔ جلد بازی کے برے نتیجے سے نادم رہنا زیادہ بہتر ہوگا"۔

"ٹھیک بھئی ٹھیک ہے۔ ہمیں تو تمہاری رونی صورت پر ترس آ جاتا ہے۔ ہاں ایک بات بتا دوں۔ وہ تجھے برا نہیں سمجھتی!"

آپا چلی گئیں۔ مجھے دوبارہ امتحان میں ڈال کر۔

"وہ تجھے برا نہیں سمجھتی۔ وہ تجھے برا نہیں سمجھتی۔ وہ تجھے برا نہیں سمجھتی!"

اس کے کیا معنی ہیں؟

اگر اس کے معنی وہی ہیں۔ جو واقعی اس کے معنی ہیں تو کولہو کے بیل کی طرح میرا سفر کیوں جاری ہے۔ کیوں؟ کیوں؟

میں اپنی آنکھوں سے گہرا سیاہ چشمہ کیوں نہیں اتارتا۔ میں کہاں ہوں؟ ادھر شمسہ کو وہ پہلی سی تڑپ نہ ملی۔ تو وہ چیخ اٹھی۔

"ندیم---! تم کہاں ہو؟ ہر ہفتے تمہارا خط ملتا ہے۔ مگر تم اس میں نہیں ہوتے۔ انداز تحریر وہی ہوتا ہے مگر لکھنے والے کی روح اس میں نہیں ہوتی۔ کہاں کھو گئے تم---

کہاں چلے گئے تم---؟ ڈھونڈوں یا نہ ڈھونڈوں۔ اتنا تو بتا دو۔ یہ تو بتادو۔ سرقہ تو نہیں ہو گئے؟

کچھ تو بتاؤ۔ تمہاری انگلیاں تھکی تھکی کیوں ہیں---؟

تمہاری آتما اداس کیوں ہو گئی ہے؟ ابھی تو برف کی چوٹیاں بہت آگے ہیں۔ ابھی تو وہ سرخ اور نیلے پھولوں والا پہاڑی کا رنگین دامن بھی ہم سے بہت دور ہے۔ ابھی تو وہ پارے کی طرح مچلتی ہوئی ندی کا شفاف پانی بھی نہیں پی سکے ہم۔ ذرا مڑ کر تو دیکھو۔ ابھی تو ہمارے سفر کا دوسرا سنگ میل بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اور تمہارے قدم راستے کی گرد سے بوجھل ہو گئے۔

ندیم--- تم سو گئے کیا؟ ذرا آنکھیں تو مل کر دیکھو۔ رنگین آنچل تمہارا شانہ تھپتھپا رہا ہے۔ تم اس کے لمس سے چونکنا بھول گئے کیا؟

تمہیں اس کی خوشبو محسوس کیوں نہیں ہوتی---؟ تم وہ

پتھر تو کبھی نہیں تھے، جن سے ٹھنڈے ہوا کے سندیسے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔

ذرا بتاؤ ندیم--- یہ مجھے خط کون لکھتا ہے۔ یہ پھیکے پھیکے پتر کون بھیجتا ہے۔ یہ ایسے لفظوں کا چناؤ کون کرتا ہے جن کے سینے میں دل نہیں ہوتا--- میں نے تمہارے خط دیکھے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ایک ایک دل دھڑکتا ہے۔ وہ لفظ کون چرا کر لے گیا۔ ان ان گنت دھڑکتے دلوں کی دھڑکن کون چھین کر لے گیا۔ کہاں ہے وہ قاتل؟

جس نے الفاظ کی روحوں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیئے ہیں!

کہاں ہے وہ ظالم۔ جس نے الفاظ کے معنی پر پہرے بٹھا دیے ہیں؟ کہہ دو ندیم۔ یہ خط تم نہیں لکھتے۔ کہہ دو۔ یہ پتر تم نہیں بھیجتے۔ ندیم تم ایسا کر بھی نہیں سکتے--- ندیم اگر تم یہ سب کچھ کر بھی لو گے۔ پھر بھی خوشبو کو پھول سے الگ کرنے کا ذمہ کبھی نہیں اٹھا سکتے۔

یہ تمہاری فطرت نہیں۔ یہ کام ہی تمہارا کب ہے---

ہر کام کے لئے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔ جرم کرنے کے لئے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے اور نیکی کے لئے بڑی استقامت کی۔

تم نیکی کی استقامت رکھتے ہو۔ مگر جرم کرنے والا دل گردہ تمہارے سینے میں نہیں ہے۔ میں نے وہ دل دیکھا ہے۔ میں نے اس سینے میں جھانکا ہے۔ میری آنکھیں اس منزہ و مصفی ذہن کی چمک سے اب تک خیرہ ہیں۔ ندیم مجھے وہ ابریشمی

پلکوں والی روشن آنکھیں یاد ہیں۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ میں بھول کیسے سکتی ہوں۔ میں تمہاری یادوں کے خزانے کی امین بنی تھی۔ میں خائن بن بھی جاؤں تو بھی اپنے جسم کا گوشت کیونکر کاٹ سکتی ہوں۔

یہ یادیں میرے خون میں رچ بس چکی ہیں---- تم میرے وجود میں دوڑ رہے ہو۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئے گی کہ زہر کے انجکشن لگا کر ان یادوں کو گہری نیند سلا دوں---- ایسا کروں گی تو گہری نیند سو جاؤں گی۔ نہیں! نہیں ندیم! میں ابھی سونا نہیں چاہتی۔ مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ موت کا خیال ہی بہت بھیانک ہے۔ مجھے تاریک قبر سے بہت خوف آتا ہے۔ اتنی گھور تاریکی میں تو میرا سانس گھٹ کر رہ جائے گا۔ نہیں ندیم! مجھ سے موت کی باتیں نہ کرو---- کلی چٹخنے سے پہلے نوچ لی گئی۔ تو دنیا اس کی نکہتوں سے محروم رہ جائے گی۔

مجھے تو تمہارے سنگ بہاروں کی تلاش میں نکلنا ہے۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ نہ ہمالیہ کی شفاف برف' نہ گل پوش وادیوں کی سحر انگیزیاں اور نہ چناروں کے گھنے سائے---- تم نے کہا تھا۔ پون کی چاندنی میں نہائیں گے۔ زعفران کے کھیتوں میں گھومیں گے۔ اور صبح تڑکے پھولوں کے کٹوروں پر شبنم کے قطروں سے پیاس بجھائیں گے۔

ندیم---- تم نے کہا تھا۔ ہمارے جھونپڑے میں ایک بکری ہو گی جو جنگلی بیل بوٹے کھائے گی اور ہم دونوں اس کا میٹھا میٹھا خالص دودھ پئیں گے۔

کچھ بھی تو نہیں دیکھا میں نے---- نہ پہاڑوں پر طلوع ہونے والے سورج کی پہلی کرنیں' نہ شفق کی لالی' اور نہ گھنے درختوں میں الجھا ہوا چاند---- رنگین تتلیاں' پھدکتی چہکتی چڑیاں اور جنگل میں ناچنے والا مور اور ان کے ست رنگے پر اور اس کے سر پر حسین تاج۔

ندیم! تم نے زندگی کو کتنا حسین بنا دیا تھا۔ تمہاری گفتگو شعر کی طرح گداز ہوتی تھی۔ تمہاری زبان سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بہتا تھا۔ تم اپنے خیالات سے بوسوں کی سی تسکین بانٹتے تھے۔ پر اب کیا ہو گا؟

یہ کیسا شعلہ لپکا ہے۔ جس کی حدت سے بوسوں کی تسکین جھلس گئی ہے۔ یہ کیسا بھونچال آیا ہے۔ جس نے اس چشمے کا رخ پاتال کی طرف پھیر دیا ہے۔ یہ کیسی بپتا آن پڑی ہے۔ جس نے پیار کا ذہن بدل دیا ہے۔

نہیں ندیم---- ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرا ندیم اتنا بے رحم کبھی نہیں بن سکتا---- اندھیری راتوں میں چمکنے والے جگنو کو اللہ نے یہی فرض سونپا ہے کہ وہ تاریک راتوں میں صبح کی امید کے دیئے جلاتا رہے---- ندیم! تم بھی ایک طرح سے جگنو ہو۔ تمہیں بھی تو اللہ نے ایک امتیاز بخشا ہے۔ لکھنے کی قدرت عطا کی ہے۔ تم بھی تو خیالات کی شمعیں روشن کرتے ہو۔ الفاظ کے دیئے جلاتے ہو۔ تم بھی تو جگنو کی طرح فطری فنکار ہو---- بن قیمت روشنی بانٹتے ہو۔ بن قیمت اجالا دیتے ہو۔

پھر میں تنہائی محسوس کروں تو کیوں---- محرومی کا خوف

مجھے کیوں ڈرائے۔ اندھیروں کے عفریت سے میں کیوں ڈروں---- تم الفاظ کے دیئے جلاتے ہو۔ ان الفاظ کے شگوفے تمہارے روشن دماغ---- تمہارے پاکیزہ دل اور تمہارے منور ذہن سے پھوٹتے ہیں---- تم تو روشنی کا وہ مینار ہو ندیم۔ جس سے انسانیت کی راہیں جلا پاتی ہیں۔

یہ تو میں کم بخت لڑکی ہوں۔ جو رائی کا پہاڑ بنا کر بہکی بہکی باتیں کر رہی ہوں۔ اندھیروں میں بھٹک گئی ہوں۔ مگر ندیم! یہ کوئی میرا قصور تھوڑا ہے۔ میں تو تمہارے پیار میں بالکل اندھی ہو گئی ہوں---- باؤلی ہو گئی ہوں۔ دیوانے کتے کی طرح دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بھول گئی ہوں---- بدبخت لڑکی ہوں' اپنے ندیم پر شک کر رہی ہوں۔

محبت پر شبہہ کر رہی ہوں۔

ناستک لڑکی! محبت پر شبہ کرے گی۔ گویا خدا کی خدائی سے انکار کرے گی۔

نہیں نہیں ندیم! مجھ مین اتنی ہمت نہیں ہے۔ مجھ میں اتنی شکتی نہیں ہے۔ مجھ میں اتنی چمک نہیں ہے۔ میں تو تمہاری باندی ہوں۔ دوست کا درجہ دے کر تو تم نے میری عزت خواہ مخواہ بڑھا دی تھی۔ یہ تمہاری عالی ظرفی ہے۔ اگر میں نے کبھی غلطی میں یا جھوٹے زعم میں تمہاری برابری کا دعویٰ کیا ہو تو مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری کنیز ہوں۔ کنیز سے روٹھا نہیں جاتا۔ اسے سزا دی جاتی ہے یا معاف کر دیا جاتا ہے۔

دیکھو! تم کہو گے اور سوچو گے کہ تم نے ایسی کوئی سخت یا تلخ بات تو مجھے نہیں لکھی۔ پھر یہ شمسہ اتنی جذباتی کیوں ہو گئی

ہے۔ کیوں اس طرح کی الٹی سیدھی ہانک رہی ہے۔ سمجھو تو واقعی تم نے ایسی کوئی بات لکھی بھی نہیں۔ ممکن ہے تمہارے دل میں میرا اسی طرح احترام ہو۔ تم مجھے ویسی وارفتگی سے چاہتے ہو۔ تم وہی دیکھے بھالے اور پرکھے ہوئے ندیم ہو۔ مگر میں کیا کروں۔ میں ان احساسات کو کیا کروں جو تمہارے پیار نے بہت زیادہ شدید کر دیئے ہیں۔

ندیم! یہ شبہہ نہیں ہے۔ یہ شک و شبہ کی شیرخوار معصوم اولادیں ہیں۔ معصوم بچوں کو بھوک لگتی ہے تو وہ روتے ہیں۔ رو کر زندگی کی بھیک مانگتے ہیں---- بس یہی حال میرا ہے۔ میرے بھی زندہ رہنے کے کچھ تقاضے ہیں۔ جس طرح بچہ ہر چار گھنٹے کے بعد دودھ کی خواہش کے لئے روتا ہے۔ اسی طرح میرا مستقبل بھی پیار کی تھپکی کے لئے فریاد کرتا ہے۔ اس فریاد میں گلہ نہیں۔ شکوہ نہیں۔ زندگی کے حق کی پکار ہے اور میں سوچتی ہوں میرا یہ حق کون روند سکتا ہے۔ یہ حق کون چھین سکتا ہے۔ بھلا میں وہ آنکھیں نکال نہ لوں گی جو میرے پیار کی طرف دیکھیں گی۔ میں وہ ہاتھ کاٹ نہ لوں گی جو میری محبت کی طرف اٹھیں گے اور میں وہ پاؤں کچل نہ دوں گی جو میرے حق کی طرف بڑھیں گے۔

ابھی تو میں نے پیار کا پہلا ہی گیت گایا تھا۔ ابھی تو محبت کی پہلی ہی کلی کھلی تھی۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ نہ وسیع و عریض کھیتوں کی صبح اور نہ دیہات کا چاند---- تم نے کہا تھا---- دیہات کا چاند بہت حسین ہوتا ہے۔ جب چاروں افق نور کی چادر بچھ جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان

اپنے نورانی پروں کے سہارے زمین سے گلے ملنے کے لئے چپکے سے اتر آیا ہے۔

میں یہ سن کر تڑپ تڑپ گئی تھی--- اور بے چارے شہر کے چاند کو تم نے کتنا مظلوم کہا تھا۔ قدم قدم پر برقی قمقموں کی روشنی میں کسی کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہلال کب نظر آیا تھا۔ اور پورن ماشی کے چاند کے حسن میں کتنا فسوں ہوتا ہے۔

ندیم! ایک روز تم نے چاندنی راتوں کی اتنی تعریف کی تھی کہ میں رات بھر سپنوں میں چاندنی کے سمندر پر اپنی پیار کی ناؤ کھیتی رہی تھی--- تمہاری ابر شمیں پلکیں بند تھیں اور تم میری گود میں سر رکھ کر سو رہے تھے۔ اور میں کرنوں کے پتوار دھیرے دھیرے چلا رہی تھی اور میری نگاہوں کا خلوص تم پر نثار ہو رہا تھا۔ لیکن-----

ندیم ایسا تو نہ ہو گا نا--- کہ زندگی بھر ان سپنوں کی تعبیر ہی نہ ملے۔

مگر ایسا کیوں ہو گا۔ سپنے بھی تو ایک طرح کے حقائق ہوتے ہیں۔ ان میں لاشعور کی جھلکیاں ہوتی ہیں۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسی طرح کے خواب دیکھتا ہے اور جیسے اس کے خیالات ہوں اسی طرح کا بن جاتا ہے۔ سپنے خیالوں کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ اور خیال عمل کے محرک بنتے ہیں۔ زندگی اسی طرح آگے بڑھتی ہے۔

میں سر پھری لڑکی ہوں اور جذباتی بھی۔ میری زندگی میں پیار کے سوا کچھ نہیں۔ پیار کے سوا میں کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتی۔ پیار کے سوا کسی کے سامنے میرا سر نہیں جھکتا۔ پیار

ہی وہ تلوار ہے جو میرا غرور کاٹ سکتی ہے۔ جو مجھے مار سکتی ہے اور مجھے ہرا سکتی ہے اور میرا پیار تم ہو۔ میرا نشہ تم ہو۔ میری فتح تم ہو۔ شکست تم ہو۔ تم۔ تم---- ندیم تم!

تمہارے بغیر آسمان کی نیلاہٹوں میں کوئی حسن نہیں رہے گا۔ تمہارے بغیر ہواؤں کا طلسمی گیت کوئی نہیں سنے گا۔ اور تمہارے بغیر زمین کی نیرنگیاں کوئی نہیں دیکھے گا۔ تم نہ ہو گے تو حیات کی نبض رک جائے گی اور تم ہو گے تو موت بھی زندگی بن جائے گی۔

پیار کے سوا ساری کائنات ہیچ ہے۔ پاگل ہیں وہ لوگ جو پیار کے بغیر زندہ رہنا گوارا کر لیتے ہیں---- میرے اچھے ندیم۔ مجھے کبھی نہ بھولنا۔ تمہیں ان پاؤں اور پیروں کی قسم جو تمہیں میرے چہرے سے زیادہ پسند تھے۔ مجھے کبھی اکیلا نہ چھوڑنا۔

میں جب رات کی تنہائیوں میں بستر میں لیٹ جاتی ہوں--- تو مجھے اس وسیع و عریض دنیا میں تمہارے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ تمہارے بغیر کسی خوشی کو میں خوشی نہیں کہہ سکتی۔ تمہارے بغیر بہار کو میں بہار نہ کہوں گی۔ تم نہ ملو گے تو کسی ڈالی پر پھول نہیں کھلے گا۔ تم نہ ہو گے تو کسی پھول میں خوشبو نہیں رہے گی۔ یہ دنیا پھیکی اور بے رنگ ہو جائے گی پھر اس چمن میں مہکاروں کے بجائے صرصر چلے گی۔ اور بلبل گیتوں کی بجائے نوحہ گائے گی۔

تمہارے ہی دم سے زندگی میں ہلچل ہے۔ تڑپ ہے‘ مسرت ہے۔

اچھے ندیم! تم اپنی شمو سے بے انصافی نہ کرنا۔ کبھی اس

سے منہ نہ موڑنا۔ کبھی اس کا دل نہ توڑنا۔۔۔۔ بس میں اور کچھ نہیں کہتی۔ مجھے پیار بھرے خط لکھا کرو۔ مجھے شمی کہا کرو۔ مگر مجھے شکوہ کرنے کا موقع کبھی نہ دو۔

مجھ میں شکوہ کرنے کی ہمت نہیں۔ تم نہیں جانتے ندیم۔ شکوہ کرنے والی گھڑی کا خیال کتنا روح فرسا ہوتا ہے! میں اب کی بار نہایت ہی پیارے خط کی آس لگائے بیٹھی ہوں۔

تمہاری شمسہ

خط پڑھ کر میری روح میں گدگدی اور میرے لبوں پر ایک فردوسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے تسلیم کرلیا کہ شمسہ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔

میری مسکراہٹ میں ایک مجروح صداقت کی تڑپ تھی اور اس تڑپ میں احساس جرم اور احساس محبت کا ملا جلا تقدس تھا۔ مختلف جذبوں نے مل کر اس مہاتمائی مسکراہٹ کو جنم دیا تھا۔۔۔۔ جو چاند کی کرنوں کی طرح منزہ اور پاکیزہ اور نور کی طرح حسین تھی۔

یہ مسکان۔۔۔ اگر شمسہ! ایک نظر دیکھ لیتی تو ساری زندگی کے شکوے شکایات اس ایک لمحے پر نثار کر دیتی۔ زندگی میں ایسے لمحے کبھی کبھی آتے ہیں۔ جن پر فرشتوں کا تقدس بھی قربان کیا جا سکتا ہے۔

اور یہ حقیقت اسی طرح اٹل تھی کہ ناہید اور اس سے وابستہ تمام محسوسات کے باوجود شمسہ کا احترام کا ذرہ بھر بھی کم نہ ہوا تھا۔ میں جب بھی اس معاملے میں ماضی اور مستقبل کی طرف جھانکتا۔ ایک جذباتی لڑکی کا خیال سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا۔۔۔۔ یہ خیال سچے اوز وفادار دوست کی طرح میرے ساتھ مانوس تھا۔۔۔ اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ یہ خیال کبھی مجھ سے جدا نہ ہو۔



آج میں مقبرہ جہانگیر جا رہا تھا۔ لاہور میں یہ جگہ مجھے بے حد پسند تھی۔ اکبر اعظم کا شیخو اور مہرالنساء کا سلیم۔ جس طرح زندگی میں جذباتی اور رومان پسند تھا۔ موت کے بعد بھی ویسے ہی رومان پرور ماحول میں سو رہا تھا۔

میں جب بھی وہاں جاتا۔ دیر تک سنگ مرمر کے تختوں کے نیچے ابدی نیند سوئے ہوئے نورالدین جہانگیر کے مزار پر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کئے کھڑا رہتا۔ دعا ختم کر کے بڑے چاؤ اور احترام سے منہ پر ہاتھ پھیرتا اور پھر چپکے سے نکل کر آم کے کسی گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنی دنیا میں کھو جاتا۔

میں لیڈیز سیٹ کے پیچھے پہلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مال روڈ کے کسی سٹاپ پر بس ٹھہری تو لڑکیوں کا ایک غول اندر گھس آیا۔ ان کی آمد سے بس کا ماحول خوشبوؤں سے معطر ہو گیا۔ اچانک نظریں اٹھائیں تو دیکھا۔ میرے بالکل قریب سفید ساٹن کی شلوار اور بہار کے خوش رنگ پھولوں کی طرح قمیص پہنے ناہید کسی لڑکی سے باتوں میں مصروف تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پرس تھا اور دائیں ہاتھ سے لوہے کی وہ چمکتی ہوئی سلاخ پکڑے ہوئے تھی، جو سہارے کے لئے بس کی چھت میں لگی ہوتی ہے۔

میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال دوڑا۔ پاس بیٹھے ہوئے ساتھی سے درخواست کی کہ اگر وہ محسوس نہ کرے تو یہ سیٹ لیڈیز کے لئے خالی کردے۔

وہ فوراً مان گیا۔ میں اٹھا اور آہستہ سے ناہید کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ناہید نے مڑ کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے مبہوت رہ گئی۔ میں نے مسکرا کے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"آیئے۔ بیٹھ جایئے"۔

ناہید گھبرائی، جھجکی۔ لیکن میرے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ اسے اجازت طلب نگاہوں سے سہیلی کی طرف دیکھنا پڑا۔ اس کی سہیلی نے بھی میری طرف دیکھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"آیئے نا۔ تشریف رکھئے"۔

میرے تخاطب میں ایک خاص قسم کا سہا سہا اور مشفقانہ انداز تھا۔ اس میں ناہید کے احترام کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ شکریہ ادا کر کے وہ دونوں سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ناہید نے مناسب سمجھا کہ میری وجہ سے سہیلی کے سامنے اسے جو چھوٹی سی عزت ملی ہے کم از کم اس کی رعایت سے ہی بات کی جائے۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"کتنی بھیڑ ہے آج"۔

"جی ہاں!" میں نے تائید کی۔ "چھٹی کا دن ہے نا اس لئے"۔

"آپ شاید کوئی پکچر وکچر دیکھنے جا رہے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں تو مقبرہ جہانگیر جا رہا ہوں"۔

"مقبرہ جہانگیر——!"

ناہید پہلے تو حیران ہوئی پھر اس نے ہنس کر سہیلی کی طرف دیکھا۔

"ہم بھی تو وہیں جا رہی ہیں"۔

اس کی سہیلی بھی مسکرائی۔ جیسے کہہ رہی ہو "ہاں بھئی عجیب اتفاق ہے!"

اتنے میں کنڈیکٹر آ گیا۔ میں نے ڈسٹرکٹ کورٹ تک کے لئے دو ٹکٹ اور لے لیے۔

ناہید بولی۔ "واہ ٹکٹ بھی آپ ہی نے لے لئے"۔

"کیا حرج ہے"۔ میں ہنس پڑا۔

ڈسٹرکٹ کورٹ پہنچ کر ہم تینوں اتر گئے۔ میں نے تجویز پیش کی۔

"بس کا انتظار کریں گے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ٹانگہ کیوں نہ پکڑ لیں؟"

ناہید ایک عجیب تذبذب میں پڑ گئی۔ مگر دوسرے لمحے اس کی سہیلی بولی۔

"ہاں ناہید ٹانگہ ٹھیک رہے گا"۔

چنانچہ میں نے ٹانگہ پکڑ لیا۔ وہ دونوں پیچھے اور میں آگے بیٹھ گیا۔ چونکہ ابھی تک ایک ہلکی سی اجنبیت کا وجود باقی تھا۔ اس لئے میں راستہ بھر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر وہ دونوں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ناہید نے اسے بتا دیا تھا۔

یہ مشہور افسانہ نگار ندیم ہیں۔ اور ریڈیو میں ملازم ہیں۔ اور میری جان پہچان بھی ان سے وہیں ریڈیو اسٹیشن میں ہوئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں تفاخر کا پہلو نمایاں تھا۔

وہ فرار، وہ کھچاؤ جو میرا ڈرامہ لکھنے کے بعد اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ آج بس کے ایک معمولی سے واقعے نے ختم کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ماضی کے خیالی رشتوں کو پنپنے کے لئے کسی بہانے کی تلاش تھی۔

مقبرے پہنچ کر وہ دونوں اتر کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ میں نے ٹانگے والے کو کرایہ دیا اور مسکرا کر ان کی طرف مڑا۔ ناہید ہنس کر بولی

"آپ دونوں کا تعارف تو کرایا نہیں۔ یہ میری سہیلی ترنم ہیں۔ میرے ساتھ پڑھتی ہیں۔ ان کے ابا انجینئر ہیں۔ اور آپ کی تعریف تو میں ان سے ٹانگے میں کر چکی ہوں"۔

ترنم نے ہنس کر سلام کیا۔ میں بھی رسمی انداز میں مسکرایا۔ پھر ہم تینوں

مقبرے کے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔

مقبرے کے وسیع احاطے میں خاصی چہل پہل تھی۔ بچے، مرد عورتیں، نوجوان لڑکے لڑکیاں رنگ برنگ ملبوسات میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے، کہیں سفید، کہیں پیلے اور کہیں سرخ گلاب کی کیاریاں کھلی ہوئی تھیں۔

ترنم نرگسی رنگ کا سوٹ پہنے تھی۔ اچھی خاصی صحت مند لڑکی تھی۔ مگر اس کا گندمی رنگ اور سوٹ نے مل کر سچ مچ اسے نرگس بیمار کی کیفیت دے دی تھی۔ اس کی چال میں ایک انوکھے قسم کی تساہل پسندی تھی۔ اور اس کے مزاج میں ایک بے ضرر قسم کی لاپرواہی۔ اس کے لب و لہجہ میں اس فطری تساہل پسندی کی لطافت نمایاں تھی۔

میری آتما ناچ رہی تھی۔ ناہید کے رویے اور سلوک میں ایک عجیب سی سرشاری محسوس کی۔ اس کے ردعمل سے میرے دل میں نغمے پھوٹ رہے تھے اور میں بے حد مسرور تھا۔

کئی بار ایسا ہوا۔ ترنم سے بچا کر ہم دونوں کی نگاہیں لمحہ بھر کے لئے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ ندامت و التجا، تسلیم و رضا اور پسندیدگی کا مبہم سا مفہوم ---- شادمانی اور سرشاری نے ہم دونوں کا دامن تھام رکھا تھا۔

کچھ دیر گھوم پھرنے کے بعد ترنم بولی۔

"بھئی میں تو تھک گئی ہوں۔ آؤ گھاس پر بیٹھ جائیں"۔

اور ہم تینوں کھجور کے ایک جھنڈ کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگایا تو ناہید حیرت اور تنبیہہ کے لہجے میں بولی۔

ارے واہ! یہ آپ نے سگریٹ کب سے پینے شروع کر دیئے ہیں؟"

"بس یونہی"۔

میں ہنس پڑا۔ مگر میری ہنسی میں ایک ہلکا سا تاسف بھی شامل تھا۔ جیسے اس کی وجہ کوئی نفسیاتی یا داخلی ترغیب ہو۔ ترنم بولی۔

"مجھے تو سگریٹ کا دھواں اچھا لگتا ہے۔ بھائی جان پائپ پیتے ہیں۔ ان کے تمباکو کی خوشبو پر تو میں جان دیتی ہوں"۔

"ارے خاک ڈالو"۔ ناہید نے شدید مخالفت کی۔ "بدبو کو تم خوشبو کہتی ہو۔ میرا بس چلے تو کسی کو پینے ہی نہ دوں"۔

میں نے مسکرا کر سلگی ہوئی سگریٹ گھاس پر مسل دی۔

آپ کو برا لگتا ہے تو میں آج سے اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا"۔

اپنی بات کا اتنا فوری ردعمل دیکھ کر ناہید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے فخریہ نگاہوں سے ترنم کی طرف دیکھا۔ مگر ترنم اس کے اندر کے محسوسات کو نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"تم تو شروع سے ہی انتہا پسند ہو۔ دوسرے کے جذبات کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتیں۔ بھلا یہ کوئی تک ہے۔ زبردستی ان کا سگریٹ بجھا دیا"۔

"ارے نہیں محترمہ۔ میں پہلے پیتا ہی کب تھا۔ زبردستی تو میری ہے۔ خواہ مخواہ خود کو عادی بنا رہا ہوں"۔

"تو آپ واقعی چھوڑ دیں گے کیا؟" ترنم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" میرے لہجے میں فخر اور دعویٰ تھا۔ "جو بات میرے اختیار میں ہو اس کے لئے تو ہر قسم کا وعدہ کر سکتا ہوں"۔

ناہید مسکرا کر بولی۔

"اور جو بات آپ کے اختیار میں نہ ہو۔ تب؟"

"تب بھی اتنا تو اختیار باقی رہتا ہے کہ اسے پسند کرتا رہوں"۔

ناہید کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ترنم بولی۔

یہ "بات آپ نے بڑی خوبصورت کہی۔ اگر کسی کتاب میں یہ فقرہ دیکھتی تو کئی بار پڑھتی"۔

ناہید بے ساختہ بولی۔

"ارے ان کے مکالمے تو مشہور ہیں۔ آپا جہاں آرا بیگم کہتی ہیں کہ جب یہ بولتے ہیں تو موتیوں کی طرح الفاظ اگلتے ہیں"۔

"وہ تو ظاہر ہے"۔ ترنم نے تائید کی۔ ناہید چھوٹے بچوں کی طرح مچل گئی۔

"اری! آپا جہاں آرا بیگم تو ان کی ایسی مداح ہیں کہ چھوٹے بچوں کی طرح ان کے لاڈ اٹھاتی ہیں۔ کہتی ہیں اس تیس سالہ بچے کو ہر وقت پیار کی تھپکی کی ضرورت ہے"۔

میں مسکرا رہا تھا۔ ناہید کے لب و لہجہ میں ایک عجیب کیف تھا۔

ترنم ہنس پڑی اور قدرے مشکوک نگاہوں سے ناہید کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آپا جہاں آرا بیگم کو چھوڑیئے۔ ہر صاحب ذوق لڑکی کا فرض ہوتا ہے کہ ملک کے فنکاروں سے پیار کرے"۔

ناہید اس چوٹ کو سمجھ گئی۔ بولی۔

"اگر صاحب ذوق ہونا ہی شرط ہو تو پھر ہمارے فنکاروں کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس ملک میں پڑھی لکھی لڑکیاں کتنی ہیں اور ان میں صاحب ذوق کتنی ہوں گی"۔

"اجی واہ!" ترنم تردیدی لہجے میں بولی۔ "یہ کون سی بات ہوئی--- تم کیا صاحب ذوق نہیں ہو۔ تمام اچھے شاعروں کے اچھے شعر تمہیں یاد ہیں اور تمام اچھے ادیبوں کے نام تمہیں ازبر ہیں"۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ میں نے ناہید کے بچاؤ کی صورت ڈھونڈی۔

"آپا جہاں آرا بیگم جس پیار کی تھپکی کا ذکر کرتی ہیں۔ اس میں ممتا کا روپ ہوتا ہے"۔

"ارے نہیں ندیم صاحب! ممتا کا روپ تو زندگی کا صرف ایک پہلو ہے"۔ ترنم ناہید کو زچ کرنا چاہتی تھی۔ "جیون کے اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ پیار کی اور بھی شکلیں ہیں۔ فنکار زندگی کے ہر گوشے سے جھانکتا ہے۔ اس کی نگاہوں کو ہر گوشے سے حسن ملنا چاہیے تاکہ وہ زندگی کو حسین بنا سکے"۔

میں ہنس پڑا۔

"ڈائیلاگ تو آپ بھی خوب بولتی ہیں"۔

"تو گویا میں بنتی ہوں؟"

"واہ---! یہ میں نے کب کہا"۔

"شاید آپ نے ڈائیلاگ کا لفظ خلوص سے استعمال کیا ہو"۔ ترنم نے میری حیرت کو عزت دی۔ "مگر ہم لڑکیوں کے نزدیک اس کا مفہوم یہی ہے کہ جب کوئی روزمرہ کی بول چال سے ذرا ہٹ کر ادبیت پر اتر آئے۔ تو ہم لوگ کہتے ہیں کہ کہ لو یہ ڈائیلاگ بولنے لگے ہیں۔ یعنی بننے لگے ہیں"۔

"ہاں! شاید لڑکیوں کی گفتگو کے آداب میں اس کا مفہوم یہی ہو۔ مگر میرے نزدیک تو تمدن جتنا ترقی یافتہ ہوتا جائے گا۔ بننا بھی اتنا ہی مہذب ہوتا جائے گا بلکہ اس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ مثال کے طور پر ہم لڑکے جب لڑکیوں کے سامنے آتے ہیں تو وہ نہیں رہتے جو اپنے دوستوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لڑکیاں بھی لڑکوں کے سامنے آ کر وہ نہیں رہتیں۔ جو اپنی سہیلیوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں آپ کے دل میں یہ خواہش ہو گی یا نہیں۔ مگر میں تو اس کے لئے بے چین ہوتا ہوں کہ کاش لڑکیاں جس طرح اپنی سہیلیوں کے درمیان چہکتی ہیں۔ بالکل اسی فطری روپ میں مردوں کے سامنے بھی آئیں"۔

ناہید بڑے غور سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

ترنم بولی۔ "یعنی آپ زندگی میں متانت کو پسند نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کے لئے مجبور ہوں۔ میں نے اس معاشرے میں رہنا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں کی معیت میں جو لمحے گزارتا ہوں وہ اس متانت سے زیادہ مسرت بخش ہوتے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار چھپ کر سہیلیوں کی آپس کی گفتگو بھی سنی ہے۔ وہ لمحے ان کی خوشی کے لمحے ہوتے ہیں۔ میں نے بڑی سچائی سے محسوس کیا ہے کہ ہم دونوں صنف درحقیقت وہی پسند کرتے ہیں

جسے بظاہر ناپسند کرتے ہیں"۔

ترنم اور ناہید نے بیک وقت مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے میں نے ان کی روح میں جھانک لیا ہو۔ ناہید بولی۔

"ہمارا معاشرہ ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ ہماری زندگی کی اقدار ہی ایسی ہیں کہ ہماری ذہنیت ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح ہم اپنی امنگوں پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ مگر فطرت کو بدل نہیں پاتے"۔

ترنم نے کہا۔ "یعنی زندگی کے وقار اور اقدار کے باوجود ہم فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں"۔

"میرا خیال یہی ہے"۔

"اس کا ثبوت؟"

"ثبوت ایک ہو تو بتاؤں۔ شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھائے۔ اس لئے وہ مجبور ہے کہ ہرن کا شکار کرے۔ اب اگر کوئی کہے کہ وہ ظالم ہے اور بے گناہ ہرن کو شکار کرتا ہے تو یہ زیادتی ہے۔ گھاس کھا کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ گھوڑے کی فطرت اسے ودیعت نہیں ہوئی۔ اسی طرح بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ اس کی زندگی اسی سے عبارت ہے۔ بڑی مچھلی کو ظالم کہنے والے قانون فطرت کو ہی ظالم کہیں گے جس کے اشاروں پر ہمارا ذہن ناچتا ہے"۔

ترنم بڑے تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تو پھر یہ اللہ کا قصور ہوا نا"۔

"جس فطرت کی میں بات کر رہا ہوں۔ اگر اس میں اللہ میاں کا ہاتھ ہے تو پھر الزام آئے گا"۔

"الزام آئے گا سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ آپ اس کی وضاحت کیجئے"۔

"میری مراد یہ ہے کہ اللہ میاں کے بھی دو روپ ہیں۔ ایک داخلی' ایک خارجی۔ خارجی روپ سے ہم ڈرتے ہیں۔ اس روپ نے ہمارے جیون کو قاعدے اور قوانین میں جکڑ رکھا ہے۔ اسی روپ نے ہماری امیدوں اور آرزوؤں کو تنظیم دے کر معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا کیا ہے۔ مگر داخلی روپ اندر ہی اندر تخلیق کرتا ہے بدی بھی' نیکی بھی' وہ خاموشی سے سب کچھ کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس سے ڈرتے ہیں"۔

"ترنم بولی۔ میری سمجھ میں ابھی تک پوری بات نہیں آئی؟"

"دیکھئے نا۔ ایک لڑکی ہے۔ وہ خیالوں میں اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کر دیتی ہے۔ مگر عملی طرؤ پر ایسا نہیں کرتی۔ یہ خارجی روپ کی فتح ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ مستحسن نہیں ہے۔ اس سے سماج کا ایک جھوٹا وقار ضرور بنتا ہے۔ مگر ذہنی اور روحانی صحت مندی ختم ہو جاتی ہے"۔

ناہید خاموش تھی۔ ترنم نے کہا۔

"یعنی آپ کے نزدیک گناہ وہ ہے جس سے ذہن اور روح پراگندہ ہو جائیں؟"

"میرا نظریہ یہی ہے اس سے معاشرہ نسبتاً" زیادہ گھناؤنا ہو جاتا ہے"۔

"گویا آپ فطری طلب کو زندگی کی ہر ذمہ داری سے بالاتر سمجھتے ہیں؟"

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ فطری خواہش کو زندگی کی کسی ذمہ داری سے کم درجے کی چیز کیوں سمجھا جائے۔ آپ شیر کی چیر پھاڑ کی خو بو کو چھین کر قدرت کا مذاق کیوں کر اڑا سکتے ہیں۔ آپ کسی کو چند روز بھوکا پیاسا رکھیں گے تو وہ مرجائے گا۔ یہ بھوک روٹی کی بجائے جنس کی ہو گی تو یہ جنسی ناآسودگی اسے جلد یا بدیر مجرم بنا دے گی۔ کیا فائدہ ایسی پابندی کا جو ذہنی انتشار پھیلائے"۔

ناہید بڑے ذومعنی انداز میں چپ سادھے بیٹھی تھی۔

ترنم کچھ لاجواب سی ہو کر بولی۔

"آپ الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ آپ کی باتیں دماغ مانتا ہے۔ مگر انہیں سن کر جی گھبرانے لگ جاتا ہے"۔

میں ہنس پڑا۔

"جی گھبرائے اور دماغ مانے۔ پھر تو میں حقائق کے قریب ہوں"۔

ناہید نے طرح دی۔۔۔ "ان کا مطلب ہے۔ لوگ جذبات کو وقتی چیز سمجھتے ہیں اور عقل کی رہنمائی کو ترجیح دیتے ہیں"۔

"ہاں بھئی تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔ چلو اٹھو چلیں"۔ ترنم نے بایاں ہاتھ زمین پر دبایا۔ اور داہنے ہاتھ سے ناہید کے شانے کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ "مجھے تو تین بجے گھر پہنچنا ہے۔ آج ہمارے سارے گھر کا میٹنی شو کا پروگرام ہے"۔

ترنم کا گھر لارنس روڈ پر تھا۔ چیئرنگ کراس پر وہ ہم سے الگ ہو گئی۔ میں آگے بیٹھا تھا۔ ناہید پیچھے اکیلی رہ گئی۔ ٹانگے والے نے پوچھا۔

"بابو جی! اب کہاں جاؤں؟"

"میں نے ٹانگے والے کو جواب دینے کی بجائے ناہید کی طرف دیکھا۔

"اگر دیر نہ ہو رہی ہو تو کہیں بیٹھ کر ایک ایک کپ چائے پی لی جائے؟"

"نہیں دیر کی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن چائے گھر پر کیوں نہ پی جائے"۔ ناہید نے غیرارادی طور پر تجویز کیا۔

"پھر تو گلبرگ جانا پڑے گا"۔ میں نے حیرت اور خوشی سے کہا۔

"کیا جرح ہے۔ چائے کے بہانے آپ ہمارا گھر بھی دیکھ لیں گے"۔ ناہید مسکرا کے بولی۔ "ڈیڈی بھی گھر ہوں گے۔ ان سے بھی تعارف ہو جائے گا۔ ممی اور تبسم کو بھی دیکھ لیں گے"۔

"ہاں" میں مسکرایا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "جانا ہی چاہیے"۔

ٹانگہ چھوڑ کر ہم نے ٹیکسی پکڑ لی۔ راستے میں رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ہم دونوں خوش تھے۔ دونوں کے دلوں میں دوستی کا ایک خفیہ سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ یہ قطعی ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ اور میری قربت کی خواہش مند ہے۔ شاید ناہید پر بھی واضح ہو چکا تھا کہ اس کا کھچاؤ اور بعد بالکل مہمل چیزیں تھیں۔ بالکل

فرضی۔ بالکل سطحی۔۔۔ غالباً" اس کے تحت الشعور میں میرا خیال کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھا اور پھر آج کی باتوں نے تو جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ میرے اور ترنم کی بحث میں اس کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ میرے فلسفہ زندگی سے متاثر ہو چکی تھی اور اگر متاثر نہ بھی ہوتی تو بھی ذاتی پسند ایک ایسا جذبہ ہے جو سو عیبوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

بہرحال وہ مجھ سے مرعوب ہو چکی تھی۔ اور اب سچے دل سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میری رہی سہی اجنبیت بھی ختم ہو گئی ناہید کے والدہ بڑے زندہ دل اور دلچسپ آدمی تھے۔ مجھے ان کی طبیعت اور مزاج بہت پسند آیا۔ ناہید کی والدہ بڑی متین اور پروقار عورت تھیں۔ ان کے بات کرنے کے انداز اور چال ڈھال میں ایک خاص قسم کی خوداعتمادی تھی۔ ادھیڑ تھیں۔ لیکن جسم بالکل متوازن' آدمی پشت کی طرف سے دیکھے تو جوان معلوم ہوں۔

تبسم کا رنگ ناہید کی طرح لیکن نقش ناہید کی طرح واضح نہیں تھے۔ مگر ماں کی سی سنجیدگی نے اسے ایک خاص امتیاز بخشا تھا۔۔۔ رکھ رکھاؤ ماں کی طرح۔ مزاج باپ کی طرح شگفتہ۔

مجھے سب لوگ بے حد پسند آئے۔ ناہید کے ڈیڈی نے کہا۔

"بیٹا کبھی کبھی آ جایا کرو۔ مجھے تو کتابوں سے زیادہ کھیل کود سے دلچسپی ہے۔ مگر یہ ماں بیٹیاں بڑی ادب نواز قسم کی ہیں۔ ان سے آپ کو فائدہ ہی ہو گا۔ سردیوں میں سویٹر مفت بن جایا کریں گے"۔

سب ہنس پڑے۔ ناہید بولی۔

"اور اگر ڈیڈی کے ساتھ شطرنج کے لئے چار پانچ گھنٹے روز وقف کر دیا کریں تو یہ اور زیادہ سفارش کریں گے"۔

واجد صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"ناہید بیٹا چوراہے میں بھانڈا پھوڑ دیتی ہیں۔ بھئی انہیں کیوں ڈراتے ہو کہ

یہاں شطرنج بھی کھیلا جاتا ہے"۔

ناہید کی والدہ مسکراتی رہیں۔ تبسم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی--- ناہید باجی ڈرا نہیں رہیں۔ وہ تو ندیم بھائی کو بتا رہی ہیں کہ اگر شطرنج کھیلنا نہیں آتا تو جلدی سے سیکھ لیجئے گا"۔

"اری تم بہت شریر ہو"۔ واجد صاحب نے میری طرف دیکھا۔ "دیکھا ندیم بیٹا! یہ تینوں میرے خلاف محاذ بنا لیتیں ہیں۔ بس ان لوگوں کو تو میرے شطرنج سے خدا واسطے کا بیر ہے"۔

اس دلچسپ گفتگو سے میں محظوظ ہوتا رہا۔ اور یہ خوبصورت گھر اور شگفتہ لوگ مجھے بہت اچھے لگے۔ چائے پی کر جانے کی اجازت چاہی تو واجد صاحب ہنس کر بولے۔

"ہاں ہاں بیٹا جاؤ۔ مگر آنے اور جانے کے لئے اجازت نہ مانگا کرو۔ اسے اپنا گھر سمجھو۔ جب مرضی ہو آ جایا کرو۔ جب مرضی ہو چلے جایا کرو۔ کل سے میں تمہاری کوئی کتاب پڑھوں گا۔ ناہید بیٹی تو بہت تعریف کرتی ہیں"۔

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک نظر ناہید کو دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اور ایک عجیب سا احساس لے کر چلا آیا۔

ریڈیو اسٹیشن میں اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہی تھی کہ میں اور ناہید ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہیں۔ ہر طرف ہماری دوستی اور محبت کے چرچے تھے۔ رضوی کو یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ مگر اب کی دفعہ اس کے احساس میں رقابت یا بغض کا رنگ نہیں تھا۔ اسے ہماری قربت پر خوشی بھی نہیں ہوئی تھی--- بس وہ ایک درمیانی راستے پر کھڑا تھا۔ وہ ہمارے خوشی اور غم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اور ایسا سوچ کر کسی حد تک اس نے اپنا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔

آپا جہاں آرا بیگم کو ہماری دوستی سے واقعی خوشی ہوئی۔

لیکن جہاں ہماری قربت سب پر واضح ہو چکی تھی۔ وہاں میں اور ناہید شبے کی ایک دیوار ابھی تک نہ ڈھا سکے تھے--- یہ تھی ایک دوسرے کے احترام کی دیوار جو قربت کے باوجود حرف مدعا نہ بن سکی تھی۔

ہم ساتھ رہ کر خوشی محسوس کرتے۔ لوگ ہمارے متعلق باتیں کریں۔ ہم پر شک کریں۔ ہماری محبت کو طرح طرح کے رنگ دیں۔ یہ سب ٹھیک تھا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہے۔ مگر ایسی صورت کیوں کر پیدا ہو کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کہہ دوں کہ۔

"یہ ہاتھ میرا ہے۔ یہ نرم و نازک یہ خوبصورت ہاتھ میرا ہے۔ یہ کالی کالی بڑی بڑی حسین آنکھیں میری ہیں۔ یہ دلفریب جسم میرا ہے۔ یہ پھول سا جسم میرا ہے"۔

اور ناہید زبان سے کچھ نہ کہے۔ بس پلکیں جھپکا کر اس طرح شرما جائے۔ گویا----

"ہاں! یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ تمہاے سوا کسی کا نہیں!"

ہم قلبی طور پر ایک دوسرے تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ ایک دوسرے کی تمنا اور خواہش کو سمجھتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری قربت اور دوستی کی بنیادیں کس قسم کی طلب پر رکھی گئی ہیں۔ مگر عملی طور پر انتہائے آرزو کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی اور تکمیل تمنا کا کوئی راستہ نہیں نکل رہا تھا۔

ناہید تو خیر لڑکی تھی۔ فطری حجاب اس کی راہ روکے ہوئے تھی۔ مگر میں----- جو اس معاملے میں عورت کی نفسیات کو سمجھتا تھا۔ اور زندگی کے تقاضوں کا بھی شعور رکھتا تھا--- نے خود کو بے بس بنا رکھا تھا۔ یہ بے بسی کچھ ایسی خودساختہ قسم کی تھی جسے انسان کسی کمزور لمحے اپنا لے۔ مگر پھر اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔

مجھے یاد تھا۔ جب ہم لارنس کی کسی روش پر ٹہل رہے تھے اور ہمارے شانے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔ تو میں نے کیا کیا محسوس کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا

ناہید نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ اس لمس میں میں نے ناہید کی خودسپردگی کا کیف و سرور پایا تھا۔ مگر دوسرے لمحے اچانک ایک خدشہ پھن پھیلا کر میرے ساتھ کھڑا ہو جاتا کیا پتہ۔ ایسا اتفاق سے ہوا ہو۔

ناہید گو بظاہر سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش تھی۔ مگر قلبی طور پر سب کچھ محسوس کر رہی تھی--- کئی بار میری جھنجلاہٹ سے خود بھی جھنجلا جاتی---- مگر کبھی کبھی میری بے بسی میں اسے سکون بھی ملتا۔ اس سکون میں رحم کے جذبے کی شکل بھی ہوتی اور فخر کا احساس بھی۔

لڑکیاں مرد کے لمس اور بوسے کو پسند کرتی ہیں۔ دل سے چاہتی ہیں مگر زبان سے ناں ناں کہتی ہیں---- لیکن ناہید کے لئے اکتاہٹ کی حد تک یہ فاصلہ طویل ہو گیا تھا۔ انکار کی وہ شکل جس میں اقرار کی چاشنی اور کیف ہوتا ہے۔ ناہید کے لئے ایک بے معنی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے تو اب تک یہ موقع ہی میسر نہیں آیا تھا کہ میں اس کا ہاتھ دباؤں اور وہ اسے کھینچ لے۔ میں اسے بازوؤں میں دبوچوں اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر نکلنے کی سعی کرے۔

اب تو اس کے لئے ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ اگر وہ خود اپنے طور پر ابتدا نہیں کر سکتی۔ تو میری کسی ابتدائی کوشش کو ناکام بنانے کا خیال دل سے نکال دے۔ ورنہ کیا عجب کہ یہ بدکا ہوا شخص سدا کے لئے بدل جائے۔

حالانکہ ٹھنڈے گوشت کی طرح میری آغوش میں سما جانا' شاید اسے پسند نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔ ایک مصنوعی احترام اور پابندی نے جیون کی ساری شگفتگی چھین لی تھی۔

اس روز آپا جہاں آرا بیگم نے نئی انگریزی فلم کی بہت تعریف کی تو میں نے جھٹ سے فسٹ شو دیکھنے کی تجویز پیش کی۔ ناہید مسکرائی اور مان گئی۔ ساتھ ہی جہاں آرا بیگم کو بھی لے جانے کی پیش کش کی۔ مگر آپا تو کوئی بہانہ بنا کر ٹال

گئیں---- اور ہم دونوں چلے گئے۔

احتیاطاً" ہم گیلری کی آخری قطار میں بیٹھ گئے۔ تاکہ پیچھے سے ہماری حرکات و سکنات کو نوٹ کرنے والا کوئی نہ ہو۔

رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر میں لائٹ آف ہو گئی۔ دروازوں پر سیاہ پردے کھینچ دیئے گئے۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ سینما کے پردے پر تیزی سے تصویریں بدلنے لگیں---- میرے دل میں ہلچل برپا تھی۔ میں بظاہر سکرین کو دیکھ رہا تھا۔ مگر آنکھوں کے گوشوں سے ناہید کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بالکل یہی کچھ ناہید کر رہی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ دونوں کی خاموشی سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہے ہیں مگر حقیقتاً" ایسا نہیں تھا۔

میرے دونوں ہاتھ میری گود میں جکڑے ہوئے تھے۔ ناہید بھی بے حد محتاط بیٹھی تھی۔ ہم پوری طرح ایک دوسرے سے باخبر تھے۔

کبھی کبھی کسی کامیڈی مکالمے پر ہال میں اچانک قہقہہ پڑ جاتا تو ہم دونوں چونک پڑتے اور اپنی خفت مٹانے کے لئے خواہ مخواہ ہنس پڑتے۔ جیسے واقعی بے حد مگن ہو کر فلم دیکھ رہے ہیں۔ پھر ایک ایسا منظر آیا۔ جس میں ہیرو ہیروئن نے بڑے جذباتی مکالمے بولے۔ یہ بے حد رومانٹک منظر تھا۔ دونوں کی سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔ دونوں کے نتھنے ہل رہے تھے---- اور پھر دونوں کے لب جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

میں نے کنکھیوں سے ناہید کی طرف دیکھا وہ بڑی بے دردی سے اپنے ہونٹ چبا رہی تھی اور مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

معاً" میں نے انگڑائی لی۔ جس کی بالکل اس وقت ضرورت نہ تھی۔ ایسا لگا کہ میں اپنے ہاتھوں کو اپنی گود کی قید سے چھڑا لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ اپنی اور ناہید کی نشست کے بیچ والے ہتھے پر رکھ دیا۔ میرا جسم بھی کسی حد تک ادھر کو

جھک گیا۔ ناہید بے طرح چونکی۔ مگر بظاہر اس کی نظریں سکرین پر جمی رہیں۔

تھوڑی دیر تک غیر معمولی سناٹا چھایا رہا۔ اور دو دل شک اور خوف کے ناؤ میں ڈوبنے لگے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہا۔ جیسے ہوا کے لمس کی طرح کوئی چیز میری کہنی سے چھو گئی ہے——— مجھے ایسا لگا کہ یہ ناہید کا سیمیں بازو تھا۔ جو بہت دھیرے دھیرے سرک آیا تھا۔ لیکن اتنے محتاط اور نپے تلے انداز میں کہ میں اس کی چوری نہ پکڑ سکا۔

ہوا کے اس لمس نے میرے خون میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

میں سوچنے لگا——— ریشم کی سی اس لمس پر ہی قناعت کروں۔ یا میں بھی ناہید کی طرح ہولے ہولے آگے بڑھوں۔ اور ان چنگاریوں کو لپکتے شعلوں میں بدل دوں——— ابھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ انٹرول ہو گیا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا——— گویا پکچر تو اچھی خاصی رہی وقفے میں ہم باہر نہیں نکلے——— مگر فلم کے متعلق کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ میں نے چائے منگوا لی تھی۔ ناہید گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

"تبسم کہے گی۔ باجی اکیلے اکیلے فلم دیکھ آئی"۔

میں سوچنے لگا۔ اس گھڑی ڈیڈی اور ممی کی جگہ اسے تبسم کا خیال کیوں کر آیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تبسم اور آپ ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے باخبر رہتی ہیں"۔

ناہید ایک لمحہ کے لئے چونکی۔ مگر پھر فوراً بولی۔

"یہ بات تو نہیں۔ مگر جب پکچر جانے کا پروگرام بنتا ہے تو ہم دونوں ہمیشہ ساتھ ہوتی ہیں۔ آج پہلا موقع ہے کہ وہ میرے ساتھ نہیں ہے"۔

میں نے اس کے دل کی بات سمجھ کر کہا۔

"مگر یہ ضروری تو نہیں کہ اسے بتایا جائے کہ ہم پکچر دیکھ کر آ رہے ہیں"۔

اچانک بتیاں بجھ گئیں۔ فلم شروع ہو گئی۔ اور خاموشی چھا گئی۔

میری سوچ نے ایک اور راستہ ڈھونڈ نکالا——— تبسم سے پکچر پر جانے کے راز کو چھپانا اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے ذہن میں کسی غیر مرئی جرم کا احساس ہے۔ ایسا جرم جو اگر سب کے سامنے کیا جائے تو اس کی حیثیت جرم کی سی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اسے دوسروں کی نگاہوں سے چھپایا جائے تو ضمیر اس کی خلش محسوس کرتا ہے۔

مثال کے طور پر جب اس نے پہلے روز مجھے سب سے متعارف کرایا تھا تو اس کی آنکھوں میں فخر کا احساس تھا۔ وہ آج سینما جانے کے واقعے کو بھی اسی جرات اور افتخار سے کہہ سکتی تھی۔ مگر کل کے فخر پر آج ایک ننھا سا چور حاوی ہو گیا تھا۔ یہ چور اس کے سینے کے کسی گوشے میں چھپا بیٹھا تھا۔ جو اسے چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔

"تو ندیم کے ساتھ یونہی نہیں آئی۔ تو ندیم کے ساتھ یونہی نہیں آئی"۔

تبسم سے رازداری کا مقصد بالکل واضح تھا۔ دونوں کی یک جائی کا رشتہ، بوسے اور لمس کا رشتہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہی چیز تبسم سے چھپانا چاہتی تھی چنانچہ جب یہ بات پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی تو میں نے محسوس کیا کہ کسی حد تک میں دلیر ہو گیا ہوں ایک طرح سے ناہید نے تبسم کا ذکر چھیڑ کر خود میرے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔

پیار میں انسان بہت شکی اور باریک بین ہو جاتا ہے وہ سچ مچ بال کی کھال اتار کر اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے۔

ایک دفعہ ہم دونوں کے ہاتھ بتائے جتائے بغیر اس حالت میں آ گئے جہاں انٹرول سے پہلے رکھے تھے۔ مگر اب ہوا کے سے لمس کے بجائے ایک دوسرے کی کہنیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور یہ میٹھا میٹھا تصادم بہت صاف اور واضح تھا جو

ہمارے جسموں میں آگ پھیلا رہا تھا اور روحوں میں گدگدی پیدا کر رہا تھا۔

فلم تو ہم برائے نام دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ بس اب دیکھنا تو صرف یہ تھا کہ کہنیوں کے تصادم سے آگے کونسی منزل ہے اور اس کی راہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور اس پر چلنے کے لئے پہل کون کرتا ہے؟

ناہید سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور میں اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور عجیب عجیب باتیں سوچ رہا تھا پھر یک لخت جیسے کسی نے زبردستی مجھ سے اگلوا دیا۔ بے اختیارانہ میری زبان سے نکلا۔

"ناہید۔۔!"

مگر دوسرے لمحے میں چونکا۔ آپے میں آیا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ واقعی یہ میری آواز تھی میں نے ہی ناہید کو پکارا تھا۔۔۔۔ نہ جانے کس جذبے نے مجھ سے ناہید کہلوا دیا تھا۔۔۔؟

ادھر ناہید نے بم کے گولے کی طرح یہ پکار سنی۔ مگر جیسے اسے سانپ سونگھ گیا تھا جس طرح بے اختیار ہو کر میں نے ناہید کا نام پکارا تھا بالکل اسی طرح ناہید بے اختیار ہو کر اس پکار کا جواب نہ دے سکی تھی۔ اس خاموشی کے معنی بھی وہی تھے جو اس پکار کے تھے اگر اس پکار کا کوئی وجود نہ تھا۔۔۔۔ تو یہ خاموشی اس کی روح تھی۔

اگر میری پکار کو بالکل اسی طرح کا خاموش جواب نہ ملتا تو گویا یہ پکار نامکمل ہوتی ادھوری ہوتی!

کہنیوں کے لطیف تصادم کی طرح یہ ذومعنی سکوت بھی زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تھا۔۔۔ مگر اب میں اپنے آپ میں آگیا تھا اور کسی حد تک ندامت بھی محسوس کر رہا تھا اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ناہید کہہ کر میں اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتا تھا۔ اگر وہ جواب میں خدانخواستہ ہاں کہہ دیتی تو پھر میں نے مزید کیا کہنا تھا یا وہ جواب میں نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی تو میرے پاس

کہنے کو کیا ہوتا۔۔؟

یہ امتحان کتنا کڑا ہوتا اور یہ لمحہ کتنا اذیت ناک ہوتا۔

یا تو میں پوری ڈھٹائی سے ہنس کر ایک عام آدمی کی سطح پر آ جاتا یا زندگی بھر کی سچائی آنکھوں کی پتلیوں میں سمیٹ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیت جاتا پر جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا اس خاموشی نے میرا بھرم رکھ لیا۔ ناہید نے کہنی پیچھے نہیں ہٹائی یعنی اس واقعہ کے بعد بھی اس نے پچھلا تعلق نہیں توڑا۔ ایک طرح سے یہی مکمل جواب تھا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی میں سوچ رہا تھا اگر اس وقت میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لوں۔ تو بھی وہ خاموش رہے گی کچھ نہ بولے گی۔ بے شک بڑی بے چینی سے وہ اپنے ہونٹ چبائے گی لیکن اس میں بھی ایک لطف ہو گا جنسی تڑپ کا ردعمل ہو گا۔۔۔ مگر ناہید کہنے کے بعد خفت و ندامت کا جو ایک غیر مرئی سا وجود تخلیق ہوا تھا وہ اب آڑے آ رہا تھا۔۔۔ ایک طرح سے یہ ننھی ننھی چھوٹی بندشیں ناہید کے ذہن میں جھنجلاہٹ کے ساتھ ساتھ خود سپردگی کا راستہ ہموار کر رہی تھیں مگر یہ سب کچھ ارادتاً" نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ دو حساس دل اپنے اپنے طور سے متاثر ہو کر ایک عجیب سا جنسی ماحول تشکیل دے رہے تھے۔

پکچر ختم ہو گئی ہال میں روشنی ہو گئی۔

ہم دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

بھیڑ میں گیلری کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سہارے کے طور پر اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ ناہید نے اس انداز میں بڑی اپنائیت محسوس کی۔ اس لمحے دونوں کا جی چاہا کہ لوگ انہیں اچھی طرح سے دیکھ لیں۔ حسین ساتھی بغل میں ہو تو انسان میں خواہ مخواہ کا غرور اور تمکنت آ جاتی ہے۔

باہر نکلے تو جل تھل ہو گیا تھا۔ بڑی زوروں کی بارش ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ موسم میں کافی خنکی آ گئی تھی۔۔۔ سوچا پہلے

ناہید کو گھر پہنچا آؤں۔

ٹیکسی نہ ملی تو تانگے میں بیٹھ گئے۔ میں اس کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ ہوا بھی ادھر سے چل رہی تھی اور میں ایک طرف سے بھیگا جا رہا تھا۔ وہ بولی۔

"ادھر کو سرک آیئے۔ آپ تو بھیگ رہے ہیں"۔

میں ادھر کو سرک گیا۔ ہمارے جسم ٹکرائے۔ ایک بار پھر دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیکن بظاہر دونوں نے نوٹس نہ لیا--- کچھ دور جا کر تانگے نے رخ بدلا۔ تو دونوں کے پیروں پر بوندیں پڑنے لگیں۔ دونوں نے پیر سمیٹ لئے۔ مگر تیز ہوا کی وجہ سے بوندیں ہمارے گھٹنوں اور رانوں پر بھی پڑنے لگیں--- پھر اچانک بارش تیز ہو گئی۔ تانگہ کبھی اندھیرے کبھی اجالے میں سے گذرتا۔ جب سڑک پر لگا ہوا کوئی قمقمہ قریب آتا تو میری نگاہیں ناہید کے ہرے رنگ کے ریشمی دامن کو ٹٹولتیں۔ جو بھیگ کر اس کے سڈول رانوں سے چپک گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے۔

واجد صاحب سو گئے تھے۔ تبسم اور ناہید کی والدہ البتہ انتظار کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کر ناہید کی والدہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"ساڑھے دس بج رہے ہیں ناہید! تمہارے ڈیڈی سونے سے پہلے کئی بار پوچھ چکے ہیں"۔

"ہاں امی! بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ ہم پکچر دیکھنے چلے گئے تھے"۔

ماں خاموش ہو گئی۔ تبسم نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں پر ایک خاص نگاہ ڈالی۔ ناہید نے میری طرف دیکھا۔

"ارے آپ بیٹھئے نا"۔

"نہیں۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ بہت دیر ہو جائے گی"۔

"ارے نہیں بیٹا! اس موسم میں کیسے جاؤ گے۔ بیٹھو میں تم دونوں کے لئے کھانا گرم کرتی ہوں۔ ناہید تم کپڑے بدل لو۔ اور تبسم ندیم کے لئے بھی ڈیڈی کے کپڑے

نکال دو۔ ایسے موسم میں میں تمہیں جانے نہیں دوں گی بیٹا!"

میں خاموش ہو گیا۔ ناہید کے دیر میں آنے کی وجہ سے جو ہلکا سا احتجاج ہوا تھا۔ یہ لب و لہجہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ناہید دوبارہ بولی۔

"بیٹھئے نا!"

اور میں چپکے سے بیٹھ گیا۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا بستر اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں لگا دیا گیا تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں بائیں طرف کا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ داہنے ہاتھ کے کمرے میں واجد صاحب اور ان کی بیگم سوتی تھیں۔
اس کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے اوپر کے کمروں کی سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔
ناہید اور تبسم کا کمرہ کوٹھی کی پچھلی طرف تھا۔

بارہ بجے میں نے اٹھ کر نیچے دیکھا تھا۔ تبسم سو گئی تھی۔ ناہید لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھی اور کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں دیر تک کمبل اوڑھے چھت پر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔

باقی کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مگر اس کھڑکی کا پردہ سرکا ہوا تھا۔ جو اوپر کے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ وہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس چیز میں بھی میں نے ایک ترغیب محسوس کی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد بتی بجھ گئی۔ بتی بجھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جانے میں کیوں خیال کر رہا تھا کہ ناہید اوپر آ جائے گی۔

دس پندرہ منٹ تک میری کیفیت عجیب رہی۔ خوف و بیم کی حالت میں منتظر

کھڑا رہا۔ دل زور زور سے اچھلتا رہا۔

مگر پھر دھیرے دھیرے بے چینی کی جگہ مایوسی نے لے لی اور شوق تذبذب کی کیفیت یاس و حسرت میں بدل گئی۔ مجھے دل نے یقین کر لیا کہ وہ سو گئی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں بھی بوجھل بوجھل قدموں سے اندر آ گیا۔ اور خاموشی سے لیٹ گیا۔

مگر نیند نہ آئی۔ طرح طرح کے خیال آتے رہے اور کروٹیں بدلتا رہا۔ ڈھائی بج گئے تو میں دوبارہ اٹھا اور باہر آ گیا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا۔ لائٹ جل رہی ہے۔ ناہید جاگ رہی ہے اور چھت کو گھور رہی ہے۔ میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اب طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ تبسم سو رہی ہے۔ ناہید آ کیوں نہیں جاتی۔ آخر سوچ کیا رہی ہے۔ نیند میری طرح اسے بھی نہیں آ رہی---- پھر خیال آیا۔ وہ خود کیسے آ جائے۔ عورت ہے۔ حیا اور حجاب بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

ناہید کا سارا ماضی میرے ذہن کے پردے پر سے گزر گیا۔

"وہ کبھی نہیں آئے گی"۔ کسی نے چپکے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔ شاید مجھے ہی جانا ہو گا۔

اتنی رات گئے لائٹ کا جلنا' چھت کو یوں گھورنا۔ بلانا نہیں تو اور کیا ہے۔ ہاں مجھے جانا ہی ہو گا۔

ارادہ کرتے ہی ایک لمحہ کے لئے میں کانپ سا گیا۔ تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔
مگر پھر ایک انجانی قوت کا سہارا لے کر میں سیڑھیاں اتر گیا۔

چاروں طرف دیکھا۔ اچھی طرح جائزہ لیا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ واجد صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا جو موسم کے لحاظ سے خلاف معمول بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ مگر رات کے اس سمے واجد صاحب کے جاگنے یا اٹھنے کی کیا تک تھی۔ میں آگے بڑھا اور ہولے سے ناہید کے کمرے کے دروازے کو دستک دی۔

ناہید چونک کر بستر سے اچھل پڑی۔ اور دوسرے لمحے کمرے کی بتی بجھ گئی۔ میں سہا ہوا کھڑا تھا۔

واجد صاحب باتھ روم جاتے وقت غالباً" ناہید کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ چکے تھے۔ مگر اب گھپ اندھیرا تھا۔ اس تبدیلی سے وہ چونکے تو نہیں تھے' مگر اس کا خیال انہیں ضرور آیا تھا۔ شاید اسی خیال کے تحت انہوں نے کمرے کی طرف دیکھا تو انہیں دروازے پر کوئی سایہ سا نظر آگیا۔

ناہید یا تبسم سمجھ کر وہ اس طرف بڑھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سائے کو مخاطب کریں---- قدموں کی چاپ سن کر میں تیزی سے پلٹا اور بے اختیارانہ بولا۔

"کون؟"

نوجوان بیٹیوں کے کمرے کے دروازے پر اتنی رات گئے مردانہ آواز سن کر وہ غصے سے چیخے۔

"میں اس گھر کا مالک ہوں۔ یہ سوال مجھے کرنا چاہیے؟"

گھر کا مالک للکار رہا تھا---- میں نے واجد صاحب کو پہچان لیا۔ مگر میری ہمت جواب دے گئی۔ بھاگوں تو کہاں؟ مرنا چاہوں تو کیسے؟ مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

شاید ذلت میرے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

میں پتھر کی طرح بے حس ہو چکا تھا۔

واجد صاحب نے برآمدے کی بتی آن کر دی---- میں بت بنا کھڑا تھا۔ حیران اور پریشان۔ اور واجد صاحب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم میں جان نہیں ہے۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں---- یہ لمحہ موت سے زیادہ سنگین تھا۔

واجد صاحب بھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ میں آج رات یہیں سویا ہوں۔ لیکن اس لاعلمی کے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ اگر انہیں میری موجودگی کا علم ہوتا تو وہ یہ بھی برداشت کر لیتے کہ اتنی رات گئے کوئی اجنبی ان کی نوجوان بیٹیوں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

واجد صاحب کی حیرت کم ہوئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ چیخے۔

"ذلیل۔ کتے' یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

مگر میں اسی طرح خاموش کھڑا تھا۔ جیسے مر چکا ہوں۔

"بولتے کیوں نہیں کمینے آدمی"۔ انہوں نے مجھے زور سے آگے پیچھے ہلایا۔ مگر میں کچھ نہ بولا۔ اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر واجد صاحب کو دیکھتا رہا۔ واجد صاحب کو اور زیادہ غصہ آگیا۔ انہوں نے بڑی بے دردی سے تڑاخ تڑاخ میرے منہ پر طمانچے رسید کئے۔

"گونگا ہو گیا سالا"۔

ناہید دروازے کی طرف لپکی۔ مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ تبسم جاگ اٹھی تھی۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

واجد صاحب پھر غرائے۔

"نکل جاؤ بے غیرت!" انہوں نے زور کا دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پانچ چھ قدم پیچھے چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے منوں زنجیریں میرے پاؤں میں باندھ دی ہیں اور جب تک دھکے دے دے کر مجھے باہر نہ نکالا جائے گا۔ میں خود اپنے طور سے حرکت نہیں کر سکوں گا۔

اتنے میں ناہید کی والدہ آگئیں۔ اور واجد صاحب کو پکڑ کر اندر لے گئیں۔ لیکن میرے لئے ان کی موجودگی یا غیر موجودگی گویا ایک برابر تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اب بھی مجھے دھکے دے رہا ہے۔ فضا میں گالیاں اب بھی جھنجھنا رہی ہیں۔ یہ عجیب عالم تھا۔

من من کے قدم اٹھائے میں کوٹھی کے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن کوٹھی سے پھاٹک تک کا فاصلہ گویا پل صراط کو عبور کرنا تھا۔

یہاں سے زندگی موت کی طرف بڑھتی تھی یا موت زندگی کی تاک میں تھی مجھے

کوئی خبر نہ تھی۔

یہ زندگی کا ایسا موڑ تھا جس نے میرا احساس گونگا کر دیا تھا۔ جس نے میرا علم اندھا اور بہرہ کر دیا تھا۔

آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ کوئی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اور میں صرف سلیپنگ سوٹ پہنے ہوا تھا۔

پھاٹک کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو معاً ایسا لگا جیسے میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو---- میں چونکا۔

لیکن مڑ کر نہ دیکھا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کوئی ہولے سے بولا۔

"ندیم!"

آہ---- یہ آواز تھی یا اندھیری رات میں کوئی بھولا بھٹکا جگنو چمکا تھا۔ سماعت سے زیادہ تو بصارت کو اس آواز نے متاثر کیا تھا۔

یہ ناہید تھی---!

یا اللہ---- قیامت کی اس گھڑی میں کوئی ایسا بھی ہے، جس نے مجھے موت کی وادی سے واپس آنے کے لئے پکارا ہے۔

ناہید اس لمحے سچ مچ میرے لئے کائنات کی سب سے عزیز ترین متاع تھی۔ میں نے پہلی بار بغیر کسی خوف اور جھجک کے ناہید کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ چند لمحے خاموشی طاری تھی۔ پھر میں نے کہا۔

"جاؤ چلی جاؤ۔ ناہید! جاؤ چلی جاؤ"۔

"نہیں!" وہ ایک بھرپور دعویٰ سے بولی۔ "اس بھیانک رات میں آپ کہیں نہیں جا سکتے!!"

"مگر ناہید----"

"چھوڑیئے"۔ اس نے میری بات کاٹ لی۔ "جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ اس وقت میں زندگی کے سارے اقدار کو جھٹک کر آپ کے پاس آئی ہوں!"

"ناہید!" میرے ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

"ہاں ندیم---- اگر ڈیڈی نے کچھ کہا۔ تو میں صاف صاف کہہ دوں گی کہ آپ خود نہیں آئے تھے۔ میں نے بلایا تھا آپ کو!!"

میں ناہید کی جرات پر انگشت بدنداں رہ گیا۔

"ناہید تم ایسا کہہ دو گی---- کہہ دو گی ایسا؟"

"ہاں! ایسا کہنا اب میرے لئے کچھ مشکل نہیں رہا۔ اس سے زیادہ صحیح اور موزوں وقت پھر کبھی نہیں آئے گا"۔

یہ عورت کا ایک نیا روپ تھا جو میں نے آج زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ توہین جیسے میری نہیں اس کی ہوئی تھی۔ اور اس کا انتقام بھی اسی کو لینا تھا۔ میں نے ناہید کی عقیدت سے سرشار ہو کر کہا۔

"ناہید تم مجھے اس وقت اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ اپنی توہین کی اب مجھے فکر نہیں رہی۔ اب مجھے تمہاری عزت کی حفاظت کرنی ہو گی۔ تمہارے سلوک نے شدت غم کو لذت الم میں بدل دیا ہے۔ آج سے میں ایک نیا جذبہ، نئی خوشی اور ایک نیا سندیسہ لے کر زندگی کے بازار میں نکلوں گا"۔

ناہید نے نہ صرف میرے لہجے سے بلکہ میرے ہاتھوں کی جذباتی گرفت سے بھی اس جذبے کو محسوس کیا۔ بولی۔

"کچھ بھی ہو۔ آج آپ نہیں جائیں گے۔ ورنہ زندگی بھر مجھے یہ ندامت ستائے گی کہ سماج کی مصنوعی آلائشوں کے لئے انسان زندگی کی سچائی سے منہ موڑ لیتا ہے"۔

میں خاموش رہا۔ مگر ناہید کی باتیں جگنوؤں کی طرح دیپ جلاتی رہیں۔

"ڈیڈی نے آپ کو ڈانٹا۔ یہ ان کا فرض تھا---- میں آپ کو روکوں یہ میرا فرض ہے۔ ان کا سماجی فرض بے حد بڑا سہی، لیکن میرا اخلاقی فرض اس سے بھی بڑا ہے۔ آج کی طرح موقع شاید جیون میں ایک آدھ بار ہی ملتا ہو گا۔ میں اتنی بدنصیب

نہیں ہوں کہ زندگی کے اتنے انمول فخر کو کھو دوں"۔

میں نے محسوس کیا کہ اب میرے پاس کہنے کو کوئی بات باقی نہیں رہی۔

"چلو ناہید۔ چلو۔!"

میر آواز فخر' غرور اور جذبات کی شدت سے بھرا گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ناہید نے لائٹ آن کر دی۔ تبسم اپنے پلنگ کی پائنتی سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

مجھے ندامت سی ہوئی کہ ایک اور معصوم ہستی بھی اس المیے میں ہمارے ساتھ شریک تھی۔

ناہید نے اوپر کے کمرے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ بیٹھ جایئے نا"۔

میں ناہید کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تبسم نے اپنا کمبل کھینچ کر میری طرف بڑھایا۔

"یہ اوڑھ لیجئے بھیا۔ بہت سردی ہے"۔

اگرچہ مجھے اس وقت سردی نہیں لگ رہی تھی۔ مگر میں نے کمبل لے کر اوڑھ لیا۔ تبسم کے انداز تخاطب میں بے پناہ نرمی اور اپنائیت تھی۔ گھڑی بھر کے لئے مجھے اپنی مظلومیت پر پیار آ گیا۔ یہ نہایت ہی قابل رشک لمحے تھے۔ ایک ہی گھر میں نفرت اور محبت شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

"آپ لوگ بھی بیٹھ جائیں نا"۔

میں نے ناہید کی طرف دیکھا۔ دونوں بہنیں دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

تبسم کسی حد تک سہمی ہوئی تھی۔ لیکن ناہید کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔

کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ناہید بولی۔

"چلئے میں آپ کو اپنے کمرے میں چھوڑ آؤں"۔

اوپر کے کمرے کی بتی اسی طرح جل رہی تھی۔ ناہید نے پلنگ کے ساتھ میرے سلیپر دیکھے تو مسکرا پڑی۔

"آپ ننگے پاؤں اترے تھے۔ ننگے پاؤں واپس آ گئے"۔

"ہاں ناہید" میں گھمبیر ہو گیا۔ "مگر تم نے ننگے پن کا احساس ختم کر دیا ہے"۔

"اچھا اب آپ بتی بجھا کر سو جایئے۔ رات کافی بیت چکی ہے"۔

ناہید کے جانے کے خیال سے میں ایک دم چونکا۔

"ٹھہرو ناہید"۔

ناہید دروازے میں رک گئی۔

"ناہید!" میں جھجکتے ہوئے بولا۔ "رات تو گذر جائے گی مگر صبح کیا ہو گا؟"

ناہید مسکرائی۔ "صبح تو ہونے دو"۔

میں خاموش رہا۔ میری نگاہیں استفسارانہ انداز میں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بھی اسی انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں تبسم سو جائے تو میں آ جاؤں گی"۔

پھر وہ دھیرے سے دروازے کے پٹ بند کر کے چلی گئی۔۔۔۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ جو کچھ وہ کہہ گئی تھی۔ وہ اتنا غیر معمولی تھا اور اتنا غیر متوقع کہ میں گھبرا گیا۔ خوشی اور خوف نے بیک وقت مل کر مجھ پر دھاوا بول دیا تھا۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔

سپیدۂ سحر نے پراسرار تاریکی کا سینہ دھیرے دھیرے چاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اور ناہید دنیا و ما فیہا سے بے خبر' گھتم گھتا میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

تبسم خلاف معمول بہن کو اپنے بستر پر نہ پا کر اوپر چلی ائی تھی۔ دستک سے ناہید کی آنکھ کھل گئی۔ میرا وجدان بھی جاگ رہا تھا۔ مگر میں نے آنکھیں نہ کھولیں۔ ملگجی روشنی میں ناہید نے دیکھا کہ میں اس کے بازو پر سر رکھے سو رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔

اس نے پہلے آہستہ سے اپنے پیر کھینچ کر الگ کر لئے۔ پھر داہنے ہاتھ سے ہولے سے میرا سر اٹھا کر اپنا بایاں ہاتھ کھینچ لیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ ناہید نے بڑے محتاط انداز میں بولٹ کھولا۔ ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر تبسم متذبذب انداز میں کھڑی تھی۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ بس بہن کو دیکھتی رہی۔ ناہید اس تذبذب کے مفہوم کو سمجھ گئی۔ بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں!"

تبسم ایک دو لمحے بہن کے مطمئن اور پرسکون چہرے کو دیکھتی رہی پھر چلی گئی۔

ناہید بہن کے اضطراب پر مسکرائی اور دروازہ دوبارہ بولٹ کر کے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔۔۔۔ مجھے یوں سوتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس نے مجھے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ پر اتنا قریب سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ رات کتنا بڑا داؤ لگا کر اس نے مجھے جیتا تھا۔

میں وجدانی طور پر اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا تھا۔ اور محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ اس شخص کو دیکھ رہی ہے۔ جس پر رات اس نے سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اور اسے اس پر ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔

اس نے بڑی عقیدت سے اپنی نرم نرم ملائم انگلیاں میرے بالوں میں ڈبو دیں اور پھر جھک کر میری پیشانی چوم لی۔۔۔ وہ مسکرائی۔ ہاں یہی تو وہ آدمی ہے جس نے رات پہلی بار اس کے کنوارے لبوں کو چھوا تھا۔ کتنی چاشنی، کتنی گرمی اور کس قدر لذت آگیں لمس تھا یہ۔

زندگی میں پہلی بار یہ انوکھی خوشی اور وارفتگی اسے اسی شخص نے بخشی تھی۔

اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر ہولے سے بولی۔

"اٹھیئے حضور صبح ہو گئی ہے"۔

میں نے انگڑائی لی۔ مگر آنکھیں نہ کھولیں اور کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ ناہید ہنس پڑی۔

"پگلا!"

اور اب اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر پیار سے جھنجھوڑا۔

"اٹھیئے جناب! سورج نکلنے والا ہے۔ یہ ناہید کا نہیں واجد صاحب کا گھر ہے"۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے چہرے کو یوں ناہید کے ہاتھوں میں دیکھا تو مسکرا پڑا۔ وہ کس عقیدت اور پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے میں بھی اسے غور سے دیکھتا رہا۔۔۔ یہ وہی لڑکی تھی جس نے رات باپ کے فرض کو للکارا تھا، جس نے رات میری ندامت کو سہارا دیا تھا اور جس نے رات مجھ پر سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ اور پھر اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ بے حد پیار سے بولی۔

"میں اب جاتی ہوں۔ آپ اس وقت تک کمرے سے نہ نکلیں جب تک ڈیڈی دفتر نہیں چلے جاتے"۔

"اچھا!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ڈیڈی چلے جائیں گے تو میں پھر آؤں گی"۔

"مگر ناہید، امی تو گھر میں ہوں گی۔ میں ان کا سامنا کیسے کروں گا"۔

"ان کی فکر نہ کرو۔ مائیں ہزار ڈانٹیں۔ ان کا راستہ بیٹیوں سے مختلف نہیں ہوتا"۔

"مگر مجھے تو شرم آئے گی"۔

ناہید ہنس پڑی۔ وہ بے حد موڈ میں تھی۔

"آپ کو شرم آئے گی۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ بری بات تو تب تھی۔ اگر آپ کو شرم نہ آتی"۔

میں بھی ہنس پڑا۔

"آج تو تم میری جگہ خود ڈائیلاگ بول رہی ہو"۔

"اس لئے کہ آج آپ' آپ نہیں رہے اور میں' میں نہیں رہی"۔

میں نے اسے سینے سے لگایا اور چوم لیا۔

"ارے اب چھوڑیئے بھی"۔ وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ "کہیں تبسم پھر نہ آ جائے"۔

میں مسکراتا رہا۔ ناہید کے اس نئے تعارف پر حیران بھی تھا۔ اور خوش بھی' ہزار پردوں میں چھپی ہوئی لڑکی آج کسی قدر شوخ اور چنچل ہو گئی تھی۔

"دیکھئے۔ بس چپکے سے لیٹے رہئے۔ آج میں اور تبسم بڑے اہتمام سے ڈیڈی کو دفتر بھیجیں گے"۔

دروازہ کھول کر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"دروازہ میں باہر سے بند کر دوں گی۔ گھبرایئے گا نہیں"۔

ناہید نے ہنستے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک کھڑکی کا پردہ کھینچ کر باہر دیکھا۔ آج مطلع صاف تھا۔ نیلے آکاش پر سورج چمک رہا تھا۔ بے انتہا بارش ہونے کے بعد موسم نکھر گیا تھا۔ پھولوں میں پانی لگ چکا تھا۔ فرش دھل گئے تھے۔ اور نالیاں صاف ہو گئی تھیں۔



مسلسل ملاقاتوں نے زندگی کی تڑپ چھین لی۔

اس والہانہ پن کو جانے کون سا شیش ناگ ڈس گیا؟

جس سے زندگی عبارت تھی۔ وہ بھید کون چرا کر لے گیا؟

پیار خاموش' محبت چپ--- اس سکوت مرگ میں کتنے دردناک نوحے کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

ناہید روز آتی ہے۔ روز جاتی ہے۔ مگر انتظار کی آتما سسک رہی ہے اور جدائی کا غم مر گیا ہے--- نہ تڑپ نہ چاہ' نہ تمنا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ صرف احترام زندہ ہے۔

اس لڑکی کا احترام' جس نے ایک اندھیری رات میں اس کے لٹے ہوئے وقار کو سہارا دیا تھا--- یہ رشتہ نہ ہوتا تو باقی ہر ناطہ ٹوٹ چکا تھا۔

مجھے اس کا خود بھی صدمہ تھا۔ یہ سب رشتے کیسے ٹوٹ گئے۔ مجھے اس کا خود بھی غم تھا۔ یہ سب ناطے کیونکر بکھر گئے۔ مجھے اس کا خود بھی احساس تھا۔ ریشمی گرہیں بھی کھلتی ہیں۔ پیار کے ناطے بھی کبھی ٹوٹتے ہیں۔ روح کے رشتے بھی کبھی دھوکہ دیتے ہیں--- کیا لہو کے ایک قطرے کی کہانی کا نام محبت ہے؟

کیا ابلتے ہوئے جذبات کا نام پیار ہے؟

کیا میں ناہید کے لئے تڑپا نہیں تھا؟ کیا مجھے ناہید سے عقیدت نہیں تھی؟

مجھے ناہید سے عقیدت تھی۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ مجھے اس سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا—— پھر یہ کیا ہو گیا؟

اب وہ تڑپ کیوں نہیں رہی؟ وہ قدر و منزلت کہاں چلی گئی؟ میں نے تو اسے شمسہ کے برابر عزت دی تھی۔ میں نے ناہید کو بھی اتنا ہی چاہا تھا' جتنا شمسہ کو۔

پھر وہ جذبہ' وہ احساس کہاں غائب ہو گیا۔

میں نے یہ سوال اپنے دل سے پوچھے۔ اپنے دماغ سے' اپنے ضمیر سے پوچھے۔ مگر ہر طرف سکوت تھا—— خاموشی تھی—— فرار و گریز کے سوا کوئی قدر آڑے نہیں آ رہی تھی۔

شروع شروع میں میں نے مرد اور عورت کے باہمی رشتے کو زندگی کی لازوال خوشی سمجھا۔ جیون کی لافانی مسرت قرار دیا۔ مگر دھیرے دھیرے اور بتدریج اس کی اہمیت گھٹتی چلی گئی—— وہ خواہش جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب سرد اور بے جان ہو چکی تھی۔ اب نہ وہ گرمجوشی تھی—— نہ وہ سرشاری تھی اور نہ وہ سرخوشی—— بس ایک بعد کی سی کیفیت تھی جو میرا دامن کشاں کشاں کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جا رہی تھی—— ایک سناٹا تھا' جس کا جگر چیرنے سے میں قاصر تھا۔

وہ ناہید جس کا انگ انگ پکارا کرتا تھا۔ میری نظروں میں گونگی ہو گئی تھی۔ وہ ناہید جس کی دلکشی زہد شکن سمجھی جاتی تھی۔ اب مجھے متاثر کرنے کی اہل نہ رہی تھی۔

میں سوچتا۔ کیا ناہید کی دلفریبی کم ہو گئی ہے۔ کیا اس کی جادو بھری آنکھوں کا طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ اور کیا اس کے ہونٹوں کا فسوں ختم ہو گیا ہے؟

میرا من کہتا "نہیں!"

ناہید آج بھی دلنواز ہے۔ وہ آج بھی لاکھوں دلوں کو مسخر کر سکتی ہے۔ وہ اپنی ایک مسکراہٹ سے آج بھی قیامت برپا کر سکتی ہے!

تو پھر وہ میرے لئے کم درجے کی چیز کیوں ہو گئی؟ اب میں اس کے انتظار میں لذت اور بے کلی کیوں محسوس نہیں کرتا—— وہ نہ آئے تو اس کے لئے بے چین کیوں نہیں ہوتا؟

یہی نا' کہ ذہنی رفاقت کا پڑاؤ عبور کر کے جنسی رفاقت کی منزل پر پہنچ گئے۔ اتنی سی بات کی اتنی بڑی سزا کہ جیون کی ساری تڑپ چھن جائے۔ کہاں کا انصاف ہے؟ وہ حسن' وہ روپ' خون کے چند قطروں کے سامنے ہار جائے۔ کتنا بڑا المیہ ہے——!

آج یہ ناہید کے ساتھ ہوا۔ کل شمسہ آئے گی تو کیا اس کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہو گا۔ پھر زندگی میں باقی کیا رہ جائے گا؟

فطرت ایسی ظالم کیوں ہے کہ جیون کی ساری چمک ایک قطرۂ خون کے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

میں نے سوچا۔ اگر لیلیٰ مجنوں کے حوالے کر دی جاتی اور پانچ برس کے بعد وہ چار بچوں کا باپ اور لڑھکتے ہوئے سینوں والی لیلیٰ کا شوہر ہوتا تو عشق کا رمز سمجھ جاتا۔ اگر فرہاد کو تیشے سے سر پھوڑنے کی بجائے شیریں سپرد کر دی جاتی۔ تو آج عشق و محبت کی تاریخ کبھی نہ بنتی۔

عورت نہ ملے تو مرد کوہ کن بن کر پہاڑوں کا جگر چیر لیتا ہے۔ پھر ہم نے عورت کا نام محبت کیوں رکھ چھوڑا ہے؟ ہم جنسی ملاپ کی نارسائی کو پیار کیوں کہتے ہیں۔ ہم صاف تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ محبت ایک فریب ہے دھوکہ ہے۔

ہم عورت سے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں جب تک وہ میسر نہیں آتا ہم محبت کہہ کر اس کے لئے تڑپتے ہیں۔ اس کے لئے پریشان ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ ہمیں ملتی ہے۔ ہم اسے حاصل کر لیتے ہیں تو تب یہ راز فاش ہوتا ہے کہ ہمیں محبت

نہیں، محبت کے روپ میں دراصل ایک عورت کا جسم ملا ہے۔ اس جسم کو روٹی کی طرح استعمال کرے تو بھوک مرجائے گی۔ پانی کی طرح پیو تو پیاس بجھ جائے گی۔ بھوک مرنے کے بعد روٹی اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد ایک نوالہ بھی بار ہو جاتا ہے۔ پیاس بجھ جانے کے بعد ایک گھونٹ بھی امتحان ہو جاتا ہے۔

اب اگر اس روٹی کو کل پر ادھار رکھو کہ جب پھر بھوک لگے گی تو کام آئے گی۔ مگر کل تک تو یہ باسی ہو جائے گی--- اس کا مزہ گرم گرم تازہ روٹی کی طرح نہ ہو گا۔

میں نے یہ سب کچھ سوچا۔ خود سے بار بار یہ سوال کیا کہ کہیں میں اپنی جذبات پرستی کو محبت کا نام دے کر دھوکہ تو نہیں کھا رہا۔ جنسی اختلاط کو محبت کہہ کر اس ارفع اور مقدس جذبے کی توہین تو نہیں کر رہا؟

مگر نہیں۔

میں ناہید سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ میرے دل میں اس کا احترام تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آتا تھا--- مگر وہ بے چینی، وہ بے کلی، وہ کشش اب باقی نہیں رہی تھی۔ جو کبھی خود میرے لئے باعث فخر تھی۔

کیا وہ جسم جو بہت گداز تھا۔ وہ ناک جو بے حد حسین تھی اور وہ ہونٹ جو بے حد رسیلے تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ ترغیب و تحریص کا خوشگوار تاثر پیدا کر کے ایک جنسی اختلاط کا ماحول تشکیل کریں۔ اور جب اس تشکیل شدہ ماحول میں جنسی عمل اپنی آخری شکل اختیار کر لے۔

تو حسن بھی اپنا تاثر ختم کر دے!

یہ عجیب تجربہ تھا۔

اور انوکھا المیہ بھی۔

فطرت آخر ایسا کیوں چاہتی ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے۔ یہ تڑپ دائم و قائم کیوں نہیں رہتی۔ بے وفائی اور فرار کے لئے خود اسباب کیوں پیدا کرتی ہے وہ دلوں

کی لگن اور روحوں کے وصال کا مذاق کیوں اڑاتی ہے---؟

یہ سب کچھ محسوس کرنے کے باوجود میں نے ناہید کے دل کا راز ابھی نہیں پایا تھا۔ ناہید کے احترام کی وجہ سے میں اب تک محبت کا ڈرامہ کھیلے جا رہا تھا۔ ممکن ہے ناہید بھی میری طرح سوچتی رہی ہو۔ اس کے احساسات بھی میری طرح ہوں۔ ممکن ہے وہ میرا دل رکھنے کے لئے ڈرامہ کھیل رہی ہو

آخر وہ بھی انسان ہے۔ وہ بھی تو اس فطرت کا شکار ہو سکتی ہے--- وہ تو پہلے ہی فطرت کا شکار ہے کہ اللہ نے اسے مرد کی طرح مضبوط ہاتھ پاؤں نہیں دیئے۔ مرد کی طرح عزم صمیم نہیں دیا اور اس کے کمزور شانے مرد کے مضبوط کندھوں کی طرح بار اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ لہٰذا معاشی مجبوریوں نے اسے مرد کا محتاج بنا کر اس کی زبان پر پہرے بٹھا دیئے ہیں اور وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے قابل نہیں رہی--- اس لئے ممکن ہے کہ میری طرح ناہید بھی اپنے کھچاؤ اور فرار کا اقرار و اظہار نہ کرے۔

لیکن ناہید تو میرے مقابلے میں معاشی طور پر بھی مجبور لڑکی نہیں تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ اور سماجی طور پر اس کا ایک رتبہ تھا۔ اور جو جنسی عمل اور سیری کے بعد ردعمل کے اظہار کے لئے صاحب اختیار تھی۔ وہ جب چاہتی مجھے چھوڑ سکتی تھی۔ جب چاہتی مجھ سے الگ ہو سکتی تھی۔

مگر نہیں----

ناہید کے رویے میں تو روز بروز مزید پختگی آ رہی تھی۔ سب کچھ لٹا کر گویا اس نے مجھے خرید لیا ہو۔ اس کی بے نیازی میں بھی رکھ رکھاؤ اور عقیدت ہوتی۔ اور اس کی بے اعتنائی میں بھی اپنائیت اور دعوے کی روح ہوتی۔

بعد کی ملاقاتوں میں اس کی اس ذہنی تبدیلی کو اور زیادہ پختہ کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ منگنی ہوتی ہے، شہنائیاں بجتی ہیں اور شادی ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر دوشیزگی کا جام ٹوٹتا ہے۔ مگر اس نے تو کسی بات کا انتظار نہ کیا اور نہ سماج اور رسم و

روایات کی پروا کی۔

گویا اس کی قربانی بڑی تھی۔ اور ایک رسمی بیوی کی نسبت اس کا رشتہ زیادہ گہرا تھا۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں مجھ پر اپنا حق جتانے لگی تھی۔

ہو سکتا ہے۔ اس کی جھولی بھی بے کلی کی دولت سے خالی ہو گئی ہو۔ جنسی آسودگی کے بعد ایک فاصلے کا احساس اسے بھی ہوا ہو۔ لیکن یہ سوچ کر صبر کر بیٹھی ہو کہ جس مرد کے لئے باپ کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ اسے اپنا بنا کر چھوڑے اور جس مرد کے لئے اس کے دامن پر بدنامی کا دھبہ لگ گیا ہے۔ اس کی خاطر ہمالہ سے بھی ٹکرا لینے سے دریغ نہ کرے۔

ایسے میں عورت نہ محبت کے لئے لڑتی ہے اور نہ جذبات کا شکار ہوتی ہے۔ بلکہ اپنی آن کے لئے مرمٹنے میں شان سمجھتی ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ مرد سے زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ ثابت قدم رہتی ہے۔

ایک طرف عورت کی انتہا پسندی کی یہ شان تھی۔ دوسری طرف میں سوچ رہا تھا کہ ناہید کا جسم حاصل کر کے ناہید کی تڑپ سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ کل شمسہ سے شادی کر کے اس کی تڑپ بھی کھو بیٹھوں گا----- کیا کوئی ایسی صورت ممکن نہیں کہ یہ سدا زندہ رہے۔ چاہت سدا قائم رہے۔ وہ مجھ سے شادی نہ کرے۔ میں اس سے شادی نہ کروں۔ مگر ہم زندگی بھر ایک دوسرے کو چاہتے رہیں۔

اگر جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے میرے لئے عورت کا اور اس کے لئے مرد کا ساتھ ضروری ہو تو ہم شادی کا ڈھونگ بھی رچالیں۔ وہ اپنے شوہر کے لئے بچہ پیدا کرے۔ میں اپنی بیوی کی گود ہری کروں۔ مگر ہمارے پیار پر کسی اور کا حق نہ ہو۔

وہ پیار جو صرف ہمارا ہے۔ جسے ہم نے جنم دیا ہے۔ جس کے خالق ہم ہیں کسی اور کو کیسے دے سکتے ہیں۔ یا شادی کے دھوکے میں ان کا گلا کیوں گھونٹ سکتے ہیں۔

بے شک میں نے شمسہ سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اس پگلی کو کیا معلوم

کہ ایفائے عہد کا انجام کتنا الم ناک ہو گا۔ وہ ناتجربہ کار لڑکی کیا جانے کہ زندگی پیار کے فریب میں کیسے کیسے دھوکے کھاتی ہے۔

مگر اصل بات تو یہ تھی کہ میں شمسہ کو یہ بات کیونکر سمجھاؤں' جس لڑکی نے اپنی مختصر زندگی میں خوابوں کے اونچے اونچے سنہری محل تعمیر کئے ہوں۔ وہ انہیں اپنے ہاتھوں مسمار کرنے پر کیسے آمادہ ہو گی۔

خود شمسہ کی فرقت میرے لئے بھی گراں تھی۔ مگر اس سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ میں شمسہ کو دائمی جدائی کا پیغام سنانے کا دل گردہ کہاں سے لاؤں گا؟

اس مسئلے پر دنوں کڑھتا رہا۔ ہفتوں سوچتا رہا۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ بلا کم و کاست سب کچھ اسے صاف صاف کہہ دوں' چنانچہ میں نے اسے خط لکھ دیا۔

"شمسہ جی!

کوئی نئی بات سنو تو رونا نہیں۔ اس لئے کہ میں تمہارے پیار کی صداقت سے انکار نہیں کرتا۔ تمہاری محبت میرا ایمان ہے۔ میں اپنے ایمان سے غداری نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں دکھ دے سکتا ہوں مگر دھوکہ ہرگز نہیں۔ میں تمہیں یاس و محرومی دے سکتا ہوں--- مگر شک و شبہہ ہرگز نہیں---- نہ تم پر میرا اعتماد متزلزل ہوا ہے اور نہ تمہارے نزدیک میرا اعتماد مشکوک ہو سکتا ہے۔

مگر اس کے باوجود مجھے کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ کہنا ہے۔

شمو! مجھے یاد ہے۔ جب میں سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ شیخ سعدی کی ایک حکایت تھی۔ جس میں ہما کا ذکر تھا۔ میں اس سے پہلے ہما کے متعلق کوئی روایت نہیں جانتا تھا۔ استاد نے سمجھایا

کہ یہ ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جس شخص پر اس کا سایہ ہو جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ قسمت خود اس کے لئے حالات سازگار بناتی ہے اور ایک روز وہ تاج شاہی سر پر رکھ لیتا ہے۔

اس لمحے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی---

کاش! یہ پرندہ کسی دن مجھ پر سایہ کر دے۔ پھر استاد نے بتایا۔

اس پرندے کا آشیانہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں بستا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ بس جب تقدیر چاہتی ہے کسی قسمت کے دھنی کو تاج ہمایونی سے سرفراز کر دیتی ہے۔

اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے میرے ننھے سے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ کسی روز مجھ پر ہما کا سایہ ضرور ہو گا--- اور اگر ایسا نہیں ہو گا تو پھر میں خود ہما کی تلاش میں نکلوں گا--- ہمالہ کی چوٹی پر جاؤں گا۔ کوہ قاف کی طلسمی وادیوں میں جاؤں گا اور اگر اس کا آشیانہ کہیں ہوا میں معلق ہو گا میں اپنے روحانی شہپروں کے سہارے اس تک پہنچنے کی کوشش کروں گا--- میں کسی نہ کسی روز ہما کو ضرور پا لوں گا۔

یہ سوچتے سوچتے چپکے سے جوانی آ گئی۔

ہما کا خیال میرے خیال میں رچ بس گیا تھا۔ اور اب وہ بھی میری جوانی کی طرح حسین اور تنومند ہو گیا تھا۔ اب میرا شعور بھی نسبتاً" پختہ ہو گیا تھا۔ اور میرے ارادوں اور عزائم میں بھی استقلال آ گیا تھا۔

کہ ایک روز اچانک ہما اپنے نورانی شہپروں کے سہارے چپکے سے میرے سر پر اپنا ہمایونی تاج رکھ کر غائب ہو گیا۔

ہما نظر نہ آیا مگر تاج کی عظمت اور تقدیس چھوڑ گیا تھا۔ اس کے لافانی حسن سے میرا سینہ منور ہو گیا اور میرا احساس ایک انوکھی سعادت کے نشے سے مخمور ہو گیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ ہفت اقلیم کی دولت میرے قدموں میں لوٹ رہی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ میری مسرتوں پر جھوم رہا ہے۔ میری روح خوشیوں کے رتھ پر سوار تھے اور آکاش کے مکینوں سے گیتوں کی زبان میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔ یہ میرے جیون کی سب سے بڑی شبھ گھڑی تھی اور یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی دن تھا۔

یہی وہ دن تھا شمسہ' جب تم نے اپنی محبت کا نورانی تاج میرے سر پر رکھا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے ارض و سما کی سب سے بڑی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

جگ میں اس سعادت سے بڑھ کر اور کوئی سعادت نہیں تھی۔ اتنی بڑی خوشی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

بادشاہت اس مسرت کے مقابلے میں ہیچ تھی--- تاج شاہی کا وہ تصور جو ہما کے سائے نے میرے ذہن میں تخلیق کر رکھا تھا۔ سب تحلیل ہو چکا تھا۔ اب تم تھیں' اور تمہارا پیار تھا جو خود ہما تھا اور ظل ہما تھا۔

اب مجھے دنیا میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی تھی۔ میں مالا مال ہو چکا تھا۔ پیار کی سعادت حاصل ہونے کے بعد دنیا کی ہر خوش بختی کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود آج میں

تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔

تم تخیل پرست لڑکی ہو۔ تخیلات کی دنیا میں کھوئی رہتی ہو۔ تصورات سے محبت کرتی ہو۔ تم سوچتی ہو' تم سے محبت کرنے والا تمہارے لئے تڑپے۔ افسانوں اور ناولوں کے کرداروں کی طرح تمہاری جستجو میں ستاروں پر پہنچے اور ضرورت پڑے تو پاتال سے موتی چن کر لائے

شمو! تم خیالوں کے اڑن کھٹولے میں اڑنے والی آتما ہو۔

تم زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے خیالی آنکھوں سے دیکھنے کی عادی ہو۔ تم خطوط میں بھی ایسی ہی وارفتگی اور اضطراب کی طلبگار ہوتی ہو--- تم چاہتی ہو۔ خطوط روشنائی کے بجائے لہو سے لکھے ہوئے ہوں۔

بے شک--- تمہاری فطرت کا چمن انہیں امنگوں سے عبارت ہے۔ تمہارے تصور کی جنت ایسے ہی شگوفوں سے مہک رہی ہے۔ مگر شمو! زندگی چند رنگینیوں' چند خیالوں کا مجموعہ نہیں ہے۔

کبھی کبھی تصورات کے شیش محل زندگی کے ٹھوس حقائق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جایا کرتے ہیں۔

ڈرتا ہوں--- تمہیں اپنا کر تمہارے سپنوں کے موتی محل کہیں چور چور نہ کر دوں--- ایسا جان بوجھ کر نہ کروں گا۔ مگر میری معصومیت ہی اس کے اسباب پیدا نہ کر دے۔ مجھے علم ہی نہ ہو اور تمہارے نازک سے دل کا آبگینہ ٹوٹ جائے۔ قصور کسی کا بھی نہ ہو اور بے گناہی زندگی کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دے۔

میں سوچتا ہوں جب ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لیں گے تو کہیں جیون کے ان حسین سپنوں کا سحر ٹوٹ نہ جائے۔ کہیں ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو نہ دیں--- تمہاری بدلیوں میں بسائی ہوئی جنت کہیں تحلیل نہ ہو جائے؟

یہ اس لئے شمو! کہ تمہاری حساس طبیعت سے مجھے خوف آتا ہے۔ تمہاری نازک سی فطرت سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ جب سدا کے لئے ایک گھر میں ہمارے لئے رہنا مقدر ہو جائے گا اور تم ہر صبح اپنے پہلو میں کسی آسمانی ہیرو کے بجائے ایک گوشت پوست کے مرد کو سویا ہوا پاؤ گی تو شاید زندگی میں جمود سا محسوس کرو۔ ڈر ہے کہ وہ مرد جس کے تصور ہی سے تمہارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ روز مرہ کی چیز بن کر برف کی سل نہ بن جائے۔ وہ بوسے جن میں آگ کے شعلوں کی حدت اور مر مٹنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ ٹھنڈے گوشت کی طرح بے حس نہ ہو جائیں؟

شمو! تم روز صبح آنکھ کھلتے ہی ایک ایسے مرد کو دیکھو گی جس کے ماتھے پر تیور ہوں گے۔ جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں گے۔ جس کی شیو بڑھی ہوئی ہو گی اور جس کے چہرے پر دلفریب مسکان کی بجائے ایک نڈھالی کیفیت کی نحوست ہو گی۔ پھر شمو! پھر کیا ہو گا۔ تم اپنے تخیل کے شہزادے کو اس روپ میں دیکھ سکو گی؟

اس دور دیس کے حسین شہزادے کی قربت کا انجام کتنا الم ناک ہو گا۔ قابل رحم بھی۔ قابل نفرت بھی۔

تم بھی بے قصور ہو گی۔ میں بھی بے خطا ہوں گا۔ حقائق کے نشتر آشاؤں کی آتما کو چھلنی کر کے رکھ دیں گے۔

شمسہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ بے حد پیار کرتا ہوں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ چونکہ تمہیں پا کر کھو جانے کا خطرہ موجود ہے۔ اس لئے تمہیں پانے سے گریز کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔ تم سدا میری رہو۔ سدا میری محبت کا دم بھرتی رہو۔ میرے سوا کسی کے متعلق نہ سوچو۔ کسی کے لئے نہ تڑپو۔ تم میری روح میں گھل مل جاؤ۔ تاکہ میں تمہیں خوشبو کی طرح محسوس کرتا رہوں۔ لیکن۔

بوجھ بن کر میری قربت کی خواہش نہ کرو۔

شمسہ جی! قربت ہی پریم کو جنم دیتی ہے اور قربت ہی اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ تلوار کی طرح قربت کے بھی دو روپ ہیں۔ یہ ایک لمحے جیون کی حفاظت کرتی ہے اور دوسرے لمحے زندگی کی شاہ رگ کاٹ لیتی ہے۔

شمسہ! میں چاہتا ہوں۔ وہ تڑپ جو تمہاری محبت نے مجھے دی ہے۔ سدا میرے پاس رہے۔ اگر تم آ جاؤ گی تو میں بے مایہ ہو جاؤں گا۔ تمہیں پانے کے بعد تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل ہو جائے گی۔ پھر جینے کے لئے باقی کیا رہ جائے گا۔ بتاؤ شمو! پھر اتنی طویل زندگی کسی خواہش اور تمنا کے بغیر کیوں کر گزرے گی؟ کیوں کر بسر ہو گی؟

یا پھر یہ ہو گا تاکہ کوئی نئی تمنا جنم لے۔ کوئی نئی خواہش پیدا ہو۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا شمو! کہ قربت کے تاریک سائے پڑنے سے پہلے ہم سوچ لیں کہ اگر تم نے ایک شہزادے کا دھوکا

کھا کر دوسرے کی تلاش میں نکلنا ہے اور میں نے ایک خواہش کی تکمیل کے بعد کسی دوسری شہزادی کا دھوکا کھانا ہے تو پھر کیوں نہ ہم اپنی پہلی تمنا کو آخری بنا دیں——— قدم قدم پر فریب اور ٹھوکر کھانے سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم اپنے مقدس پیار کی حفاظت ایک دوسرے سے دور رہ کر کریں۔

میں انسانی فطرت کا بہت گہرا مطالعہ کرنے کے بعد تم سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں نے سوچا ہے شادی میں کسی ایسی لڑکی سے کروں جس سے میں صرف جنسی طور پر متاثر ہوں۔ میں پہلے ہی سے یہ بات اپنے دل میں بٹھا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہو گی۔ پھر وہ میرے لئے بوجھ نہیں بنے گی۔ کیونکہ وہ اناج کی طرح جینے کی ایک ضرورت ہو گی۔

تم بھی یہی سمجھ کر شادی کرنا۔ بلکہ یہ بھی کوشش کرنا کہ تمہارا شوہر میری طرح جذباتی نہ ہو۔ بلکہ صرف دنیاوی آدمی ہو۔ پھر نہ محبت کا دھوکا ہو گا اور نہ ذہنی اور روحانی طور پر کسی نقصان کا اندیشہ۔ اس کے لب و رخسار کا بوسہ جنسی تسکین حاصل کرنے کا محرک ہو گا۔ محبت اسے ہرگز نہ کہا جائے گا۔

محبت کے بوسے تو میں نے صرف شمسہ کے رخساروں کے لئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں بھی جنسی تسکین حاصل کرنے کا کوئی خفیہ رد عمل ہو۔ مگر میں بڑے خلوص سے اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہوں کہ میں نے وہ بوسے انتہائی عقیدت سے لئے تھے۔ میں اس عقیدت کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔

شمو! مجھے تم سے عقیدت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

یہ سچ ہے اس سے بڑا سچ دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ میری وفاداری میں ذرا بھی شک و شبہہ نہیں۔ تم ہی وہ آتما ہو جو میرے من میں امیدوں کے دیپ جلاتی ہو۔ تم ہی وہ لڑکی ہو جس سے میں نے دنیا میں سب سے زیادہ پیار کیا ہے۔ تم ہی وہ ہستی ہو جس پر میں اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کر چکا ہوں۔

شمو! تم مجھ سے اتنی ہی دور رہو۔ جتنا آسمان زمین سے دور ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے لاکھوں میل کے فاصلے پر ہیں لیکن اس فاصلے نے دونوں میں ایک ایسی تڑپ بھر دی ہے کہ دور افق پر ایک دوسرے سے گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں---- یہ فریب نظر ہے وہ کبھی گلے نہیں مل سکتے۔ لیکن ملنے کی خواہش میں ایک دوسرے کی طرف جھکے رہیں گے۔

میرا اور تمہارا رشتہ بھی زمین و آسمان کا رشتہ ہے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہیں تاکہ ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب رہ سکیں---- یہ رشتہ افق کی طرح ایک دھوکہ سہی۔ مگر اس سے آتما کو تسکین ملتی ہے۔

من میں تڑپ کے کنول کھلے رہیں تو زندگی بے حد حسین ہو جاتی ہے۔ غم جاناں سے بے نیاز قہقہے میں وہ گھمبیرتا نہیں ہوتی، جو مجروح مسکان میں ہوتی ہے۔ بسمل کی تڑپ پر تو کائنات کی روح گھائل ہو جاتی ہے۔

شمو! محبت کا وہ ہمایونی تاج جو تم نے میرے سر پر رکھا تھا۔ ملن کے دھوکے میں آ کر کبھی اسے اتارنے کی کوشش نہ کرنا۔

اگر ماتا دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے تو مرد اور عورت

کا پیار دنیا کی دوسری بڑی سچائی ہے۔ بشرطیکہ یہ جنسی خواہش کی تکمیل سے آلودہ نہ ہونے پائے۔

آؤ شمسہ! اس نقطے کو سمجھ کر سمجھوتہ کر لیں۔ اور ملن کے سارے مواقع کا سودا کر کے جدائی مول لے لیں۔ تاکہ پریم امر ہو جائے اور چاہت کا فردوسی تخیل کبھی مجروح نہ ہونے پائے"۔

نہیں----

نہیں---- نہیں----! شمسہ چیخ اٹھی۔ اس نے لکھا۔

"میرا پیار اتنا کمزور نہیں ہے۔ میرا دعویٰ اتنا بودا نہیں ہے۔ میری محبت مجھ سے چھن گئی تو میری چیخیں آسمان کا جگر چیر دیں گی۔ فطرت، فطرت، فطرت---- تم کس فطرت کی بات کر رہے ہو۔ وہ کون سی فطرت ہے جو پیار بھی کرتی ہے اور نفرت بھی کرتی ہے۔

نہیں---- کوئی نہیں۔ میں کسی فطرت وطرت کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ تم۔ تم۔ ندیم تم! تمہارے سوا ساری کائنات ہیچ ہے۔ تم نہ ہو گے تو چاروں افق تاریکی پھیل جائے گی۔

ابھی صور اسرافیل نہیں بجا۔ جس روز دنیا میں پیار نہیں رہے گا۔ صور اسرافیل بج اٹھے گا۔ وہ دن دنیا کا آخری دن ہو گا"۔

کوئی دلیل آڑے نہ آئی۔ شمسہ نے کوئی بات نہ سنی۔ اس نے لکھا۔

"تم فوراً کراچی چلے آؤ۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے ایک بار میرے منہ پر تو کہو۔ تمہاری ہمت تو دیکھوں۔ ذرا ان آنکھوں

میں تو جھانکوں۔

وہ اجلی اجلی آنکھیں۔ وہ روشن روشن دیپ۔ کیا ایک ہی پھونک سے بجھ جائیں گے؟ نہیں' ہرگز نہیں' قطعی نہیں--- میں مان ہی نہیں سکتی۔ میں سوچ ہی نہیں سکتی--- تم آ جاؤ۔

یہاں آ جاؤ۔ فوراً چلے آؤ ندیم---- ایک بار مجھ سے نظریں ملا لو---- تمہیں آنا پڑے گا ندیم۔ سب کام چھوڑ کر۔ ساری دنیا کو چھوڑ کر۔ ہر قیمت پر میں پل پل انتظار کروں گی۔

نہیں آؤ گے تو میں سر پھوڑ لوں گی۔ مر جاؤں گی۔

مگر تم کیوں نہیں آؤ گے۔ میں مروں گی کیوں---- تم مجھے کیسے مار سکتے ہو۔ تم مجھ پر کیسے وار کر سکتے ہو--- ندیم کا وار تو ہو چکا ہے۔ میرے دل پر' میری روح پر' میرے ایمان پر اب اور کیا وار ہو گا"۔

شمسہ کا انداز تخاطب نہ صرف دلچسپ تھا بلکہ بے حد جذباتی بھی۔ ہر لفظ نگینے کی طرح دمک رہا تھا اور ہر جملے سے جیون کا رس ٹپک رہا تھا۔

اس نے لکھا۔

"میں حیران ہوں ندیم! تم نے یہ سب کچھ لکھا کیوں کر---- میرے اچھے دوست۔ میرے نفیس ساتھی۔ میرے پیارے ادیب۔ یہ تمہارے من مندر میں کوئی دوسرا پجاری کہاں سے آن بسا ہے۔ یہ کون ہے۔ کون ہے۔ تم اس سے کیوں متاثر ہو گئے ہو ندیم---؟

ندیم! تم نے مجھے اپنایا۔ اپنے سینے سے لگایا۔ میری عصمت کی حفاظت کی۔ کیا اب میرے پیار کی حفاظت نہ کرو گے ندیم--- اس پیار کی جس کا میں نے ڈھنڈورا پیٹا۔ فخر سے'

غرور سے' شان سے! میرا مان ٹوٹ گیا تو خدا کا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔

نہیں۔ نہیں--- نہیں ندیم! یہ سب جھوٹ ہے۔ کہہ دو سب جھوٹ ہے--- جھوٹ ہی ہو گا۔ تم نے مجھے ستانے کے لئے یہ سب کچھ لکھا ہے۔ ورنہ میرا ندیم---- اور ایسی باتیں کرے---- وہ دودھ سے دھلا ہوا دل اور یوں اوٹ پٹانگ باتیں سوچے۔

میں کیوں مان لوں۔ کیسے یقین کر لوں۔ جو سنا تھا۔ اسے بھول جاؤں اور جو سن رہی ہوں۔ اس کا یقین کر لوں---- یہ کیسا احمقانہ فعل ہو گا۔ کل کا کہا نقش بر آب اور آج کا کہا پتھر کی لکیر---- غلط بالکل غلط۔ ایک دل' ایک انسان' ایک وقت میں ایک ہی کو چاہے گا۔ ورنہ پھر کسی کو بھی نہ چاہے گا۔

ندیم! یہ تم کیا کہتے ہو۔ گویا میں پھر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کروں۔ پیار تم سے کروں' شادی کسی اوز سے کر ڈالوں۔ یہ نئی بات سنی۔ روحانی رشتہ تم سے رکھوں اور بوسے کے رشتے کے لئے کوئی دنیاوی آدمی تلاش کروں۔ پگلے ہو بالکل پگلے۔

میں کسی ایسے مرد کا بوسہ کبھی نہیں لے سکتی۔ جس کو تصور میں پیار نہیں کرتی۔ مرد کی طرح عورت بھی اپنی تڑپ کے اظہار کے لئے بوسے کا سہارا لیتی ہے۔ کیا تم مجھے بوسہ لینے کی خواہش سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دو گے؟

دیکھو ندیم! ابھی تک میرے آنسو نہیں نکلے۔ تم سمجھو گے شاید اس لئے کہ تم نے رونے کو منع کیا ہے۔ نہیں یہ بات

نہیں۔

بات یہ ہے کہ میری شکتی مجھے سہارا دے رہی ہے۔ میرا پیار مجھے کہہ رہا ہے۔ تمہیں کوئی نہیں ٹھکرا سکتا۔ پیار بھی آج تک کسی نے ٹھکرایا ہے؟

ہاں تو سن لیا نا---- اس لئے میرے آنسو نہیں نکلے۔

اور میں روؤں گی بھی نہیں' چاہے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تب بھی میں تم سے گلہ نہیں کروں گی۔ بلکہ خود سے کہہ دوں گی۔

جا شمسہ---- تیرے من میں سچی چاہ ہی کب تھی"۔



میں خط لکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ شمسہ مان جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ شمسہ کو دکھ ضرور ہو گا۔ مگر وہ میری نیت اور خلوص کو پا جائے گی۔ مگر شمسہ کے خیالات سے میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس لئے نہیں کہ شمسہ نے میری نیت پر شبہ کیا تھا۔ بلکہ شمسہ کے خیالات نے اس کی وارفتگی کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ اب بات سوچنے کی یہ تھی کہ اگر میں شمسہ کو قائل نہ کر سکا۔ یا اس کی ضد کے سامنے ہارنا پڑ گیا۔ تب کیا ہو گا؟ تب زندگی کون سی منزل متعین کرے گی؟

چاہ کی یا آہ کی---- ملن کی یا جدائی کی؟

دوراہے پر کھڑا تھا۔

ایک طرف حسرت و یاس کی راہ تھی۔

دوسری طرف وصال و شادمانی کی۔

شمسہ کو یہ بات کیسے سمجھائی جائے----؟

جسمانی اختلاط کا انجام اور تجربہ میرا اپنا تجربہ تھا۔ میں اس تجربے کو شمسہ کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ اور پھر جب کہ شمسہ جنسی تجربے سے دوچار نہیں ہوئی پھر وہ میرے گریز و فرار کے معنی کیوں کر سمجھے گی۔ سودا کرنے سے پہلے' نقصان و زیاں کا

اندازہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ذہن صاف' ضمیر بے داغ اور دل مکدر نہ ہوا ہو۔ تو فرار کی راہ کوئی کیوں کر قبولے گا۔ نیکی کی تلقین اور راہ مستقیم پر چلنے کی ہدایت تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے لیکن اگر کسی سے کہہ دو--- "جھوٹ پن ہے اور سچ پاپ ہے!"

تو کیا کہنے والے کو پاگل نہیں سمجھا جائے گا؟

یا کسی سے کہہ دو--- "پیار جھوٹ ہے اور فرار زندگی ہے"۔

تو کیا کہنے والے کی نیت شبہہ سے بالاتر سمجھی جائے گی؟

ہرگز نہیں---- اس منطق کو سمجھنے کے لئے خوبصورت الفاظ کے سہارے کی نہیں تجربے کی ضرورت ہے--- ایسا تجربہ جو بالکل ذاتی ہو۔ خود انسان محسوس کرے۔ خود نتائج تک پہنچے اور پھر کوئی راہ عمل اختیار کرے۔

میں سوچتا--- نظام زندگی میں فطرت پسندی کے لئے داد و تحسین کی گنجائش کیوں نہیں رکھی گئی۔ فطری کشش کے شکار لوگ معاشرے میں گردن زدنی کیوں ٹھہرائے جائیں؟

بہت سے نئے نئے سوال جنم لے رہے تھے۔ بہرکیف میں ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر کراچی چلا گیا---- لہو کی طرح سرخ گلاب کے پھول شمسہ کو پسند تھے۔ میں ایک خوبصورت گلدستہ بنا کر بڑی حفاظت سے لے گیا۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ کمرے میں سامان رکھوا کر سب سے پہلے میں نے پھولوں پر پانی چھڑکا۔ پھر انہیں ایک گلاس میں سجا کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

میں نے شمسہ کو خط لکھا۔ ہوٹل کا ملازم خط لیٹر بکس میں ڈالنے میں بے احتیاطی یا دیر نہ کر دے۔ اس لئے نہائے دھوئے بغیر خط خود پوسٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ خط شمسہ کو کل صبح ملے گا اور وہ دوپہر کو مجھ سے ملنے آئے گی۔

پھر ایک بار دروازے پر دستک ہو گی' ہلکی سی' دھیمی سی' رومینٹک سی--- نہ جانے کون سا لباس پہنے ہو گی۔ مگر ایک دبلی سی لانبی سی لڑکی ہونٹوں پر دلفریب

مسکراہٹ پھیلائے اندر آ جائے گی۔ میں دیوانہ وار اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھوں گا۔ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگاؤں گا۔ مگر وہ اپنے نازک ہاتھوں کو ڈھال بنا کر مصنوعی غصے سے کہے گی۔

"ہٹیئے صاحب ہم سے بات نہ کیجئے"۔

مگر میں اس کے تیور کی پرواہ نہ کروں گا۔ اور اسے سینے سے بھینچ لوں گا۔ وہ ہلکا سا احتجاج کرے گی۔

"ارے تم تو میری ہڈی پسلیاں ایک کر دو گے"۔

پھر وہ ہنس پڑے گی۔ "بس اب چھوڑ بھی دو ندیم۔ خدا کے لئے"۔

تب میں اپنی گرفت ڈھیلی کر دوں گا۔ مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔ پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائیں گے۔ اور جب ایک آتما دوسری آتما کی سرگوشی کو پا لے گی تو پھر شمسہ کی باتوں کی چکی چل پڑے گی۔ اور یہ اس وقت تک چلے گی جب تک وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال نہ لے گی۔ اس سے پہلے کوئی بات نہ سنے گی۔

یہی سوچتے سوچتے میں باہر نکل گیا۔

رات کو جب واپس آیا۔ تو سب سے پہلے پھولوں پر چھڑکاؤ کیا۔ ذرا دیر کی خوشی جو پھولوں کو دیکھ کر شمسہ کی آنکھوں میں پیدا ہو گی۔ بس یہ اہتمام میں اسی لئے کر رہا تھا۔

صبح شیو کیا۔ تو دو دفعہ ڈاڑھی پر مشین پھیری۔ شمسہ کی عادت تھی۔ اکثر میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا کرتی تھی۔ چنانچہ یہ پیش بندی اسی لئے ہو رہی تھی کہ اس کے نرم نرم ہتھیلیوں میں بالوں کا کوئی کانٹا نہ چبھ جائے۔

پھول امید کے مطابق آج بھی تازہ تھے۔ ہاں پتیوں کی گرفت جڑوں سے کسی حد تک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ذرا سا ہاتھ لگنے سے پتیاں گر جاتی تھیں۔ پھر بھی میں نے بے حد احتیاط سے پانی بدلا۔ ہلکا ہلکا چھڑکاؤ کیا۔ شمسہ کو ایک بجے کے لگ بھگ آنا

تھا۔ پچھلی دفعہ بھی اسی ٹائم آئی تھی۔

دو بج گئے۔ ڈھائی بج گئے۔ اور پھر تین بج گئے۔ مگر شمسہ نہ آئی۔ میں بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ گھر کا پتہ تو یاد ہے۔ ممکن ہے کہیں شمسہ کی جھلک نظر آ جائے۔ یا وہ مجھے دیکھ لے۔ اشاروں کنایوں میں ہی بات ہو جائے۔

بھائی جان کا خطرہ بھی موجود تھا۔

لیکن صبح سے پل پل انتظار اور پھر مایوسی نے مجھے بے حد آزردہ اور نڈھال کر دیا تھا۔ بہرحال گومگو کی کیفیت میں باہر نکل گیا۔

لٹن روڈ پر پہنچ کر مجھے ہر گھر پر جج صاحب کے گھر کا شبہہ ہو رہا تھا۔ ہر بالکنی میں کھڑی لڑکی مجھے شمسہ لگ رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور چور نگاہوں سے ہر بالکنی کا جائزہ لے رہا تھا--- یہ احساس کہ اتنا تو جان جاؤں کہ جس لڑکی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں وہ اس گھر میں رہتی ہے۔ صبح و شام اس گھر میں سانسیں لیتی ہے۔ ان در و دیوار پر ہی نظر ڈال جاؤں جن کو شمسہ نے چھوا ہو گا۔

میں نے ایک پان والے سے جج صاحب کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اس نے بتایا۔

”وہ سامنے وہ اینٹوں کا جنگلہ ہے نا۔ سفیدی کیا ہوا۔ جس پر ریشمی لحاف پڑا ہے“۔

یا اللہ! یعنی اپنے محبوب کے قدموں سے صرف پچاس گز دور ہوں۔ لیکن دوسرے لمحے میرا دل دھک سے رہ گیا۔

سڑک کے اس پار فلیٹ کے نیچے ایک موٹر آ کر رک گئی تھی۔ یہ وہ کبوتری رنگ کی اوپل کار تھی جس میں ایک بار میں، شمسہ، پروین اور بھائی جان کلفٹن گئے تھے--- کار کے پچھلی سیٹ سے بھائی جان نکلے۔ انکی گود میں ایک ننھی منی بچی تھی۔ ساتھ ہی ایک گوڑی چٹی تومند اور خوبصورت عورت بھی اتری جس نے نظر کی سنہری فریم والی سبک سی عینک لگا رکھی تھی۔-- یہ غالباً” بھابی جان تھیں، جن کا ذکر

شمسہ نے کئی بار مجھ سے کیا تھا۔

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں نے سوچا۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ لٹن روڈ شمسہ کے گھر کے قریب ہی بندر روڈ سے مل جاتا تھا۔ میں بندر روڈ عبور کر کے سڑک کے اس پار ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جو شمسہ کے فلیٹ سے پچاس ساٹھ قدم دور ہو گی۔ جہاں سے بالکنی میں آنے جانے والوں کو میں باآسانی دیکھ سکتا تھا۔ مگر خود مجھے سڑک پر آنے جانے والوں کی بھیڑ کی وجہ سے کوئی دیکھ نہ سکے گا۔ اس لئے میں نے جانے کا خیال ترک کر دیا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد بھابی جان بالکنی میں آئیں۔ وہ بالکنی کے جنگلے پر بچوں کے دھوئے ہوئے کپڑے ڈال رہی تھیں۔

شمسہ نے ننھے پینو کی بڑی تعریف کی تھی۔ یہ پینو کی ماں تھی۔ اس لئے پینو اور پینو کی ماں سے اس کا بھی تو رشتہ تھا۔ اس خیال سے میرا دل ایک دعوے کے احساس سے بھر گیا۔ اس گھر میں ایک اور ماں رہتی ہے۔ جو میری بھی ماں ہے۔ اس گھر میں شمسہ کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ وہ میری بھی بہنیں ہیں۔ میں نے ان سب کو اپنے اپنے طور سے اپنے اپنے رنگ میں چاہا ہے۔

میں غیر نہیں ہوں اور نہ اس گھر کے لوگ میرے لئے اجنبی ہیں۔

معاً“ مجھے بھائی جان کا خیال آ گیا۔ شمسہ ضمیر بھائی کی بہن بھی ہے۔ اس اجنبی شخص کی بہن جس نے آج سے چھ ماہ پہلے مجھے ہوٹل میں چائے پلائی تھی۔ لیکن جس نے گھر پر ہونے والی دعوت پر اعتراض کیا تھا۔

میرے خیالوں کا مینار مسمار ہو گیا۔

بھابی جان کپڑے ڈال کر اندر جا چکی تھیں۔ اور میں وہیں کھڑا سوچ رہا تھا کل وہ مجھے چوروں کی طرح ملے گی۔ اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ لیکن آج ہم دو دوستوں کی طرح ملنے پر سب کو اعتراض ہے۔

خیالوں کے اندھیرے میں اچانک ایک جگنو چمکا--- ایک دبلی پتلی لانبی لڑکی

تولئے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی بالکنی کی طرف کھلنے والے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ میرا دل باہر آنے کے لئے یکبارگی اچھلا۔

ہو نہ ہو۔ یہ شمسہ ہے۔

لڑکی نے تولئے سے منہ پونچھا۔ پہلے لٹن روڈ کی چہل پہل کو دیکھا۔ پھر بندر روڈ کے ہنگامے کی طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر ہوا میں لہرایا۔ ایک بار، دو بار، کئی بار۔

وہ لڑکی جس کے متعلق میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ شمسہ ہے، ٹھٹھک سی گئی تھی۔ اور اس انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

چند لمحے یونہی کھڑی رہی۔ پھر شک و شبہہ کے انداز میں مڑی۔ اور اندر چلی گئی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ایک بار پھر آئے گی---- اور یہ یقین یونہی نہیں تھا۔ لڑکی بہت جلد دوبارہ بالکنی میں آ گئی۔ میں نے پھر ہاتھ لہرایا۔ لڑکی کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر جواباً اس نے کوئی اشارہ نہ کیا۔ اس نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا دوسرے لمحہ ایک اور سروقد حسینہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ میں نے فوراً نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ لیکن چند سیکنڈ بعد جب میں نے کنکھیوں سے ادھر کا جائزہ لیا تو وہاں چار پانچ عورتیں کھڑی تھیں۔ غالباً سلمیٰ، زاہدہ بھابی اور اماں سب آ گئی تھیں۔ شاید شمسہ نے انہیں بتا دیا تھا۔

میں اس توجہ پر گھبرایا۔ اور خوش بھی ہوا۔

شاید اماں کا بلاوا آ جائے۔

لیکن دوسرے لمحے میں نے دیکھا۔ ضمیر بھائی بھی سب کے ساتھ بالکنی میں کھڑے ہیں۔ اب میں واقعی گھبرا گیا۔

کہاں تو اس خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ اماں اوپر بلائیں گی۔ اور کہاں اب بھاگنے کی سوجھی۔ میں نے منہ پھیر کر سڑک پر دور تک نگاہ ڈالی۔ جیسے کسی کا انتظار

کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ اور اب جانا چاہتا ہوں۔ جلدی سے گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر چل پڑا۔ مگر ضمیر بھائی تو جیسے ارادہ بھانپ گئے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔

اب اس خیال سے پریشاں ہوا کہ وہاں اپنے کھڑے ہونے کی وجہ کیا بتاؤں گا۔ اور موہوم سی امید کہ شمسہ یا اماں کی ہدایت کے مطابق شاید وہ مجھے گھر لے جائیں۔ اس کے باوجود میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھا۔ میں خود کو بندر روڈ کے ہنگامے میں گم کر دینا چاہتا تھا۔

لیکن ابھی میں دس بارہ قدم ہی گیا تھا کہ میں نے اپنے شانے پر ایک محبت بھرے ہاتھ کی لمس محسوس کی۔

"ارے بھائی کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

میں کھڑا ہو گیا۔ اور مسکرا کر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ لیکن یہ مسکراہٹ کم، اور چیخ زیادہ تھی۔ ان فراری لمحوں میں میں اس آواز اور اس لمس کا متوقع تھا۔ میرا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور ذہن متضاد کیفیتوں کی آماجگاہ۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا پر بولا نہ گیا۔ بس چہرے پر خفت بول رہی تھی۔ زندگی میں کیسی کیسی موتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا۔ ایک لمحہ کے لئے خیال آیا۔ بھائی جان کے اس طرح اچانک ملنے پر حیرت کا اظہار کر دوں۔ مگر دوسرے لمحے خیال آیا کہ اس طرح مکاری کا رویہ اختیار کر کے خود کو اپنی نظروں میں بھی ذلیل کر دینے سے تو یہ ندامت ہی اچھی ہے۔ ضمیر بھائی میری شرمساری کو پا گئے بولے۔

"بھائی چائے تو پی کے جاؤ"۔

"چائے تو پی کر آ رہا ہوں"۔ میں نے جھوٹ بولا۔ لیکن ضمیر بھائی کے ساتھ چل پڑا۔

"کہیئے! اماں، شمسہ اور باقی سب ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں بھئی سب خیریت سے ہیں۔ مگر آپ کب آئے کراچی؟"

"مجھے تو دو تین دن ہو گئے ہیں"۔ میں نے پھر جھوٹ بولا۔ "بڑا ضروری کام تھا۔ اچانک آنا پڑا۔ اس لئے کسی کو خط بھی نہ لکھ سکا"۔

"ہاں شمسہ نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا"۔

ضمیر بھائی نے میری تائید کی۔ میرے قدم اب سنبھلنے لگے تھے۔ یہ احساس کتنا عجیب تھا کہ بھائی مجھے گھر لے جا رہے ہیں۔ شمسہ اپنے گھر کے ماحول میں مجھے دیکھ کر کیا کہے گی۔ کیا کرے گی۔ کیا سوچے گی---؟ اس کے زعفرانی چہرے پر کیا کیا احساسات، کیا کیا کیفیتیں رقص کریں گی؟

سلمیٰ، زاہدہ اور اماں جس سے شمسہ بے حد پیار کرتی ہیں۔ آہ۔ اماں کے بارے میں میرے جذبات کس قدر شدید تھے----- میری ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں ماں کے پیار کا بہت بھوکا تھا۔

مگر آہ--- بسا آرزوئے کہ خاک شدہ!

یہ ساری خوشی، سارے احساسات صرف پندرہ قدم کے مرہون منت تھے۔

سڑک کے اس پار ندامت تھی---- اس پار گھور اندھیرا۔

یہ فاصلہ صرف ایک منٹ کا فاصلہ تھا۔

وہ مہربان ہاتھ جس نے مجھے فرار کی اذیت سے نجات دلائی تھی۔ لمحوں میں اتنا بے رحم ہو گیا کہ میرا سب کچھ چھین لیا۔ ضمیر بھائی بولے۔

"افسوس ہے۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آیئے یہیں ہوٹل میں چائے پی لیتے ہیں"۔

گھر اور ہوٹل کا فاصلہ صرف دس قدم کا تھا۔

کاش! بھائی جان کے چہرے پر چشم بینا ہوتی۔ تو وہ میرے سینے میں جھانک کر دیکھ سکتے کہ وہ کس سے کس قسم کا سلوک کر رہے ہیں۔

مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ ہوٹل میں چائے پینے سے انکار کر دیتا۔ ایک سپیشل چائے کی پیالی میں میرا سارا غرور، ساری خودداری ڈوب گئی۔

صبح نہا دھو کر میں تیار ہو گیا۔

پھول مرجھا چکے تھے۔ ان میں جان باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی میں نے پھینکے نہیں۔ میں شمسہ کو دکھانا چاہتا تھا۔ دراصل اس رنگ میں میں اپنا دکھ اور دل کا زخم دکھانا چاہتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا "آ جایئے!"

دروازہ کھلا--- "ارے آپ!" میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آداب عرض!" پروین نے سلام کیا۔

"آداب عرض۔ آیئے بیٹھئے"۔

پروین کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئی تھی۔ اس کی صحت اور جسمانی تناسب میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ چائے کے لئے پوچھا تو بولی۔

"نہیں۔ ابھی شمسہ کے ہاں سے پی کر آ رہی ہوں۔ کل شام کو اس کا سندیسہ ملا تھا کہ آج صبح اس سے ملوں"۔

"خیرت تو ہے؟"

"خیریت کہاں"۔ وہ ہنس پڑی۔ "آپ جس روز شمسہ کا شدید انتظار کرتے ہیں۔ میں آ جاتی ہوں۔ ایک دفعہ پہلے بھی آئی تھی۔ تو آپ کو اچھی خبر نہیں سنائی تھی"۔

پروین نے بات اگرچہ ہنس کر کی تھی۔ مگر میرا دل دھڑکا۔ کل کے واقعے نے مجھے کافی خوفزدہ کر دیا تھا۔ پروین بولی۔

"دیکھئے۔ اس وقت وہ آپ سے نہ مل سکے گی۔ شاید شام کو چار پانچ بجے آپ سے ملنے آئے"۔

"شام کے چار پانچ بجے۔ اور وہ بھی شاید!" میرا دل ڈوب گیا۔ "گر ایسی

مجبوری ہے۔ وہ اس وقت کیوں نہیں آئی؟"

"اس کی وجہ اس نے نہیں بتائی۔ کہہ رہی تھی۔ سب کچھ خود بتاؤں گی۔ شام کو بھی میرے پاس آنے کا بہانہ کر کے آپ کے پاس آئے گی"۔

"مگر میں تو پرسوں کا آیا ہوا ہوں۔ اسے خط لکھ دیا تھا۔ وہ مجھے کل بھی ملنے نہیں آئی؟"

"یہ سب کچھ تو اس نے نہیں بتایا۔ اس وقت کی ملاقات بھی بہت مختصر تھی۔ بس آپ کو اطلاع کرنے کی جلدی تھی"۔

"اور کچھ نہیں کہا اس نے؟"

"نہیں۔ وہ کچھ بے چین سی تھی۔ اور پھر سب گھر والوں کی موجودگی میں یہ باتیں ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔ آپ کو اطلاع کرنے کی بات بھی اس نے مجھے سیڑھیاں اترتے ہوئے بتائی۔ میں حیران بھی ہوئی۔ آپ کے متعلق پوچھا تو بولی۔

"بس تم فوراً اطلاع کر دو۔ باقی باتیں پھر بتاؤں گی!"

"ہوں؟" میں سوچ میں پڑ گیا۔ پروین کو کل کے واقعے کا بھی علم نہیں ہے۔ میں نے پروین کی طرف دیکھا۔

"اب آپ یہاں سے واپسی پر ان سے مل کر جائیں گی غالباً"؟"

"نہیں۔ اس نے مجھ سے پرسوں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اپنے گھر بلایا ہے۔ شاید آپ کے ساتھ سیر کا کوئی پروگرام بنائیں"۔

"یہ آپ سے کہا تھا اس نے؟"

"کہا تو نہیں تھا۔ ویسے میرا خیال ہے۔ وہ میرے پیسوں سے آپ کو سنیما دکھائیں گی۔ آپ کے آنے سے پہلے اس نے مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے"۔

"پھر تو ہم ضرور دیکھیں گے"۔

"کیوں نہیں۔ آپ نے بھی تو ایک بار شمسہ کے خط میں مجھے کنجوس لکھا تھا"۔

"اچھا تو یہ بات ہے"۔ میں ہنس پڑا۔ "تبھی حاتم کی قبر پر لات مارنے کی

سوجھی ہے"۔

"اجی ندیم صاحب! حاتم جتنا خزانہ ہمارے پاس ہوتا۔ جب ہم سے بات کرتے۔ جیب خرچ کا ٹکہ ٹکہ بچا کر آپ کو پکچر دکھاؤں گی"۔ "ارے بھئی مان گیا۔ کب دکھا رہی ہیں آپ پکچر؟"

"یہی تو کہہ رہی ہوں۔ پہلے طے تو کر لینے دیجئے ہمیں"۔

"مگر دیکھئے۔ کہیں گول نہ ہو جائے پروگرام"۔

"مجھے شمسہ نہ سمجھئے جناب!"

"کیوں۔ وہ گول کرنے کی عادی ہیں کیا؟"

"ارے بہت جھوٹی ہیں۔ پہلی دفعہ آپ آ رہے تھے۔ تو کیا کیا پروگرام طے کئے تھے۔ ایک بھی پورا نہیں کیا اس نے۔ کتنے جھوٹ مجھ سے بولے۔ کتنے جھوٹ آپ سے بولے ہوں گے؟"

"ہاں یہ بات تو کسی حد تک ٹھیک ہے"۔

"ارے صاحب ٹھیک ہی نہیں۔ سو فیصدی ٹھیک ہے۔ جھوٹی میں بھی ہوں پر شمسہ جتنی نہیں"۔

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پروین کی وجہ سے میرا موڈ کسی حد تک بدل گیا تھا۔

"یہ خوب رہی۔ یعنی آپ بھی جھوٹی ہیں مگر ذرا کم"۔

"ہاں! یہ بات سچ کہہ رہی ہوں"۔

"اور کون سی بات سچ نہیں کہی؟"

"نہیں۔ آپ کے ساتھ تو ابھی تک سچ ہی بولا ہے۔ دو تین تو ساری ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان میں جھوٹ بولنے کا چانس ہی کب ملا ہے"۔

میں ہنس پڑا۔ "تو آپ ملاقاتیں بڑھا لیجئے تاکہ چانس کے لئے گنجائش نکل آئے"۔

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی"۔

"کیوں؟"

شمسہ آپ سے بہت پیار کرتی ہے"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑ جاتا ہے۔ جہاں بہت زیادہ پیار ہوتا ہے۔ وہاں جھوٹ بھی بہت بولا جاتا ہے"۔

"واقعی؟"

"قطعی ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پیار نہیں کرتی۔ اس لئے جھوٹ بھی نہ بول سکوں گی"۔

"بات تو بڑے پتے کی ہے۔ مگر سنی سنائی یا تجربے کی؟"

"تجربے کی"۔

"آپ کا اپنا ذاتی؟"

"ہاں!"

"اگر آپ برا نہ سمجھیں تو کیا آپ تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیں گی؟"

"آپ شمسہ کے دوست ہیں۔ اس لئے میرے لئے غیر نہیں ہیں۔ اگر آپ سے ملنا بھی برا نہیں سمجھتی تو آپ کو اعتماد میں لینا بھی برا نہیں ہے"۔

"میں اس اعتماد کا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

بات یہ ہے ندیم صاحب مجھے بھی ایک لڑکے سے پیار ہوا تھا۔ اس نے کئی باتیں مجھے جھوٹ بتائیں۔ میں نے بھی کئی بار اس کے سامنے جھوٹ بولا ہے"۔

"مگر پروین کبھی کبھار ہلکے پھلکے جھوٹ بولنے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے سطحی قسم کے جھوٹ جن سے ضمیر پر بوجھ نہ پڑے۔ زیادہ سنگین نہیں ہوتے"۔

"ٹھیک ہے ندیم صاحب! مگر کئی بار میں نے ایسے خلوص سے جھوٹ بولے ہیں کہ اس لمحے خود مجھے ان پر سچ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ ایسے جھوٹ بے ضرر نہیں ہو سکتے!"

میری روح میں ایک گھاؤ سا لگا۔ پروین نے کتنی سچی بات کہی تھی۔ خود میرا کردار پروین سے مختلف نہیں تھا۔ شمسہ' ناہید کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور یہ نہ جاننا کتنا بڑا جھوٹ ہے اور کتنا بڑا سچ ہے۔

"کیوں آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اگر آپ کی بات ٹھیک ہے اور غالباً" ٹھیک ہی ہو گی تو یہ زندگی کتنا بڑا مذاق ہے"۔

"ندیم صاحب! پہلی بار جب میں نے شمسہ کی آنکھوں میں پیار کے چھلکتے ہوئے پیالے دیکھے تو مجھے اس پر رشک آیا۔ پھر میں نے اپنے پیار کا نشہ بھی دیکھا تو اسے زندگی کی معراج سمجھنے لگی۔ مگر اب سمجھتی ہوں کہ انسان فریب کھانے میں کتنا فیاض ہے اور مذاق بننے میں کتنا ماہر"۔

مجھے ایک راستہ مل گیا۔ جس مقصد کے لئے یہاں آیا تھا پروین خود اس کی ترجمانی کر رہی تھی۔ پروین کی باتیں میرے تجربے کا نچوڑ تھیں۔

"پروین آپ کا کیا خیال ہے میں اور شمسہ شادی کر لیں یا نہیں؟"

پروین ایک لحہ کے لئے ٹھٹکی۔ پھر بولی۔

"یہ باتیں جو میرے اور آپ کے مابین ہوں گی۔ کیا آپ تک محدود رہ سکیں گی؟"

"بالکل! اسے مجھ پر اعتماد کا امتحان سمجھ لیجئے"۔

"تب میری رائے ہے نہیں!"

"کیوں؟"

"یہاں دلیل دے کر میں آپ کو قائل نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی کوئی ٹھوس بات بتا سکتی ہوں۔ بس میری رائے ہے جہاں محبت ہو۔ وہاں شادی نہیں کرنا چاہیے"۔

"ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے میری بھی یہی رائے ہو۔ لیکن شمسہ کو کیونکر قائل کیا

جا سکتا ہے۔ مجھ میں اس کی دل شکنی کی ہمت نہیں ہے"۔

میں اس سلسلے میں اس سے بحث کر چکی ہوں۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ آپ سے صرف محبت کرے۔ شادی نہ کرے"۔

میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "پھر؟"

"وہ کوئی بات تسلیم نہیں کرتی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسے کوئی بات ماننا بھی نہیں چاہیے۔ ہر لڑکی کی فطرت یہی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ آپ کو پالے گی تو یہ خونین تجربہ خود اس کی روح گھائل کر دے گا"۔

"پروین! میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ لیکن اس کے تدارک کا صحیح وقت بھی یہی ہے۔ آپ کی مزید کوشش سے شاید ہم اس تاریک غار میں گرنے سے بچ جائیں"۔

"میری تو یہ دلی خواہش ہے ندیم صاحب! لیکن ایسا ہو سکے! یقین نہیں آتا۔ شمسہ بے حد ضدی لڑکی ہے۔ میں بھی ہوتی تو شاید یہی کرتی۔ پچھتاوے کی بات تو ضد پوری ہونے کے بعد جنم لیتی ہے"۔

میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"تو پھر کیا ہو سکتا ہے پروین؟"

"کچھ ہو سکتا تو اس کے لئے وہ خط کافی تھا۔ جو آپ نے اسے لکھا تھا۔ میں نے وہ خط پڑھا تھا۔ وہ خط میرا ایمان تھا۔ اس کی ایک ایک بات سچی تھی۔ آپ نے میرے ذہن کی ہر بات کھرچ کر خط میں لکھ دی تھی"۔

میں خاموش ہو گیا۔ پروین میری خاموشی محسوس کر کے بولی۔

"سچ جانئے۔ آپ کا وہ خط پڑھ کر میں آپ کی زیادہ عزت کرنے لگی ہوں۔ آپ نے نہایت خلوص اور بے حد جرات سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا تھا"۔

"میں آپ کی عزت افزائی کا مشکور ہوں۔ لیکن اس جرات اور خلوص کا کیا فائدہ جو کسی کے دل اور روح کو متاثر نہ کر سکے"۔

"یہ تو وقت' وقت کی پکار ہے۔ ندیم صاحب! اس سے آپ کے خلوص پر زد نہیں پڑتی۔ کل جس مرد کے جسم کی خوشبو پر میں جان دیتی تھی۔ آج اس خوشبو میں بو محسوس کرتی ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کل جس چیز کی تلاش میں سرگرداں پھرتی تھی۔ آج اسی چیز سے اپنا دامن چھڑا رہی ہوں!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں زہر کا گھونٹ پینا پڑے گا"۔

میرے دل میں امید کی جو شمع روشن ہوئی تھی۔ اب ٹمٹما رہی تھی۔ پروین میری ہم خیال تھی۔

باتوں باتوں میں گیارہ بج گئے۔ پروین نے اجازت لی۔ اور چلی گئی۔

شمسہ چار پانچ بجے آئے گی۔ چار پانچ گھنٹے کا انتظار بے حد کٹھن ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی کپڑے بدلے اور کیماڑی کے لئے بس میں بیٹھ گیا۔

ایک بار پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ شمسہ اور پروین کے ساتھ' مگر آج سمندر کے کنارے وہ رونق نہیں تھی۔ کافی دیر تک میں یونہی بے ارادہ ہٹتی بڑھتی اور مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھتا رہا۔ دور تک سمندر اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ میرے سر کے بال آپس میں الجھ گئے تھے۔

اسی بے خیالی میں میری نگاہیں دور افق سے ملے ہوئے سمندر سے ہٹ کر اپنے داہنے طرف مڑ گئیں۔

ایک سیاہ چٹان نے دفعتاً" میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

یہی وہ چٹان تھی جس پر میں شمسہ اور پروین بیٹھے رہے تھے۔

میں یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے شمسہ کے ننگے پاؤں یاد آ گئے۔ وہ کنول جیسے نازک' نرم اور سفید پاؤں وہ حسین انگوٹھے۔ وہ خوبصورت پوریں۔ وہ سرخ ناخن۔ وہ چمکتے ہوئے ٹخنے' اور وہ گول مول دمکتی ہوئی ایڑیاں۔ وہ حسین و جمیل پاؤں۔ جو میری روح میں اتر گئے تھے۔

مایوسی اور تنہائی نے مجھے بے حد جذباتی بنا دیا تھا۔

چٹان بالکل قریب آ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے سچ مچ میں اپنے محبوب سے ملنے آیا ہوں۔

پیار کے نشے میں بھی کتنا جادو ہوتا ہے۔

دو تین چٹانیں پھلانگ کر میں اس چٹان تک پہنچ گیا جو باقی چٹانوں سے اونچی اور بڑی تھی۔

بے اختیار بڑی عقیدت سے میں نے اپنے ہونٹ اس چٹان پر رکھ دیئے۔ سخت، پتھریلی اور گرم چٹان نے مجھے شمسہ کے ہونٹوں کی طرح راحت پہنچائی۔ یہ ایک عجیب احساس تھا۔ پھر میں چٹان کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور میری نظریں ایک بار پھر دور افق پر جم گئیں۔ بہت دیر تک میں بلامقصد اور گم صم بیٹھا رہا۔ جب طبیعت بیزار ہو گئی تو واپس چلا آیا۔



صدر واپس پہنچا تو دو بج رہے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ کھانا کھانے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ یہ ہوٹل مٹن تکے کے لئے مشہور تھا۔

ہوٹل میں بہت بھیڑ تھی۔ مشکل سے سیٹ ملی۔ آرڈر دے کر میں ایک پرچہ دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ سامنے کے دروازے سے شمسہ داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ وردی میں نیوی کا ایک لفٹینٹ تھا، جو خاصا سمارٹ اور قبول صورت نوجوان تھا۔

میں ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا۔ مگر جلدی سے پرچہ منہ کے سامنے کر لیا۔

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ اوپر کی جگہ فیملیوں کے لئے مخصوص تھی۔

میں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ میرے حواس معطل ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میں تیزی سے ہوٹل سے نکل آیا۔

کمرے میں پہنچ کر بے جان لاش کی طرح بستر پر گر پڑا۔ اور زار و قطار رونے

لگ گیا۔

یا اللہ یہ کیسا مذاق ہے؟

انسان کو آخر کس چیز کی تلاش ہوتی ہے؟

سچ --- سچ --- سچ ---- !

کل میں نے اس کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ آج شمسہ نے اس کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے---- کل اپنے کئے پر خوشی حاصل ہوئی تھی۔ آج شمسہ کے کئے پر صدمہ ہوا ہے۔

یہ آنسو کس کے غم میں بہہ رہے ہیں۔ یہ ہچکیاں کس درد کا درمان ڈھونڈ رہی ہیں۔ اور یہ سسکیاں کہاں کا انصاف طلب کر رہی ہیں؟

جو اپنے لئے روا۔ وہ دوسروں کے لئے ناروا کیسے---- جو خود کے لئے جائز۔ اووروں کے لئے ناجائز کیوں کر؟

مرد کے مضبوط ہاتھ فطرت کی لگام تھام نہ سکے۔ عورت کے کمزور ہاتھ کیوں کر وہ لگام تھام لیں گے۔

پھر گلہ کیسے۔ شکوہ کیوں کر۔ اور یہ آنسو کس خوشی میں؟

آئینے میں تو اپنی ہی شکل نظر آئے گی۔

مگر ہم نے چاہا ہی کب تھا ایک دوسرے کو---- تمہارے لاشعور میں خود کو چاہے جانے کا جذبہ برسرپیکار تھا۔ میرے ذہن میں بھی اسی قسم کی خواہش کارفرما تھی۔ تمہیں ایک مرد کی ضرورت تھی جو جنون اور پرستش کی حد تک تمہیں چاہتا رہے۔ مجھے ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔ جو دیوانگی کی حد تک مجھے پیار کرے--- تمہیں ویسا جنونی مرد مل گیا۔ مجھے ویسی جذباتی لڑکی مل گئی۔

تمہاری وہ لاشعوری پیاس دھیرے دھیرے بجھتی چلی گئی۔ اور میری جذباتی امنگ دھیمے دھیمے ٹھنڈی پڑتی چلی گئی۔

ہم نے اپنی جذباتی تسکین اور لب و بوسہ کی گرمی میں ایک دوسرے کو محبوب

کہا' ساتھی کہا اور ہنگامی خوشی میں ایک دوسرے کے لئے آغوش وا کر دی۔

تم بھی فطرت کی شکار۔ میں بھی فطرت کا آلہ کار۔

چاہ بھی فطرت۔ آہ بھی فطرت۔

یہ آنسو تو اس غم میں نکلے ہیں کہ میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا۔ ورنہ تم میری کب تھیں۔ تمہارا تو اپنا وجود تمہارا نہیں ہے۔ تمہارا اپنا ذہن تمہارا نہیں ہے۔ تم اسکے اختیار میں ہو جو کبھی تمہیں میری آغوش میں مدہوش کر دیتا ہے اور کبھی کسی نیوی کے افسر کے پہلو میں۔

تمہارے بھی آنسو نکل پڑیں شمسہ۔

اگر یہ جان جاؤ کہ میں تمہارا نہیں۔

میرے تو اس احساس سے آنسو نکل پڑے تھے کہ میں تمہارا کیوں نہیں بن سکا۔ مگر تمہیں تو ابھی یہ بھی علم نہیں ہے کہ تم میری نہیں ہو---- حالانکہ تمہیں یہ مغالطہ ضرور ہو گا کہ تم ہر طرح سے میری ہو۔

شمسہ! ابھی تمہارے رونے کے لئے بہت سے مواقع پڑے ہیں۔

یہ جان کر کہ تم دراصل مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔

یہ جان کر مجھ سے پیار کر کے دراصل تم نے خود کو دھوکا دیا ہے۔

یہ جان کر پیار فریب ہے۔

یہ جان کر تم نے بے وفائی نہیں کی۔ پر ہو گئی ہے۔

یہ جان کر کہ ندیم سچا ہے لیکن سچا نہیں ہے۔

یہ جان کر کہ ندیم فریبی نہیں--- پر فریب کھا جاتا ہے اور فریب دیئے جاتا ہے--- شمسہ! میں ان سب مواقع پر رویا ہوں۔ تم بھی روؤ گی۔ میں نے زندگی کے دونوں رخ دیکھ لیے ہیں۔

خود کو بھی دیکھا ہے تمہیں بھی دیکھا ہے۔

تم نے ابھی صرف خود کو دیکھا ہے۔ مجھے نہیں دیکھا---- تم ایک روز مجھے

ضرور دیکھ لو گی--- اور-----

تمہارا وہ دن میرے آج کے دن کی طرح ویران اور اداس ہو گا!

اس دن تم بھی میری طرح زار و قطار روؤ گی۔ اس روز تم دنیا میں بالکل اکیلی اور تنہا رہ جاؤ گی۔ یہی وہ دن ہو گا۔

جب تمہارا دل، تمہارا ضمیر اور تمہاری روح سب مجروح ہو چکے ہوں گے اور کوئی ان کے لئے مرہم نہیں لائے گا۔

پھر میں سوچنے لگا۔

آج شمسہ سے ایک نیا تعارف ہو گا۔ آج میں پھر ایک "نئی" لڑکی سے ملوں گا۔ وہ جذبہ اور تھا۔ جب میں پہلی بار اس سے ملا تھا۔ یہ جذبہ بھی اور، وہ جذبہ بھی اور تھا۔ جو آج کے واقعہ سے پہلے آج کی ملاقات کے لئے تشکیل ہوا تھا۔ اور یہ جذبہ ان دونوں جذبوں سے مختلف تھا۔ جو آج کے حادثے کے بعد پیدا ہوا تھا۔

وہ کیا کہے گی۔ میں کیا کہوں گا؟

وہ اپنی نظروں میں بلند۔ میری نظروں میں حقیر۔ میں اپنی نظروں میں حقیر اس کی نظروں میں بلند---- کتنا تضاد، کتنے فاصلے۔

کتنے غلط آدمی کتنے غلط طریقے سے ملیں گے۔ جھوٹ، جھوٹ سے ہمکلام ہو گا اور یہ احساس پیدا کرے گا---- کہ ہم ایک دوسرے سے سچا اور بے لوث پیار کرتے ہیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ شمسہ کے بغیر کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین تھا۔

"آ جائیے۔ کون ہے؟"

میں نے بظاہر بڑی بے تعلقی سے کہا۔ ہاں---- واقعی یہ شمسہ تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ میرے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہوا۔

"آیئے آیئے"۔

شمسہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مگر میری شکل و صورت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ جیسے آپ بہت روئے ہوں۔"

"ہاں--- رو پڑا تھا"۔ میں نے مسکرا کر اقرار کیا۔

"شاید اس لئے کہ میں کل نہ آ سکی۔ مگر کیسے آتی۔ ایک سہیلی کا بلاوا آ گیا تھا۔ سارا دن باہر رہی۔ شام کو لوٹی تو آپ کا خط ملا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ پھر آپ نے بڑی غلطی کی۔ ہمارے گھر چلے آئے"۔

"دراصل اسی غلطی پر کل سے رو رہا ہوں"۔

"تو کیا ہوا۔ ایسی باتیں تو اکثر ہوا کرتی ہیں۔ گھر والوں کو برا لگا ہے۔ بھائی جان باتیں بنا رہے تھے۔ پر سچ کہتی ہوں۔ مجھے تو الٹی خوشی ہوئی ہے"۔

مجھے شمسہ کی متضاد رائے عجیب سی لگی۔ میں نے اس کے فیروزی سوٹ کی طرف دیکھا۔ "یہ تم میرے پسند کے کپڑے پہن کر آئی ہو مگر وہ مہندی کے رنگ کا غرارہ قمیض تمہیں بہت پیارا لگتا ہے"۔

"ہاں! وہ مجھے بھی پسند ہے۔ استری نہیں ہوئی تھی اس پر، پھر کسی دن پہن کر آؤں گی"۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے وہ یہی لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ میری بجھی بجھی آنکھوں اور اجڑی صورت دیکھ کر بولی۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اٹھئے منہ ہاتھ دھو آیئے اور کپڑے بدل لیجئے"۔

میں چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ شمسہ کا چہرہ کچھ دھندلا سا گیا۔

"ارے اٹھئے بھی"۔ اس نے مجھے ہاتھ سے کھینچا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے

کارنس پر سرخ گلاب کے پھول دیکھے تو ادھر کو لپکی۔

"ارے! آپ لاہور سے لائے ہوں گے"۔

"اب یہ مرجھا چکے ہیں۔ ان میں جان نہیں رہی"۔

اسے بہت افسوس ہوا۔ غسل خانے میں مجھے پھر رونا آ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا۔ تو وہ بولی۔

"بیٹھیے۔ کپڑے بعد میں بدل لینا"۔

میں بیٹھ گیا۔ شمسہ میرلے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور میرے نیم گیلے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"پگلے ہو بالکل پگلے۔ پورے چھ مہینے ہم الگ رہے تو تم صبر کئے رہے۔ اب ایک دن نہ آ سکی تو یہ حالت بنا ڈالی"۔

وہ "آپ" سے "تم" پر اتر آئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بھی مجھے دیکھتی رہی۔ لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میرے ہونٹ لرزنے لگے اور میں بے اختیار انہیں کاٹنے لگا۔ شمسہ چیخی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے ندیم!"

وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اسنے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں چھوٹے بچوں کی طرح اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔ وہ تڑپ کر بولی۔

"تم اس لئے رو رہے ہو نا کہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟؟"

اس کی اس بات سے مجھے اور زیادہ تکلیف ہوئی۔ گویا میرے دکھ کی بہت کم قیمت لگائی گئی ہو---- یہ بات تو میں بہت پہلے اس پر واضح کر چکا تھا کہ شادی نہ کرنے کی صورت میں میں اپنی محبت کو بہت عزت دوں گا۔

مگر اب رونے کی وجہ کیسے بتاؤں۔ میری سسکیوں میں اضافہ ہو گیا۔ شمسہ حیران تھی۔ خود اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

جیسے کوئی ماں غصے میں اپنے بچے کی خوب مرمت کرنے کے بعد اس سے بے

تحاشہ پیار کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح شمسہ مجھ پر جھک گئی تھی اور بے پناہ عقیدت سے مجھے چوم رہی تھی۔

عجیب بات تھی جس لڑکی کی وجہ سے میں زار زار رو رہا تھا۔ اسی کی گود میں مجھے تسکین اور ڈھارس بھی مل رہی تھی۔ اس لمحے مجھے شمسہ کی عقیدت اور سچائی پر ذرا بھی شبہہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہی تڑپ' وہی خلوص اور وہی جانا پہچانا والہانہ پن محسوس کر رہا تھا۔

شمسہ نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ بھیگی پلکیں اور سرخ روتی آنکھیں' دونوں کی بھیگی نگاہیں ملیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بھیگے چہرے' دھندلے چہرے نظر آئے۔ دونوں کے درمیان ایک ہلکا سا پردہ حائل ہو گیا تھا۔ شمسہ نے اپنے فیروزی آنچل سے میرے آنسو پونچھے۔ اپنی انگلیوں سے میری آنکھوں کے گوشے صاف کئے۔ مجھے اب اس کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگ گیا تھا۔ وہی نرگسی آنکھیں' وہی پیاوے اور شریر سے لب' وہ مری طرف جھکی' شاید وہ مری سرخ سرخ آنکھوں کو چوم لینا چاہتی تھی۔ لیکن برق کی طرح ایک خیال میرے ذہن کو کاٹ کر چلا گیا----

وہ قبول صورت نیوی کا لیفٹیننٹ میری نظروں میں گھوم گیا۔

اس سے پہلے کہ شمسہ میری آنکھوں کو چومتی۔ سر جھٹک کر میں شمسہ سے الگ ہو گیا اور تکئے میں منہ چھپا کر پھر سے سسکیاں بھرنے لگا۔

شمسہ اس انوکھے طرز عمل سے گھبرا گئی اور چند لمحے محو حیرت مجھے تکتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ میں نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں اس کے تازہ رومان کو جان گیا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بالکل اس مقام پر کھڑے دیکھ رہی تھی جہاں سے چھ ماہ پیشتر ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ اس طرح وہ خود کو میرے بہت قریب محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ اس دانست کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے میرے سلوک سے اپنی تحقیر محسوس کی۔ اور اضطرابی کیفیت میں ہونٹ چبانے لگی۔ لیکن دوسرے لمحے میری ہچکیوں' سسکیوں

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے کے خیال نے اس کی ذاتی تحقیر کی قیمت کم کر دی۔ وہ فوراً میری طرف متوجہ ہو گئی۔ اور بڑے پیار سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اور پھر میرے شانے پر منہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب دونوں رو رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے رونے کی وجہ نہیں جانتے تھے۔ مگر اس لئے رو رہے تھے کہ رونا بھی ایک مفہوم ہوتا ہے۔ ایک زبان ہوتی ہے۔

جب شمسہ کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں تمہارے سوا کسی سے پیار نہیں کرتی ندیم۔ تم مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو۔ میرا پیار تمہارا ہے۔ میں خود فریب کھا سکتی ہوں۔ مگر تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ خدانخواستہ میں سراپا جھوٹ بھی بن جاؤں تو بھی میرے وجود میں سچ کی ایک رمق باقی رہے گی اور وہ رمق تمہارے پیار کی ہو گی!“

جانے وہ یہ سب کچھ کیسے کہہ گئی۔ بنا پوچھے وہ اپنے من کا چور بتا گئی---- اور اپنے ضمیر کی دھڑکنیں سنا گئی۔ شاید زندگی میں کوئی لمحہ ایسا آتا ہے کہ انسان سچ‘ چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو---- اگلنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔

میرے زخمی دل پر جیسے کسی نے لمحہ بھر کے لئے مرہم رکھ دیا۔ اقرار گناہ انسان کو کتنا خوبصورت اور احساس ندامت‘ کتنا بلند کر دیتا ہے---- مجھے محسوس ہوا کہ اگر ناہید سے پیار کرنے کے باوجود بھی میں شمسہ کے لئے سچی چاہ اور تڑپ رکھتا ہوں۔ تو کیا شمسہ کسی اجنبی سے تعلق رکھنے کے بعد میرے لئے قلبی لگن نہ رکھتی ہو گی----؟

یقیناً! شمسہ کے لرزتے ہوئے لہجے نے مجھے یہ بات سمجھائی تھی۔ مگر برا ہو مرد کی فطرت کا۔ قرب اور فاصلے کے اس فرق کو محسوس کر کے بھی میرے دل سے کانٹا نہ نکلا۔

جب میں یہ تصور کرتا کہ شمسہ مجھے نظرانداز کر کے کسی اور کو مجھ پر ترجیح دے سکتی ہے تلملا جاتا۔ میری نس نس سے چنگاریاں پھوٹ پڑتیں اور دل ڈوبنے لگ

جاتا۔ شمسہ کی محبت کا واحد امین میں کیوں نہیں۔

یہ خیال مجھے بے حد ستاتا۔ بے حد پریشان کرتا اور میں اپنے آپے میں نہ رہ سکتا۔ ایسے میں ہر وعدہ جھوٹا‘ ہر دعویٰ غلط اور انسانی جذبوں کا تعلق محض مذاق معلوم ہوتا۔

میں نے سر اٹھا کر شمسہ کو دیکھا۔ مگر اس طرح‘ جیسے میلوں دور کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں۔ ایک اجنبی مرد کا خیال‘ آنسوؤں کے اس گہرے رشتے کو توڑ رہا تھا اور اس احساس نے اس قربت کو فاصلوں میں بدل دیا تھا۔

اس لمحے مجھے شمسہ پر رحم بھی آیا۔ بے چاری اپنی بے چارگی کی وجہ بھی نہیں جانتی---- وہ بھی اگر جانتی کہ میں نے ناہید کو کس خلوص سے چاہا تھا۔ تو اس کے احساسات کیا ہوتے۔ وہ کس قدر تڑپتی۔ مگر اسے کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس لئے فرار کا یہ پہلو قطعی یک طرفہ تھا۔ اور اسی لئے وہ زیادہ قابل رحم تھی۔

مگر اس جذبے کی زندگی صرف سوچنے کی حد تک محدود تھی۔ شمسہ کی زندگی میں کسی دوسرے مرد کا تصور ہی ناقابل برداشت تھا۔ سوچوں کی دنیا اور ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں انسان بہت متعصب ہو جاتا ہے۔

شمسہ میری ویران ویران اور اجنبی نگاہوں کو دیکھ کر سہم گئی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے ندیم۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟؟“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑی حسرت و یاس سے شمسہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہونٹوں پر ایک دلدوز مسکراہٹ پھیل گئی۔

شمسہ کی روح پر ایک گہرا چرکا لگا۔

یہ بے حد لرزا دینے والا تبسم تھا۔ میرے رونے سے بھی زیادہ گھمبیر‘ پراسرار اور دردانگیز۔

وہ بوکھلا گئی۔

”روتے ہو۔ تو کلیجہ کٹ کٹ جاتا ہے۔ مسکراتے ہو تو آتما لرز لرز جاتی ہے۔

یہ کیا کرتے ہو ندیم۔ ایسا کیوں کرتے ہو ندیم؟""

اس احتجاج کو میں نے پوری طرح محسوس کیا۔ اور بھر آئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے معاف کر دو شمسہ۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں ناحق دق کیا"۔

شمسہ میری چھاتی سے لگ گئی۔ میں نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ اور اس کے خشک بالوں پر ہونٹ پھیرنے لگا۔ دونوں میں ایک وقتی سمجھوتہ ہو گیا تھا بے شک اس کی عمر کم سہی۔۔۔ مگر تھا سچ!

سچ کبھی کبھی چمکتی لہراتی بجلی کی طرح ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے فطرت انسانی کے نامکمل ہونے میں بھی ایک راز ہے۔ فریب کھانے کے بعد ہی سچائی اور ہمدردی کے جذبات جنم لیتے ہیں۔اور چوٹ کھانے کے بعد ہی عفو وبرداشت کی کلیاں پھوٹتی ہیں۔اور انسان میں سچ اور جھوٹ کی پرکھ پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر وہ ذمہ داری محسوس کرنے لگ جاتا ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ صراط مستقیم کا انتخاب کر سکے۔

اگر فطرت انسانی مکمل ہوتی تو گناہ و ثواب کا تصور کہاں ہوتا۔ جنگ و جدل کہاں ہوتے۔ نسلی تعصب کہاں ہوتا۔ پھر تو جنت کا تصور ہی ختم ہو جاتا۔ بے شک اس طرح کا معاشرہ شر اور فساد سے خالی ہوتا۔ مگر ایک ہی قسم کے امنگ سے زندگی ہر ہلچل سے عاری ہو جاتی۔ پھر نہ شعر و ادب میں چاشنی رہتی۔ نہ سچائی کی تلاش رہتی۔ اور نہ نیکی کا مفہوم سمجھ میں آتا۔ اور نہ ناموری کی تاریخ مرتب ہوتی۔

پھر پیغمبر پیدا نہ ہوتے۔ ہر بشر اپنی ذات میں پیغمبر ہوتا۔ پھر آسمانی کتابیں نازل نہ ہوتیں۔ بلکہ ہر سینے میں ہدایت کی قندیل روشن ہوتی۔

شاید خدا نے یہی سوچ کر فطرت کو نامکمل رہنے دیا کہ اس طرح تلاش حق زیادہ حسین ہو جاتی ہے۔ اور ندامت بے حد قیمتی ہو جاتی ہے۔ اور رشک و رقابت کی وجہ سے قومیں چاند ستاروں پر کمند ڈالنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی

کوشش کرتی ہیں اور حیات حرکت و عمل سے خالی نہیں رہتی۔

بالکل یہی کچھ شمسہ کے ساتھ ہوا تھا۔ بوسے کی ذرا سی خواہش نے اسے ایک اجنبی کی گود تک پہنچا دیا تھا۔ اس لمحے ذرا بھی اسے زندگی کے حقیقی مقصد کا سامنا پڑا تو اس کا احساس ندامت جاگ اٹھا۔ اس احساس سے ہوس کی وہ چنگاری بجھ گئی۔ جس کی چمک نے اسے زندگی کی شاہراہ سے ہٹا کر ایسی پگڈنڈی پر ڈال دیا تھا۔ جو چند قدموں کے بعد گم ہو گئی تھی اور وہ چونک کر فوراً اپنے مقام پر لوٹ آئی تھی۔

چنانچہ اب اس کا دل سچے پیار کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس کا ذہن ہر پراگندگی سے آزاد اور اس کا تصور ہر آلودگی سے پاک تھا۔ ان لمحوں میں وہ زندگی کی صحت مند اقدار کی صحیح نمائندہ لڑکی تھی۔

کبھی اسے اس تصور نے کتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ لیکن آج اس نے شادی کے خیال کو تھپتھپا کر سلا دیا تھا۔ اب وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس سے شادی کروں نہ کروں۔ مگر یہ بات تسلیم کر لوں کہ شمسہ میرے سوا کسی سے پیار نہیں کرتی۔ اب اسے اپنے پیار کا غم تھا۔ اس پیار کا جو اس کی ذات کے لئے تاریخی تھا۔ جو اس کی محدود دنیا میں اس کی واحد کائنات تھی اور جس کے ذکر اور تصور سے اس کی گردن فخر و غرور سے بلند ہو جاتی تھی۔

لیکن اس کی یہ خود آگہی اس کے کس کام آ سکتی تھی؟ میں نے سوچا۔

سچی ندامت کا صلہ،صرف آنسو ملیں تو یہ بہت کم صلہ ہو گا!

مگر میں اتنا عالی ظرف نہ نکلا۔۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل اس سے ملاقات نہ کروں اور صرف اس کا رد عمل دیکھوں۔

دوسرے دن دس بجے وہ پروین کے ساتھ ہوٹل پہنچی۔ کمرہ بند دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ بیرہ سامنے کھڑا تھا اور اس طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ ان کی آمد اور سوال کا پہلے سے منتظر ہو۔ پروین نے اسے اشارہ کیا تو وہ لپک کر آ گیا۔ پروین نے پوچھا۔

"یہ ندیم صاحب کہاں چلے گئے؟"

"وہ تو چلے گئے بی بی"۔

چلے جانے کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ ابھی ابھی شہر گئے ہیں یا کسی کام سے گئے ہیں اور ایک دو گھنٹے کے بعد آ جائیں گے۔ مگر چلے جانے کا یہ لہجہ بڑا فیصلہ کن تھا۔

شمسہ میرے جانے کا یقین کرنے کے باوجو آسرا کر کے بولی۔

"کب تک واپس آ جائیں گے؟"

"ارے نہیں مس صاحبہ! وہ چلے گئے لاہور؟"

بیرے نے اس کے جھوٹے سہارے کو دھڑام سے گرا دیا۔

"آپ کے نام ایک خط دے گئے تھے مینجر صاحب کو۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ آپ آئیں تو خط کے متعلق بتا دوں"۔

امید کی ایک ننھی سی کرن چمکی۔ شاید لاہور سے کوئی ضروری کال آ گئی ہو اور ان کا جانا ضروری ہو گیا ہو۔ شمسہ نے تاسف اور امید کی ملی جلی نظروں سے پروین کی طرف دیکھا۔

سیڑھیوں میں پروین کے کہنے پر اس نے خط کھولا۔

شمسہ جی!

میں جا رہا ہوں—— کیوں؟ جانتا تو ضرور بتاتا۔

ویسے میں تم سے بھاگ نہیں رہا۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں رہا۔ بس تمہارا سامنا نہیں کر سکتا۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو دل رونے لگ جاتا ہے اور آتما تڑپنے لگ جاتی ہے—— تم نے بلایا تھا کوئی بات بھی نہ کر سکا۔ اسے فرار اور گریز ہرگز نہ سمجھنا۔ میری غیرحاضری کا تمہیں جتنا صدمہ ہو گا۔ اس سے زیادہ مجھے اس طرح چلے جانے کا دکھ ہو رہا ہے۔ مگر میں اس دکھ کو ہم آغوش کیے جا رہا ہوں۔ خالی ہاتھ لوٹتا تو تم شکوہ کر سکتی تھیں۔

ایک بار شیطان نے چپکے سے کان میں کہا۔ کل شمسہ آئے تو اس کا سب کچھ لوٹ لو۔ تم اس پر قادر بھی ہو۔ بس نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری!

لیکن اگلے لمحے میں نے اس شیطان کو دھتکار دیا۔

شاید یہ بھی کسی سچے جذبے کی جیت تھی—— تم ہرگز نہ سمجھنا کہ میں پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا۔ اور نہ کبھی یہ سمجھنا کہ تم مجھ سے مل نہ سکو گی۔ تم میری راہ دیکھتی رہو گی اور میں تمہارے لئے دروازے کبھی بند نہیں کروں گا۔

اس وقت یہی مناسب تھا جو میں نے کیا۔ شاید وقتی طور پر تم اس تلخی کو محسوس کرو۔ لیکن اس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ تم اپنے گردو پیش کا اچھی طرح جائزہ لے لو۔ زندگی میں چاروں طرف حسن بکھرا ہوا ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوشی ایک سے ایک بڑھ کر تسلی منتظر آغوش رہتی ہے۔

کوئی اتنا احمق کیوں بنے کہ بھری کائنات میں اپنے لئے ایک گوشہ منتخب کر کے اسے ہی فردوس بریں سمجھ بیٹھے۔

دیکھو شمسہ! میں عجیب بے ربط سی باتیں لکھ رہا ہوں۔ نہ اس میں تسلسل ہے نہ متانت۔ اس وقت مجھے اپنے ذہنی توازن کے درست ہونے کا بھی دعویٰ نہیں۔ میں جذباتی ہو گیا ہوں۔

اس وقت جانے کا فیصلہ ہی غالباً" درست فیصلہ ہے۔ شاید لاہور پہنچ کر اپنے مستقبل پر غور کر سکوں۔ میرے خط کا شدید انتظار نہ کرنا۔ الوداع

ندیم

شمسہ کی نظریں خط پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا زرد چہرہ اور زیادہ زرد ہو گیا تھا۔ پروین

نے خط اس کے ہاتھ سے کھینچ کر تہہ کیا۔ اور لفافے میں بند کرکے اس کے پرس میں رکھ دیا۔ وہ اسی طرح بت بنی بے خبر کھڑی تھی۔ پروین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ شمسہ نے زخمی نظریں اوپر اٹھائیں اور پروین سے لپٹ گئی۔

"وہ اب نہیں آئے گا پروین! وہ اب کبھی نہیں آئے گا!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو"۔ پروین نے دھاڑس بندھائی۔ "خط میں ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔ خط کا ایک ایک لفظ میری بدبختی اور نامرادی کی مہر ہے۔ میں نے اسے خود کھو دیا ہے۔ میں نے اسے خود کھویا ہے۔ میں اسی قابل تھی پروین! میں اسی ذلت کے قابل تھی!"

اس انداز ملامت پر پروین حیران رہ گئی۔

"وہ مجھے بے حد پیار کرتا ہے پروین۔ وہ مجھے بے حد پیار کرتا ہے۔ وہ مجھے اب بھی چاہے گا۔ اب بھی پیار کرے گا۔ جلتا رہے گا' کڑھتا رہے گا۔ ساری زندگی پیار کرتا رہے گا۔ پر مجھ سے کبھی نہیں ملے گا۔ اب میں اسے کبھی حاصل نہ کر سکوں گی۔ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا"۔

پروین خاموش تھی۔ نئے نئے انکشافات نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ شمسہ نے سر اوپر اٹھایا۔

"کاش! وہ مجھے ایک بار مل لیتا۔ میں اس کے پاؤں میں گر کر سارے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف کرتی۔ اس سے صاف صاف کہتی میں راہ بھٹک گئی۔ میں بھول گئی۔ میں غلطی تو کر سکتی ہو ندیم' مگر پیار تمہارے سوا کسی سے نہیں کرتی"۔

وہ بولتی چلی گئی۔ جیسے پروین سے نہیں اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"کاش! میں کل ہی سب کچھ کہہ دیتی۔ وہ دھتکار ہی دیتے' پر نہ کہنے کی حسرت تو نہ رہتی۔ کم از کم یہ ارمان تو نہ رہتا کہ مجھ میں سچ کہنے کی ہمت نہیں ہے"۔

پروین نے تسلی دی۔

"تم اگر ہمت کرو۔ تو اب بھی حالات کا رخ بدل سکتا ہے"۔

"ہوں!"۔ وہ زہر خند تبسم سے بولی۔ "وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو عورت کی مسکراہٹ سے موم کی طرح پگھل جاتے ہیں یا عورت کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر رام ہو جاتے ہیں"۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" پروین چڑ سی گئی۔ "آخر تم نے قصور کیا کیا ہے۔ تم سے گناہ کون سا سرزد ہوا ہے؟"

شمسہ جو عام حالات میں اس قسم کا اعتراف کبھی نہ کرتی۔ بولی۔

"گناہ!" گناہ کے لفظ پر اس نے زور دیا۔ "گناہ اگر اس چیز کا نام ہے کہ میں نے اپنا جسم بیچ دیا۔ یا عصمت سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔ تو میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کیوں کہ میں عصمت مآب ہوں۔ لیکن اگر گناہ دوسرے کے اعتماد کو دھوکہ دینے اور اپنے ضمیر کو فریب دینے کا نام ہے تو میں نے یقیناً گناہ کیا ہے"۔

"لیکن ندیم بھائی کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تم نے ان کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے"۔

"میں نہیں جانتی کہ انہیں وہ سب کچھ کیسے پتہ چل گیا جو آج تک کسی کو پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ تم بھی نہیں جانتیں۔ لیکن ان کا کل کا سلوک اتنا عجیب تھا کہ میری روح کانپ گئی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا۔ کوئی شکوہ نہیں کیا۔ بس سینے سے لگا کر روتے رہے۔ ان کے لہجے' انکے رویے اور ان کی نگاہوں سے میں اتنی خائف ہو گئی تھی۔ جیسے وہ میری بدنیتی کی کہانی میری آنکھوں میں پڑھ رہے ہوں۔ کل مجھے اپنی کمینگی اور ذلت کا جتنا احساس ہوا تھا۔ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا"۔

پروین اس کے لب و لہجے سے متاثر ہو کر بولی۔

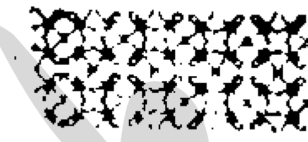
"میں سمجھتی ہوں۔ کہ اگر تم اتنی سچائی سے اپنے قصور کو تسلیم کرتی ہو۔ اس بے باکی اور صداقت سے پشیمانی کا اظہار کرتی ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ندیم بھائی ایسی

تنگ ظرفی کا مظاہرہ کریں کہ تمہیں معاف نہ کریں"۔

"نہیں پروین معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ میں معافی مانگوں گی تو وہ ضرور دے دیں گے۔ انہوں نے مجھ سے پہلے کوئی کون سی جواب طلبی کی ہے۔ سوال تو اعتماد کی بحالی کا ہے۔ وہ گرہ جو ان کے ذہن میں پڑ گئی ہے۔ کیوں کر کھلے گی۔ وہ صدمہ جو ساتھ لے گئے ہیں کیونکر زائل ہو گا۔ وہ زخم جو دل پر لگائے ہیں۔ کیونکر بھرے گا۔۔۔؟ وہ روٹھے نہیں کہ انہیں منایا جائے۔ وہ کھوئے نہیں کہ انہیں تلاش کیا جائے۔ وہ اتنے قریب ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔ اور اتنے دور۔۔۔ کہ نظر نہیں آتے!"

پروین خاموش ہو گئی۔ شاید وہ شمسہ کے دکھ کو سمجھ گئی تھی۔ معافی تو ان سے مانگی جائے۔ جو الزام لگاتے ہوں۔ قائل تو انہیں کیا جائے جو قائل نہ ہوتے ہوں۔ یہاں تو سرے سے کوئی الزام ہی نہیں ہے۔ بس ایک احساس ہے جس میں ایک غیر مرئی کانٹا چبھ گیا ہے۔ کوئی اعلیٰ جذبہ ہی اس چبھن کو دور کر سکتا ہے۔

یہ تھا وہ ردعمل جسے دیکھنے کے لئے میں نے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ لیکن یہ سب دیکھ کر میں اور زیادہ گھمبیر اور رنجیدہ ہو گیا تھا۔



میری روح زخمی ہو چکی تھی۔

سوچ بچار نے میری صحت پر برا اثر ڈالا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے اور میرا بھرا ہوا جسم محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

میری حساس طبیعت نے مجھے دماغی' قلبی اور روحانی درد و کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اپنے مختصر کمرے کی طرح میری دنیا بالکل محدود ہو کر رہ گئی۔ بہت کم باہر جاتا۔ سب دوستوں نے میری پراسرار خاموشی کو محسوس کیا۔ اور میری گرتی ہوئی صحت پر تشویش کا اظہار کیا۔ مگر میں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

البتہ آپا جہاں آرا بیگم مجھے باقاعدہ ڈانٹتی۔ بڑے پیار سے غصہ ہوتی اور اپنی صحت پر توجہ دینے پر اصرار کرتی۔ میں ان سے اقرار کرتا لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے نہیں۔ محض اس کے خلوص کو عزت دینے کے لئے۔

جب انسان کو روحانی چرکہ لگتا ہے تو غالباً" یہی کرتا ہے۔ برے اور بھلے کو سمجھتا ہے۔ مگر اصلاح کی کوشش سے بیزار رہتا ہے۔ الٹا اپنی بربادی میں ایک منفی قسم کا سکون محسوس کرتا ہے۔

ناہید مجھ سے برابر ملتی رہی۔ مجھے اس کا آنا اچھا لگتا نہ برا۔ البتہ ان ملاقاتوں

میں وہ پہلی سے گرمجوشی ہرگز نہ ہوتی۔ لیکن میری پریشانی اور عام بیزاری کی کیفیت کی وجہ سے وہ محسوس نہ کرتی۔ ہاں ڈاکٹر سے مشورہ کے لئے بار بار اصرار کرتی تو میں گھڑا گھڑایا جواب دیتا۔

"پانچ ڈاکٹروں سے مل چکا ہوں۔ سب کی تشخیص الگ الگ' سب کی رائے مختلف۔ ایسے میں کوئی خاک علاج کرے"۔

ناہید کے ساتھ کبھی کبھی تبسم بھی آ جاتی۔ تبسم کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوتا۔ یہ خوشی عام خوشیوں سے بالکل مختلف ہوتی۔ اس خوشی میں نہ وہ جذبات ہوتے' جو محبوباؤں کو دیکھ کر بیدار ہوتے ہیں۔ اور نہ وہ احساسات ہوتے جو انسان اپنی بہنوں کے لئے محسوس کرتا ہے۔

بس ایسی لڑکی جو نہ محبوبہ ہو نہ بہن ہو۔ لیکن جس کی چاہ میں بہن اور محبوبہ کے پیار کی تھوڑی تھوڑی چاشنی آ گئی ہو۔ یہ رشتہ بے حد لطیف اور پاکیزہ ہے۔

کبھی ناہید کی وجہ سے تبسم اچھی لگتی تھی۔لیکن آج تبسم کی وجہ سے ناہید کو میں برداشت کر رہا تھا۔ بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تبسم کی موجودگی میں ناہید مجھے اجنبی اجنبی نہیں لگتی۔ میں ایک گھریلو قسم کا سکون محسوس کرتا۔

اور جب تبسم کہتی۔

"بھیا! دیکھئے۔ آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ آج میں خود کھانا پکاؤں گی اور اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی"۔

تو میں بے پناہ مسرت محسوس کرتا۔اور جب وہ سچ مچ برتن مانجھتی' ہیٹر پر چائے یا کھانا بناتی تو میں مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا۔ اس سے مذاق کرتا۔ ایسے میں مجھے ناہید کے وجود کا مکمل احساس ہوتا۔ میں سوچتا۔ یہ خلوص' یہ ہمدردی یہ اپنائیت یہ بے لوث پیار مجھے ناہید کی وجہ سے ملا ہے--- ناہید نہ ہوتی تو یہ تعارف بھی نہ ہوتا۔ اور زندگی کا یہ پہلو بھی میرے سامنے نہ آتا۔

ناہید اگرچہ خوشی کے اس گہرے جذبے کی نفسیاتی وجہ کو سمجھ نہیں رہی تھی۔

مگر جس بات کو سمجھ کر وہ خوش ہوتی تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ ذو معنی تھی۔

تبسم کو جتنا پیار ملتا ہے۔ میری وجہ سے ملتا ہے۔ تبسم کو جتنی اہمیت ملتی ہے میری وجہ سے ملتی ہے۔ گویا مرکز میں ہوں۔

اس لئے جب اس نے محسوس کیا کہ تبسم کی وجہ سے ماحول کا جمود کسی حد تک ٹوٹ جاتا ہے۔اور میری صحت پر اچھے اثرات پڑنے کا امکان ہے تو وہ ہر دوسرے تیسرے روز تبسم کو بھی ساتھ لانے لگی۔ خود تبسم بھی آنے میں خوشی سی محسوس کرتی۔

مگر جس جذبے اور جس اعتماد کا سہارا لے کر ناہید نے ایسا کیا۔ بالکل اس سے مختلف ایک جذبے نے تبسم کے دل میں گرہ باندھ لی۔ اس احساس نے اس کے دل میں ایک مخفی قوت کو بیدار کر دیا تھا۔ کہ وہ کسی کی صحت مندی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ اس نے تصور ہی تصور میں مجھے صحت لوٹا دی تھی۔ اور میرے زرد چہرے پر سرخیاں بکھیر دی تھیں اور ایک طرح سے اب اپنا حق جتا رہی تھی۔

اور یہ حق عورت کے ان رنگین خوابوں سے خالی نہیں تھا۔ جس میں وہ پیار و محبت کی تعبیر ڈھونڈا کرتی ہے--- اس نے یہ بالکل نہ سوچا کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ کوئی زیادتی کر رہی ہے۔ بلکہ اسے سوجھی تو یہ کہ وہ اپنی بہن سے زیادہ طاقتور ہے۔ احساس برتری کے اس جذبے میں رقابت کم' اپنی شخصیت منوانے کا احساس زیادہ تھا۔ چنانچہ اسی احساس کی مرہون منت تھی اس کی دلچسپی' جسے دوسرے لفظوں میں پیار بھی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن وہ دیواریں ابھی سلامت تھیں۔ جنہیں تبسم نے ابھی پھلانگنا تھا۔ اور یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ اقدار و روایات کی گود میں پروان چڑھنے والی لڑکی تھی--- بایں ہمہ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اور اس یادگار رات کے واقعات ایک ایک کر کے اس کے فکر و احساس میں چمک سی پیدا کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کاش---! یہ سارا واقعہ خود اس کے ساتھ پیش آیا ہوتا۔

اس واقعہ کا تصور جہاں اپنی جگہ رنگین تھا۔ وہاں ایک دبی ہوئی رقابت کی تلخی نے اسے اور زیادہ اہم بنا دیا تھا۔ لیکن اس وقت شاید یہ کہیں تحت الشعور میں چھپا بیٹھا تھا۔ اور اب حالات کے تقاضے' پھن پھیلائے ہوے سانپ کی طرح اسے سامنے لے آئے تھے اور وہ انہیں دودھ پلا رہی تھی۔

مگر عورت سے عورت کا چلن دیر تک مخفی نہیں رہ سکتا۔۔۔ بات بات میں میرا ذکر اور وہ بھی اس انداز میں کہ دوسرے کو لب و لہجہ کی پراسرار گہرائی محسوس ہو۔ ناہید چونک پڑی تھی۔

یہ شبہہ صرف تبسم پر نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ میں بھی اس شک کی لپیٹ میں آگیا تھا ناہید نے سوچا۔۔۔ کہ اگر میری طرف سے اس کو شہ نہ ملتی۔ تو کبھی تبسم کے لب و لہجہ میں فخر و غرور کا احساس غالب نہ ہوتا۔ مگر اس نے جلد بازی سے کام نہ لیا۔ تینوں کا رشتہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر وہ اشتعال میں آکر کچھ کہہ دیتی تو اس کا ردعمل بہت برا ہوتا اور شاید پھر وہ خلیج پاٹی نہ جا سکتی جو اس الزم سے پیدا ہوتی۔

پھر بھی وہ اس کا تدارک کرنا چاہتی تھی۔ جس شخص کے لئے اس نے اپنی عزت سے کھیلا' جس شخص کے لئے بدنامی مول لی اور لوگوں کی باتیں سنیں۔ وہ اس طرح منہ موڑ کر چلا جائے۔ یہ اس کی کتنی بڑی توہین ہے۔ صدمہ جو ہو گا سو ہو گا۔ مگر یہ سبکی تو بالکل ہی ناقابل برداشت تھی کہ اس کی اپنی بہن اس کا پیار چھین لے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے تبسم سے سب کچھ کہہ دیا۔

تبسم نے بہن کی بات سنی تو ایک لمحے کے لئے اسے کچھ نہ سوجھا۔ یہ سب کچھ غیر متوقع ہوا۔ اس لئے وہ سٹپٹا گئی۔

رات کاٹنی اس کے لئے مشکل ہو گئی۔ ناہید نے جو کچھ کہا تھا اس کی تائید و تردید کے لئے وہ بے چین تھی۔

معمول کے مطابق وہ دونوں شام کو تین چار بجے مجھ سے ملنے آتیں۔ لیکن اس روز صبح ہی صبح وہ پہنچ گئی۔ خلاف توقع اس وقت تبسم کو دیکھ کر میں حیران بھی ہوا

اور خوش بھی۔۔۔ تبسم مسکرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں روز کی طرح شوخی نہیں تھی۔ اور اس کا بیٹھنا روز کی سی بے نیازی سے محروم تھا۔

میں نے پوچھا۔۔۔ "ہاں بھئی خیر تو ہے صبح صبح اور اکیلی؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے"۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ لیکن وہ گھبرا گئی۔

"چائے پیو گی۔ میں تو تھوڑی دیر ہوئی۔ ناشتہ کر بیٹھا ہوں"۔

"ناشتہ تو میں بھی کر کے آئی ہوں۔ بس ایک سہیلی سے ضروری کام تھا۔ سوچا آپ سے بھی ملتی چلوں"۔

"ارے اچھا کیا۔ میں بھی اکیلا تھا۔ ابھی لکھنے یا پڑھنے بیٹھ جاتا۔ وہ تو روز کا معمول ہے۔ آج بوریت تمہاری وجہ سے کچھ کم ہو جائے گی"۔

اس انداز اپنائیت سے' تبسم کو کچھ ڈھارس ہوئی اور وہ دلیر ہو گئی۔

"بوریت کم ہو جائے گی یا زیادہ ہو جائے گی؟"

میں اس کے لہجے میں طنز کا ہلکا سا احساس سن کر چونکا۔

"کیا بات ہے تبسم" میں نے بے حد نرمی سے پوچھا؟۔۔۔ "تم کچھ کہنا چاہتی ہو"۔

اب پناہ اور فرار کا کوئی موقع باقی نہ رہ گیا تھا۔ وہ نڈر ہو کر بولی۔

"آپا ناہید کہتی ہیں کہ میں آپ سے نہ ملا کروں۔ آپ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتے!"

میں حیران و ششدر اسے دیکھتا رہ گیا۔ میری نظریں' تبسم پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر میں تبسم کو نہیں' وہاں ناہید کو دیکھ رہا تھا۔ یہ لمحاتی تجزیہ برق کی سی تیزی سے مجھے سب کچھ سمجھا گیا۔

ناہید کا شکوہ کرنے کا مقصد' ناہید کا مستقبل' ناہید کا حق' میں ہر بات سمجھ گیا تھا اور اب ناہید کا جھوٹ مجھ سے جھوٹ بولنے کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس وقت اس

لڑکی کے بھرم رکھنے کا سوال تھا۔ جس نے ایک بھیانک رات کے سیاہ لمحوں میں مجھے موت کی وادی سے واپس بلایا تھا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کر تبسم سٹپٹائی۔

"تو کیا جو کچھ آپا نے کہا تھا۔ ٹھیک تھا؟"

"ہاں!" میں بے حد دکھ سے بولا۔ اور میری نگاہیں جھک گئیں۔

"تو آپ نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا ہے۔ میں نے کب آپ سے پیار کی بھیک مانگی ہے"۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے کب آپ پر ڈورے ڈالے ہیں۔ اور میں نے کہاں آپ سے محبت کا اظہار کیا ہے؟"

"یہ بات نہیں تبسم!"

"تو پھر کیا بات ہے۔ آپ نے مجھے میری بہن کے سامنے کیوں ذلیل کیا ہے۔ اگر آپ کو مجھ پر شک تھا۔ مجھ سے کوئی شکایت تھی۔ تو آپ مجھے کہتے۔ مجھے ڈانٹتے' مجھے ادائیگی فرض کا احساس دلاتے۔ یہ آپ کو زیب بھی دیتا۔ مگر یہ ہرگز آپ کے شایان شان نہیں۔ کہ آپ نے میری اور میری بہن کے درمیان ایک نہ ڈھا دینے والی دیوار کھڑی کر دی"۔

میں حیرت سے سب کچھ سن رہا تھا۔

"بولئے نا! آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ اب میں اور ناہید آپا ایک گھر میں رہ سکتی ہیں کیا؟ ان حالات میں ہم ایک دوسرے کو برداشت کر لیں گی؟ کیا یہ الزام میرے ذہن و ضمیر کو جلا کر خاک نہ کر دے گا؟"

میں تائید کی پوری سزا پا چکا تھا۔ تبسم نے جو کچھ کہا تھا۔ بظاہر ٹھیک تھا اور اس پر ایک حساس اور ذمہ دار آدمی شرمندگی محسوس کر سکتا تھا۔ بفرض محال میں تائید نہ بھی کرتا تو بھی ناہید کے کہنے سے بہنوں کے درمیان منافرت کی بنیاد تو پڑ چکی تھی۔

تبسم کی دونوں آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں کرسی کھینچ کر بالکل اس کے قریب ہو گیا۔ تبسم نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ میں نے اس کے ہاتھ کھینچ لئے۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔ بچوں کی طرح رونا ایسی باتوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ہمت سے

کام لو۔ تم تو بڑے دل گردے کی لڑکی ہو"۔

مگر تبسم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے لمحوں میں تسلی دینا گویا مزید رلانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

اب میں سوچنے لگا۔ ناہید کی بات کی لاج رکھ کر میں نے ایک ذمہ داری تو پوری کر لی۔ لیکن اس بے قصور لڑکی پر الزام تراشی واقعی قابل غور بلکہ لائق مذمت ہے۔ اگر تبسم کے دل میں کوئی بات تھی۔ اور ناہید نے اسے محسوس کیا۔ تو وہ اسے باقاعدہ ڈانٹ سکتی تھی۔ اسے منع کر سکتی تھی۔ اس نے تبسم سے یہ کیوں کہا کہ ندیم ایسا چاہتا ہے؟

دوسری بات یہ تھی کہ اگر تبسم کے دل میں کوئی بات نہیں تھی تو اس کو اتنی سنجیدگی سے اس کا نوٹس نہیں لینا چاہیے تھا۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ یہاں آ کر اس کی صفائی کرتی۔ جن لوگوں کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ الزام تراشیوں کی اتنی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ لیکن جو لوگ اپنے آپ کو بہت سچا سمجھتے ہیں اور وہ سچے نہیں ہوتے۔ ذرا سے الزام پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

میرے دل میں تبسم کے لئے شبہ اور رحم کے جذبے ایک ساتھ ابھرے۔ اگر یہ لڑکی بے قصور ہے تو اس کے احساسات کو مجروح کرنا اور اس کے نازک سے دل کو ٹھیس پہنچانا واقعی بڑی زیادتی ہے۔

لیکن اگر اس کے دل میں کوئی تمنا تھی اور وہ لبوں تک نہیں آئی تھی اور آج وہ تردید کی زبان میں سامنے آنا چاہتی تھی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ میں نے اس کے خاموش دعوے کو واقعی زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اور یہ رونا اسی بات کا رونا ہے۔

لیکن انسان بیک وقت ایک معین گھڑی میں دو مختلف دسترخوانوں پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اور دو مختلف ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتا۔ اس کے لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ اچھی طرح غور کرے کہ دونوں میں سے بڑی ذمہ داری کون سی ہے۔ اور جب یہ تعین ہو

جائے کہ بڑی ذمہ داری کون سی ہے۔ تو پھر اسی کی طرف قدم اٹھائے' لیکن مجھے تو غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں نے لمحہ بھر بھی نہ سوچا تھا۔ اور ناہید کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ اور برق کی سی تیزی میں ہونے والا یہ فیصلہ شاید غلط بھی نہیں تھا۔ اور غالباً" یہی بڑی ذمہ داری بھی تھی۔

اگر زندگی میں ایسا نازک مقام آ جائے کہ انسان کو دو پرخلوص دلوں میں سے کسی ایک کا ساتھ مجبوراً" چھوڑنا پڑے۔۔۔۔ تو بہتر یہی ہو گا کہ احساسات کی دنیا سے ہٹ کر بالکل دنیاوی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر فیصلہ کرے۔ یقیناً یہ فیصلہ غلط نہیں ہو گا۔

رو دھو کر تبسم دل کا غبار قدرے کم کر چکی تھی۔ آنکھیں دھیرے دھیرے مل رہی تھی اور اب وہ واپس جانے کے قابل ہو گئی تھی۔

میں نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ تبسم نے سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ایک دو لمحے کے لئے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یقیناً اس نے میری آنکھوں میں اپنے لئے شفقت محسوس کی۔ کیونکہ اگلے لمحے اس نے شرم و احترام سے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ ایک عجیب سی کیفت سے سرشار نظر آنے لگی۔

"میں نے جو کچھ کہا تھا۔ کسی بری نیت سے نہیں کہا تھا"۔ میں بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔

"اسی میں ہم سب کا بھلا ہے تبسم!"

وہ اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے دل ہی دل میں اس نے اس کی تائید کی۔

"اگر تم ذرا بھی میری خوشی کا خیال رکھتی ہو تو یہاں سے دل پر کوئی بوجھ لے کر نہ جانا۔ اگر تمہیں ذرا بھی حق شناسی کا دعویٰ ہے تو تم ناہید کے خلاف بالکل بغض نہیں رکھو گی۔ یہ کائنات بے حد وسیع ہے۔ اس میں پیار اور نفرت کرنے کے لئے

تمہیں برابر مواقع ملیں گے جو پیار کے قابل ہوں۔ تم ان سے پیار کرو جو نفرت کے قابل ہوں تم ان سے شدید نفرت کرو۔ مگر اپنی نفرت اور پیار کو اپنے گھر تک محدود نہ ہونے دینا"۔

میں نے محسوس کیا میری باتوں نے اس پر اثر کیا ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے کا کھچاؤ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ملائمت آ گئی تھی۔

"اب مجھے اجازت ہے؟" وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔۔۔۔ لیکن مجھ سے وعدہ کرتی جاؤ' کہ میرا کہا رائیگاں نہیں جائے گا؟"

"میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اور آج سے اور زیادہ عزت کروں گی۔ پھر آپ کا کہا کیسے ٹال سکتی ہوں"۔

مجھے تبسم کے لہجے میں بڑی سچائی محسوس ہوئی۔ بظاہر زیادتی ناہید اور خود میں نے کی تھی۔ اور شرمندہ بے چاری تبسم کو ہونا پڑ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا میں جاتی ہوں"۔

"دیکھو تبسم! آج کی گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم کبھی مجھ سے ملو گی ہی نہیں۔ تمہیں دیکھ کر میں خوش ہوتا ہوں۔ تمہیں قریبی عزیزوں کی طرح عزیز سمجھتا ہوں۔ نہ تمہاری قربت سے خائف ہوں' اور نہ تمہیں کبھی غیر سمجھوں گا۔ میں یہ سب باتیں ناہید کو سمجھا دوں گا کہ تبسم میرے لئے اجنبی کبھی نہیں بن سکتی۔ ملنا ضروری ہو تو ہم ضرور ملیں گے۔ بلکہ میں خود ملنے آؤں گا"۔

تبسم مسکرائی۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے اور اس کے سینے کا بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔

میری صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ ناہید کے بے حد اصرار پر جب میں نے کسی ڈاکٹر کی طرف توجہ نہیں دی تو اس نے آپا جہاں آرا بیگم کی ڈیوٹی لگا دی۔ آپا جہاں آرا بیگم کے سامنے بھلا کون انکار کر سکتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے مجھے پہاڑ پر چلے جانا چاہیے۔

یہ بات مجھے بھی پسند آئی۔ کیونکہ میں تنہائی چاہتا تھا۔ تقریباً پندرہ سو روپے میں نے آڑے وقت کے لئے پس انداز کر لیا تھا۔ اس لئے ناہید کی پیش کش کو بھی میں نے مسکرا کر ٹال دیا۔

مری کے اونچے سرسبز و شاداب پہاڑ پر پہنچ کر میں نے ایک عجیب سی راحت محسوس کی۔ حد نظر تک پہاڑوں کے سلسلے' برف پوش چوٹیاں' سفید بدلیوں کے ٹکڑے' اور شفاف نیلا آسمان۔۔۔ ٹھنڈی ہواؤں کے فرحت بخش جھونکے اور اطمینان و سکون۔

مری میں رہائش کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ وہاں زندگی مہنگی تھی۔ میدانی علاقوں کی ساری دولت وہیں امنڈ آئی تھی۔ شام کو مال روڈ پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر آدمی اپنی امارت کی نمائش کرنے نکلا ہو۔

شگفتہ تازہ اور صحت مند چہرے اور زرق برق لباس۔ خوشحالی۔ بے فکری۔ رنگ اور روپ' بظاہر ہر طرف حسن ہی حسن نظر آتا تھا۔

مری کے چاروں طرف میلوں تک گہری کھائیاں اور اترتی سیڑھیوں کی طرح زمینوں کے نہ ختم ہونے والے چھوٹے چھوٹے قطعے اور جگہ جگہ چیڑ کے لمبے درختوں کے جھنڈ اور دور تک پھیلے ہوئے تحصیل مری کے مقامی لوگوں کے اکیلے دکیلے سرخ مٹی کے گھر۔

رات کو جب ان گھروں میں لالٹینیں اور مٹی کے دیے جلتے تو یوں لگتا کہ آسمان اپنے چمکتے اور ٹمٹماتے ستاروں کے ساتھ زمین پر اتر آیا ہے۔ لیکن لمبے سفر کی تھکن سے ان ستاروں کے چہرے پیلے اور زرد پڑ گئے تھے۔

میں نے سوچا کہ میں زیادہ دن مری قیام نہیں کر سکوں گا۔ مجھے ان گھاٹیوں میں اترنا ہو گا۔ اگر آسمان کو اپنی بلندیوں پر ناز ہے تو پاتال کی گہرائیوں میں بھی ایک انفرادیت ہے۔

مری سے دور بہت نیچے ایک گاؤں میں ٹھہرنے کا انتظام ہو گیا۔

میں مری کے جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ وہیں میری ملاقات بابا سرور سے ہوئی تھی۔ بابا سرور اس ہوٹل میں ملازم تھا۔ تین چار روز میں ہی وہ مجھ سے گھل مل گیا۔ وہ مجھے اچھا آدمی لگا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں مری سے دور کسی پرسکون جگہ میں منتقل ہونا چاہتا ہوں۔ تو اس نے مجھے اپنے گاؤں میں ٹھہرنے کی تجویز پیش کی۔ مجھے یہ تجویز اس لئے بھی اچھی لگی کہ ایک تو بابا سرور جانا پہچانا قابل اعتبار آدمی تھا۔ دوسرا اس نے مجھے اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ میں اس شرط پر راضی ہو گیا کہ وہ ہر ماہ اخراجات کے لئے ایک مخصوص رقم لے لیا کریں۔ بابا سرور کی تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار تھی۔ مگر اتنی رقم گھر کی کفالت کے لئے کافی نہیں تھی۔ اس نے کچھ بھیڑیں بھی پال رکھی تھیں۔ ان بھیڑوں کے دودھ گھی سے ہر مہینے کچھ رقم آ جاتی تھی۔ اور پھر ہر ششماہی بھیڑوں کا اون بھی بک جاتا تھا۔ مرغیاں تو دیہات کے ہر گھر میں پالی جاتی ہیں۔ سیزن میں انڈوں کی مانگ بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔

مجھے بابا سرور کا گھر بہت پسند آیا۔ گاؤں سے پچاس ساٹھ گز ہٹ کر ذرا اونچائی پر۔ سارا گاؤں سینے کے نیچے' گاؤں بھی کیا تھا۔ پندرہ بیس گھر تھے سارے۔

بابا سرور کے گھر کے سامنے چیڑ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اور صحن میں اخروٹ کے تین مختلف درخت۔۔۔ تینوں درخت اونچائی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ تینوں میں زمانے اور وقت کا واضح فرق تھا۔ بابا سرور نے ہنستے ہنستے بتایا تھا کہ یہ سب سے بڑا درخت آج سے اٹھارہ سال پہلے نمو کی پیدائش پر لگایا تھا۔ یہ دوسرا درخت گیارہ برس کا ہے اور تیسرا چھ برس کا۔ یہ دونوں درخت کریم اور رابعہ کی پیدائش پر لگائے گئے تھے۔ میری بیوی اپنے بچوں کی طرح ان درختوں کو بھی عزیز رکھتی ہے۔ ان کا پھل ہم نہیں بیچتے۔ بلکہ رشتہ داروں اور عزیزوں اور دوستوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ میری بیوی کہتی ہے۔ بھلا ہم اپنے بچوں کا خون کیوں کر بیچ سکتے ہیں!

مجھے بابا سرور کی یہ باتیں بہت اچھی لگی تھیں۔ جو لوگ درختوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں وہ اپنی اولاد سے کس قدر پیار نہ کرتے ہوں گے۔

رابعہ، بابا سرور کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ سانولی سی، بے حد باتونی اور موہنی شکل اور صورت کی بچی۔

کریم قد و قامت کے لحاظ سے، اپنی عمر سے زیادہ لگتا تھا۔ اسے فوج میں سپاہی بھرتی ہونے کا بہت شوق تھا۔

نمو جیسے ورثے میں ماں کا ہر خد وخال چرا کر لائی ہو۔ وہی بڑی بڑی گہری سبز آنکھیں، وہی کھلتا رنگ اور وہی بھرا بھرا گداز جسم۔

ماں بیٹی ایک جگہ بیٹھتیں۔ تو بس یہی فرق محسوس ہوتا کہ ایک کے چہرے کو زمانے نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور دوسری کے چہرے کو وقت نے تازگی اور شگفتگی بخش دی ہے۔

جس روز بابا سرور مجھے گاؤں لے گیا تھا تو نمو گھر پر نہیں تھی۔ شام کو جب وہ بھیڑیں چرا کر لوٹی اور اپنے باپ کے ساتھ ایک اجنبی کو باتیں کرتے دیکھا تو وہ ایک لمحہ کے لئے چونکی تھی۔ مگر جب رابعہ نے اسے بتایا کہ پردیسی کافی عرصے تک ہمارے مہمان رہیں گے۔ تو وہ "ہوں" کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ بابا سرور جاتے وقت سب کو بتا گیا تھا کہ

"پردیسی کا بے حد خیال رکھیں۔ وہ صحت کی تلاش میں ہمار دیس آیا ہے۔ وہ کتابیں لکھتا ہے اور بڑا نام والا آدمی ہے۔ گھی، دودھ، مکھن، مرغی، انڈہ سب گھر میں موجود ہیں۔ سبزی وغیرہ میں اوپر سے بھیج دیا کروں گا۔ اور پھر وہ مفت خورہ تو ہے نہیں۔ ہر مہینے معقول رقم دیا کرے گا"۔

باپ کی باتیں سب بچوں کی سمجھ میں اس طرح آئیں۔ جیسے کسی مقدس ہستی کی خدمت کا فریضہ انہیں سونپا گیا ہو۔

ہاں نمو کے احساسات کریم اور رابعہ سے ذرا زیادہ واضح تھے۔ اسے ایسا لگا۔ جیسے وہ آج سے ایک نئی زندگی شروع کرے گی۔ جس میں ایک مخصوص قسم کی وضع داری بھی ہو گی اور خدمت کا جوش بھی۔۔۔ اب اس کی زندگی میں کل کی طرح بے

ساختگی اور قدرتی پن نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک احساس اسے ہر وقت گھیرے رکھے گا کہ ایک پردیسی اس گھر میں رہ رہا ہے۔

اب وہ سورج نکلنے تک مزے کی نیند نہیں سو سکے گی۔ اب وہ بھیڑوں کا دودھ دوہتے ہوئے گنگنا نہیں سکے گی۔ اور رابعہ کی جوئیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے دھیرے دھیرے گا نہیں سکے گی۔ اب وہ اماں کی ڈانٹ ڈپٹ کے سامنے پہلے کی طرح لاڈ ناز نہیں کر سکے گی۔

یہ سب کچھ تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ احساسات تکلیف دہ نہیں تھے۔ ایسی ہستی جس کے وجود کا اتنا مکمل احساس ہو۔ جو روز مرہ کی زندگی میں اچانک نظم پیدا کر دے۔ یقیناً بے حد قیمتی ہستی ہو گی۔

سب گھر والوں نے اپنے اپنے طور سے میرے وجود کو محسوس کیا۔

گاؤں میں پہلی رات گزر گئی۔ صبح میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اپنے شانوں پر رابعہ کے ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

"بھیا اٹھئے نا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے"۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور نیم وا خمار آلود آنکھوں سے رابعہ کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر اس کے گال تھپتھپائے اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے سو گیا۔

رابعہ نے پھر جھنجھوڑا۔

"بھیا اٹھئے نا۔ ہم سب نے نماز پڑھ لی ہے۔ باجی نے کہا ہے۔ پانی گرم ہے۔ وضو کر لیں۔ ورنہ تو پھر نماز قضا ہو جائے گی"۔

"مین نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے غور سے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"تم نے بھی نماز پڑھ لی ہے؟"

"ہاں! میں باجی کی طرح تھوڑی ہوں۔ ابا گھر پر ہوں تو سویرے اٹھ کر نماز پڑھ لیتی ہے۔ ورنہ دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے"۔

میں ہنس پڑا۔ "تو تمہاری باجی ابا سے ڈرتی ہے، خدا سے نہیں ڈرتی"۔

"ہاں ہاں بھیا!" امی بھی یہی کہتی ہے اس سے"۔

میں نے بڑے پیار سے رابعہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"دیکھو۔ آج ہمارے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں رابعہ۔ کل ہم دھلے ہوئے صاف کپڑے نکالیں گے۔ پھر نماز پڑھیں گے اچھا"۔

"اچھا بھیا ٹھیک ہے"۔

رات کو وہ سوتے وقت دودھ لائی۔ تو میں نے اس سے کہا۔

"بھئی میرے سارے کام تم ہی کرتی ہو۔ کریم کو کہا ہوتا۔ وہ لے آتا"۔

"واہ بھیا۔ آپ کس کی بات کرتے ہیں۔ وہ تو شام ہوتے ہی سو جاتا ہے"۔

"اور تمہاری نمو باجی؟"

"وہ تو جاگ رہی ہے۔ پر کہتی ہے مجھے شرم آتی ہے۔ امی نے ڈانٹا بھی۔ مگر باجی کو بس بھیڑیں چرانے اور گیت گانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں آتا"۔

"اچھا تمہاری باجی گاتی بھی ہیں"۔

"گانا تو وہ اتنا اچھا گاتی ہیں بھیا کہ بھیڑیں چرنا بھول جاتی ہیں۔ آس پاس کے سارے بیاہ شادیوں میں وہی تو گاتی ہیں"۔

"خوب لو یہ گلاس خالی ہوگیا۔ تمہیں نیند آ رہی ہو گی"۔

"نہیں بھیا۔ میں تو اب جا کر [illegible] سے کہانی سنوں گی۔ اسے دنیا بھر کی کہانیاں یاد ہیں۔ مگر ہے بڑی جھوٹی۔ رات کہنے لگی۔ میرے پاس اب کہانیاں ختم ہو گئی ہیں۔ تم جا کر پردیسی بھیا سے کوئی نئی کہانی سنو۔ اور پھر ہمیں بھی سناؤ۔ مگر امی نے منع کیا کہ ان کا وقت ضائع نہ کرو۔ وہ رات کو لکھتے یا پڑھتے ہیں"۔

"دیکھو۔ یہ گلاس گر نہ جائے۔ اچھا ہم بھی کسی دن کہانی سنائیں گے۔ اب جاؤ سو جاؤ"۔

صبح جب نمو کی امی چائے لے کر میرے کمرے میں آئی تو میں سو رہا تھا۔ برتنوں کی کھنک سے میری آنکھ کھل گئی۔ ماں کو سامنے دیکھ کر شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اور جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"آپ تو چائے بھی لے آئیں۔ میں آج پھر گہری نیند سو گیا"۔

"بیٹا۔ رات آپ دیر تک جاگتے ہیں نا۔ اس لئے صبح آنکھ نہیں کھلتی۔ رات دیر تک جاگنا صحت کے لئے بہت مضر ہوتا ہے"۔

"ہوں ماں۔ مجبوری ہے مجھے رات کو لکھنا ہوتا ہے"۔

"پر بیٹا۔ جو وقت آپ رات کو لکھنے پر صرف کرتے ہیں۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر کر سکتے ہیں۔ صبح کے وقت آدمی بے حد تازگی محسوس کرتا ہے"۔

"ہاں ماں۔ آپ کا خیال درست ہے۔ مگر برسوں کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ کوشش کروں گا کہ چھٹ جائے"۔

"لیجئے گرم پانی سے غرارے کر لیجئے۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی"۔

ایک ہفتہ تک اپنے اوپر جبر کرنے کے بعد مجھے صبح اٹھنے کی عادت پڑ گئی۔ واقعی میں نے محسوس کیا کہ اتنا طویل عرصہ میں صبح کی مسرتوں سے محروم رہا۔ اب میں صبح صبح چڑیوں کی چہک سنتا۔ پہاڑی تیتر اور چوکروں کی دلنواز صدائیں سنتا--- اور طلوع آفتاب کا نظارہ کرتا۔ اور باد صبا کے جھونکے میرے سینے میں مسرتوں کے جام انڈیلتے۔ اور جنگلی پھولوں کی عطربیزیاں میری روح کو شاداب کر دیتیں۔

قدرت بھی تو یہی چاہتی ہے۔ سب چرند اور پرند سرشام اپنے اپنے گھونسلوں اور آشیانوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور نور کے تڑکے اپنے ٹھکانوں کو چھوڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

صبح صبح جو کچھ لکھتا۔ اور جو سوچتا۔ اس میں ایک عجیب سرشاری، شگفتگی اور روانی ہوتی۔ گویا باد سحری کے جھونکے کیا تھے۔ زندگی اور ادب کے نشیلے جام تھے۔

اب میں نے روز میل دو میل تک ٹہلنے کی عادت بھی ڈال لی تھی۔ واپس آ کر گرم پانی سے نہاتا اور پھر مکئی کی گرم گرم روٹی اور مکھن کا ناشتہ کرتا۔

نمو بدکی ہوئی ہرنی کی طرح میرے قریب آنے سے ہچکچاتی رہی۔ اس بدکنے میں نفرت نام کو نہیں تھی۔ بلکہ ایک عجیب بے چینی اور بے قراری سی تھی۔ وہ جنگلی پھول توڑ کر لاتی اور رابعہ سے کہتی۔

"دیکھ رابعہ تیرے لئے کتنے خوبصورت پھول لائی ہوں"۔!

رابعہ پھول لے کے چھاتی سے لگاتی اور کہتی۔

"میں ان کا گلدستہ بنا کر ندیم بھائی کے کمرے میں سجاؤں گی"۔

اور جب وہ گلدستہ بنا کر مجھے دیتی تو میں مسکرا کر پھول سونگھتا۔ اور پوچھتا۔

"کہاں سے لائی ہو رابعہ۔ ان کی خوشبو تو بہت پیاری ہے"۔

وہ جھٹ کہتی۔ "باجی لائی ہیں بھیا۔ جام گلی کے چشموں سے"۔

میں اشتیاق سے پوچھتا۔ "میرے لئے رابعہ؟"

وہ بڑی بے دردی لیکن معصومیت سے تردید کرتی۔

"نہیں بھیا میرے لئے۔ مگر بھیا وہ آپ کے لئے لائے نہ لائے۔ میں اس کے پاس ایک پھول بھی نہیں چھوڑتی۔ سب آپ کے لئے لے آتی ہوں"۔

"ہوں!" میں ہنس پڑتا۔ "تمہاری باجی برا نہیں مانتیں؟"

"نہیں بھیا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ پاس سلاتی ہے۔ نیند نہ آئے تو لوری دیتی ہے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے پلکیں مل جاتی ہیں"۔

"بھئی رابعہ تم اتنی تعریف کرتی ہو۔ ہم تو نہیں مانتے"۔

"نہیں بھیا۔ آپ سے تو وہ بہت شرماتی ہے۔ ایک روز میں نے کہا باجی' ندیم بھائی کو ذرا گانا سنا دو تو آنکھیں نکال کر اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی۔ ہشت! پھر کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھنے لگی۔ یہ بات تم نے خود کہی ہے رابعہ' یا ندیم بھائی نے تم سے کہی تھی؟"

"اچھا۔" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

میں نے کہہ دیا۔ "ندیم بھائی کیوں کہنے لگے۔ انہیں کیا پڑی ہے تمہارا گانا سننے کی!"

"پھر تو تمہاری باجی جھنجلا گئی ہو گی؟"

"نہیں بھیا۔ وہ تو میرے منہ پر ہلکا سا چپت لگا کر ہنسنے لگی"۔

"تو تمہاری باجی کافی ہوشیار معلوم ہوتی ہیں"۔

"ہوں گی بھیا۔ پر میرے سامنے تو بول ہی نہیں سکتی۔ میں بہت چالاک ہوں بھیا۔ کریم تو بہت سیدھا ہے۔ ابا کہتے ہیں میری بیٹی رابعہ بہت چالاک ہے۔ میرا اور ابا کا رنگ سانولا ہے۔ امی اور باجی اور کریم کا رنگ گورا ہے۔ سب کہتے ہیں میں ابا پر گئی ہوں!"

"اچھا۔"

جب میں اس کی باتوں سے اکتا جاتا۔ تو انگڑائی لے کر اچھا کہتا۔ گھر میں نمو کے سوا سب سے گھل مل گیا تھا۔ سب سے آزادی سے بات کرتا۔ بالکل گھریلو انداز میں۔

مگر نمو---- صبح نکلتی۔ شام کو آتی۔ اس لئے اجنبیت قائم رہی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار' بھیڑیں چرانے کریم چلا جاتا۔ یہ نمو کی صفائی کا دن ہوتا۔ وہ نہاتی کپڑے دھوتی اور سر میں تیل ڈالتی۔

کبھی کبھار مجھ سے نظریں مل جاتیں۔ مگر دوسرے لمحے فوراً شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا کہ وہ دروازے کے درز میں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

نہا دھو کر جب وہ بال خشک کرنے باہر دھوپ میں بیٹھ جاتی تو میں بھی کتاب ہاتھ میں پڑھتے پڑھتے باہر آ جاتا۔ وہ بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھے پھینک دیتی اور بڑی تمکنت سے اٹھ کر اندر چلی جاتی۔

نمو کے اس طرح کے سلوک میں توہین بالکل نہ ہوتی۔ بلکہ میری موجودگی کا نوٹس لینا اس کی شرمیلی فطرت کے عین مطابق تھا۔ اس فرار میں قطعیت نہیں' ایک دلربایانہ شان اور غرور ہوتا تھا۔

وہ ایک تصور سا چھوڑ جاتی تھی۔ ایک رنگین سا لہرا۔

شاید وہ خود بھی کچھ محسوس کر کے جاتی تھی۔

جہاں دو جوانیاں قریب قریب ہوں۔ وہاں احساسات کی کلیاں ضرور پھوٹتی ہیں۔ ارمانوں کے شگوفے ضرور کھلتے ہیں---- اور حسرتوں کے مزار ضرور بنتے ہیں!



ہر شام پھولوں کا گلدستہ بدل جاتا۔

میں نے رابعہ سے پوچھا۔ "رابعہ شہر میں تو لوگ صبح صبح گلدستے سجاتے ہیں۔ تم شام کو میرے پھول بدلتی ہو؟"

وہ بولی۔

"بھیا یہ پھول باجی لاتی ہیں نا۔ چام گلی کے چشموں سے بے چاری شام کو واپس آتی ہے نا اس لئے"۔

"ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر دونوں میں سے احسان کس کا مانوں؟"

"واہ بھیا۔ یہ احسان کی کیا بات ہے۔ پھولوں کا موسم ہے۔ باجی لاتی رہے گی"۔

"مگر یہ تو بتاؤ۔ میرے آنے سے پہلے بھی تمہاری باجی تمہارے لئے پھول لاتی تھی۔"

"نہیں بھیا! بس کبھی کبھی لے آتی"۔

"مگر آج کل تو بڑی باقاعدگی سے لاتی ہیں۔ بالکل ناغہ نہیں کرتیں"۔

وہ تو ذرا امی سے ڈرتی ہیں نا۔ امی کو پتہ ہے۔ آپ پھول پسند کرتے ہیں۔ بھلا

امی کے حکم کو وہ ٹال سکتی ہے"۔

"اچھا!"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

سرور بابا مہینے میں ایک آدھ بار آتا۔ میری صحت دیکھ کر بہت خوش ہوتا بیوی اور بچے میری تعریف کرے تو وہ اور زیادہ خوش ہوتا۔

رابعہ اور کریم کو میں نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے سارے گاؤں کے بچے آنے لگے۔ مجھے بھی اس میں خوشی محسوس ہوتی۔

ناہید کو میں نے ایک خط لکھ دیا تھا۔ مگر اس میں کسی خاص گرم جوشی [illegible] نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا ایڈریس بھی نہیں دیا تھا۔ البتہ شمسہ کی یاد جب بھی [illegible] غم و اندوہ کے کھوہ میں پہنچا دیتی۔

اب اتفاق سے نمو سامنے آ گئی تھی۔ نمو پرکشش تھی۔ دلفریب تھی۔ سیدھی معصوم تھی۔ نہ شمسہ کی طرح جذباتی اور صاحب ذوق تھی اور نہ ناہید کی طرح تعلیم یافتہ اور آن بان والی لڑکی تھی۔

مگر پھر بھی کچھ تھی۔ جو بات نہیں کرتی تھی' مگر دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھی۔ جو پیار نہیں کرتی تھی مگر روح میں اترنے کی استطاعت رکھتی تھی۔ جو آسمان سے زیادہ دور' اور زمین سے زیادہ قریب تھی۔ جو قریب بھی نہیں' اور دور بھی نہیں----- اور جو بہت قریب تھی اور بہت دور تھی۔

نمو کا یہ تعارف کچھ کم نہ تھا کہ ناہید اور شمسہ جیسی لڑکیوں کی موجودگی میں اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔

رات کو جب وادی میں مٹی کے دیئے جل اٹھتے اور مری کی رفعتوں میں برقی قمقمے جگمگا اٹھتے تو عجیب سماں بندھ جاتا۔ یہ برقی قمقمے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح لگتے۔

اور ادھر گھاٹیوں میں دور تک زرد دیئے ٹمٹماتے۔

اپنی اپنی بساط کے مطابق دونوں روشنی بانٹ رہے تھے۔۔۔ اگر ناہید اور شمسہ کسی اونچے محل کے قمقمے تھے تو نمو بھی کسی کے مٹی کے گھر کا چراغ تھی۔

نمو کے ناغے کا دن تھا۔ اس روز کریم کے ساتھ رابعہ بھی بکریاں چرانے گئی تھی۔ سہ پہر کو اچانک بادل گھر آئے اور زور کی بارش ہو گئی۔ دیر تک گیلے کپڑوں میں رہنے سے رابعہ کو بخار ہو گیا تھا۔ شام کو میں سیر سے لوٹا تو اسے دیکھنے کے لئے سیدھا اندر چلا گیا۔ رابعہ نمو کی گود میں سر رکھے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ نمو اس کا سر دبا رہی تھی۔ میری غیر متوقع آمد سے نمو گھبرا گئی اور اپنا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

نمو کی ماں باہر چولہے پر کھانا پکا رہی تھی۔ میں نے بڑے گھریلو انداز میں آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے اس شریر کو؟"

نمو پہلے تو ہونٹ کاٹنے لگی۔ ایک دو لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار بھی ہے"۔

میں نے رابعہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار زیادہ نہیں تھا۔ معمولی سی حرارت تھی۔

"ٹھیک ہو جائے گی۔ ہلکا سا بخار ہے۔ صبح تک اتر جائے گا"۔

"ماں نے بخار کی پڑیا بھی کھلا دی ہے"۔ نمو ہولے سے بولی۔

میں نے رابعہ کی پیشانی سے ہاتھ اٹھایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں مسکرایا۔ رابعہ بھی ہنس پڑی۔

"بھیا!"

نمو اور میں نے آج پہلی بار بہت قریب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نمو کی آنکھوں میں میں نے عجیب سی بوکھلاہٹ دیکھی۔ نمو کی سبز آنکھوں کی یہ بوکھلاہٹ مجھے بے حد دلفریب لگی۔

رات کو میں ڈی ایچ لارنس کی کسی کتاب میں اس حد تک محو تھا کہ پتہ نہیں

چلا کہ دودھ کون اور کس وقت لایا تھا۔ ظاہر تھا کہ رابعہ تو آج دودھ نہیں لائی ہو گی۔

صبح میں رابعہ کو دیکھنے گیا تو نمو باہر جا چکی تھی۔ رابعہ کی طبیعت تقریباً ٹھیک تھی۔ میں نے پوچھا۔

"رابعہ رات میرے لئے دودھ کون لایا تھا؟"

"کیوں بھیا! باجی کو آپ نے نہیں دیکھا تھا۔ وہی تو دودھ لے کر گئی تھی"۔

"اچھا!" میں مسکرایا۔ "دراصل میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اس لئے پتہ نہیں لگا۔ دودھ بھی صبح اٹھ کر پیا"۔

"ہوں!" رابعہ کو غصہ آ گیا۔ میں ایک دن بیمار ہو گئی تو آپ کو دودھ ہی وقت پر نہیں ملا۔ باجی کو اتنی عقل بھی نہیں کہ آپ کو اٹھا دیتی۔ خیر آنے دو۔ آج میں اسے خوب ڈانٹوں گی!"

"پر دیکھ رابعہ کسی اور سے نہ کہنا۔ میرا مطلب ہے امی سے ذکر نہ کرنا"۔

"اچھا آپ کہتے ہیں تو نہیں کہوں گی۔ پر میں خود اس سے ضرور جھگڑا کروں گی"۔

"ہاں تم اسے ذرا ڈانٹ دینا"۔

شام کو نمو واپس آئی تو رابعہ منہ بنا کر بولی۔

"جاؤ باجی ہم تم سے نہیں بولتے"۔

"اری کیوں۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا؟"

"باجی!" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "ندیم بھائی سو گئے تھے تو تم نے انہیں جگایا کیوں نہیں۔ رات کا دودھ انہوں نے صبح پیا۔ بھلا کیا خاک تم ان کی صحت کا خیال رکھتی ہو"۔

نمو رابعہ کے اس ریمارک پر مسکرائی اور چونکی بھی۔ جس وقت وہ دودھ لے کر گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ میں پڑھ رہا تھا بس ذرا مگن تھا۔

نمو سمجھ گئی کہ میں اس کی ٹوہ میں ہوں۔ میری اس تجسس سے نمو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے رابعہ سے کہا۔

"ہاں رابعہ تم کہتی تو ٹھیک ہو۔ مگر سوئے ہوئے کو جگانا بھی تو گناہ ہوتا ہے۔ اور پھر کچی نیند اٹھانے سے صحت پر اور زیادہ برا اثر پڑتا ہے"۔

"ہاں باجی! یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی۔ اچھا تو پھر میں انہیں سمجھاؤں گی۔ بس میری بات تو وہ فوراً مان جاتے ہیں"۔

"تو پھر میرے سامنے ہی بات کرنا۔ تاکہ اگر وہ کچھ عذر پیش کریں تو دونوں بہنیں مل کر انہیں قائل کرلیں"۔

نمو نے جس انداز اور صفائی سے میرے سوئے جانے کی تائید اور تصدیق کی تھی وہ بے حد مسرت آگیں تھی۔ میں مسکراتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آیا۔ رابعہ مجھے دیکھ کر خوشی سے میری طرف لپکی۔

"واہ بھیا۔ آپ سمجھتے ہیں۔ باجی ایسی بے وقوف ہے کہ آپ کو کچی نیند اٹھا دیتی"۔

میں انجان بن کر بولا۔

"کیا بات ہے رابعہ میں سمجھا نہیں"۔

"وہی بات بھیا! جس وقت باجی دودھ لے کر گئی تھی۔ آپ سو رہے تھے۔ باجی نے آپ کو اس لئے نہیں جگایا کہ آپ کی نیند خراب ہو جائے گی۔ اور صحت پر برا اثر پڑے گا"۔

میں نے نمو کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

ایک دوسرے کے جھوٹ کی تائید کر کے ہم نہایت مسرور نظر آ رہے تھے۔

میں نے کہا "رابعہ! میں کب کہتا ہوں کہ تمہاری باجی نے کوئی غلط بات کی ہے۔ سوتوں کو دودھ نہیں پلانا چاہیے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں"۔

"بھیا! آپ کہتے تھے نا۔ ذرا باجی کو ڈانٹ دینا۔ پر بے چاری کی غلطی ہی نہ ہو'

پھر کوئی کس طرح ڈانٹے"۔

نمو بے ساختہ ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

"نہ بھئی رابعہ! تم تو منٹوں میں پول کھول دیتی ہو۔ مجھے خواہ مخواہ شرمندہ کردیا۔ اب تمہاری باجی روٹھ گئی تو؟"

واہ بھیا۔ میری باجی ایسی نہیں ہیں' جیسی میں' ویسی میری باجی۔ میں کبھی روٹھی ہوں جو باجی روٹھ جائیں گی؟"

"مگر تمہاری باجی تو سدا کی روٹھی ہوئی ہے۔ سامنے کھڑی ہے۔ پوچھ لو کبھی ہم سے بات کی ہو تو؟"

رابعہ نے نمو کی طرف دیکھا۔ نمو مسکرا رہی تھی اور آنچل کا گوشہ اپنی انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔

"کیوں باجی۔ تم بھیا سے بولتی کیوں نہیں؟"

میری نگاہیں نمو کے پرحجاب چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نمو نے ہنستے ہوئے رابعہ کی طرف دیکھا۔

کوئی بات ہو تو کریں۔ انہوں نے آج تک ہم سے کسی کام کو ہی نہیں کہا"

دیکھو رابعہ۔ کام وہی اچھا' جو بغیر کہے کیا جائے۔ بات وہی اچھی۔ جو بے ساختہ زبان پر آجائے"

رابعہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی نمو کو دیکھتی رہی۔

رات جب میں سونے کی تیاری کررہا تھا۔ نمو نے چپکے سے تپائی پر دودھ رکھ دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہونٹ چبا رہی تھی۔ ایک دو لمحے کھڑی رہی۔ پھر دروازے کی طرف پلٹی۔ جانے لگی تو میں نے آواز دی۔

"نمو----!"

وہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"بھاگی جارہی ہو۔ جیسے ہم تمہیں کھا جائیں گے"

نمو نے پہلے باہر دیکھا اور پھر مجھے اور پھر اپنا اوپر کا ہونٹ نچلے ہونٹ میں دبا کر نگاہیں نیچے کرلیں۔

میں ایک دو لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"آؤ بیٹھو۔!"

نمو نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر نہ بولی۔ اور نہ بیٹھی۔

"بیٹھ جاؤ نا۔" میں نے اپنے لہجے میں صاف ارتعاش محسوس کیا۔ میری اس جذباتی کیفیت نے نمو کو پوری طرح مسحور کیا۔ کچھ لمحے بڑی ہمت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ مگر اس بے خود کردینے والی سرشاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سٹپٹا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ مگر نمو کے اس فرار نے مجھے پیار اور اپنائیت کا ایک نیا تجربہ دیا۔

پیار کی تڑپ تو میں نے دیکھی تھی۔ مگر حیا کی تڑپ زندگی میں پہلی بار دیکھی---- میں دروازے تک آیا۔ شاید اس تصور کا پیچھا کرنے' جو نمو دروازے سے نکلتے ہوئے چھوڑ گئی تھی۔

باہر اندھیرا تھا۔ ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ دور مری کی بلندیوں پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

نمو کھڑی تھی۔ اپنے کمرے کے ادھ کھلے کواڑ کے سامنے۔ وہ ابھی تک اندر نہیں گئی تھی۔ شاید وہ جذباتی جال کی اس گرفت سے ابھی تک آزاد نہیں ہوسکی تھی۔ جسے خود سپاری اور گریز کے ملے جلے جذبوں نے جنم دیا تھا۔ نمو نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے اچھی طرح واقف تھے۔ مگر دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

دراصل ہم محو گفتگو تھے۔

اس پراسرار خاموشی کے سامنے گفتگو کی وقعت ہی کیا تھی!

شاید نمو کو خیال آیا کہ دودھ دینے میں اتنی دیر تو نہیں لگ سکتی۔ جانے ماں کیا سوچے---- اور دوسرے لمحے وہ چپکے سے اندر چلی گئی اور دھیرے دھیرے کواڑ بند کردیئے۔

میں نے مسکرا کر ٹھنڈی آہ بھری۔ کچھ دیر یونہی غیرارادی طور پر کھڑا رہا اور پھر عجیب سرشاری کے عالم میں گھر سے ذرا دور ایک چٹان پر جا بیٹھا۔ اس دنیا میں اگر عورت نہ ہوتی تو یہ زندگی کتنی پھیکی اور بے رنگ ہوتی۔

یہ من ایک دن شمسہ کے لئے تڑپتا ہے اور دوسرے دن شمسہ کی بے وفائی پر کٹ کٹ جاتا ہے۔ یہ من ایک ساعت میں ناہید کو کائنات کی انمول چیز سمجھتا ہے اور دوسری ساعت میں ناہید کو بوجھ سمجھنے لگ جاتا ہے---- اور یہ من آج پھر جیون کا ساز بجارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس من نے اس سے پہلے کبھی پیار نہیں دیکھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترنگ اسے آج پہلی بار ملی ہے۔

یہ چھوٹا سا من اور لامحدود محسوسات کا سرچشمہ' جہاں پھول ہوگا۔ وہاں نظر ضرور ٹکے گی۔ جہاں حسن ہوگا۔ وہاں یہ سجدہ ریز ضرور ہوگا!

ان چھوٹی چھوٹی مسرتوں کا خالق----

نمو بھاگ جاتی ہے تو دل مچل جاتا ہے۔ نمو کھڑی رہتی ہے تو کائنات ناچتی ہے۔ نمو مسکراتی ہے تو حیات مسکراتی ہے۔ آخر ایسے خالق کا گلا کون گھونٹے گا۔ شمسہ کے لئے سوچ سوچ کر میں اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہ کتنی احمقانہ بات تھی اس کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا کی اس خدائی میں شمسہ کے علاوہ کوئی سچ نہیں ہے۔

یہ کیسی بات ہے کہ باغ کی کسی خوبصورت کیاری میں کھلے ہوئے پھول کو گلاب کا پھول کہوں۔ مگر جنگل میں کھلے ہوئے پھول کو گلاب نہ کہوں۔

دیر تک میں نئی نئی باتیں سوچتا رہا۔ جب خنکی بڑھ گئی اور اوس پڑنے لگی تو آکر سوگیا۔

نمو نے کئی روز تک میرا سامنا نہ کیا۔

میں بے چین تھا مگر اس گریز پائی سے خائف نہیں تھا۔ میرا رقیب کوئی بے حد خوبصورت یا دولت مند آدمی نہیں تھا بلکہ خود نمو کا فطری حجاب یہ کام سرانجام دے رہا تھا۔

زخم کے ساتھ مرہم' دکھ کے ساتھ سکھ' اور تکلیف کے ساتھ راحت۔ یہ سب روابط حیا کی تڑپ کی پیداوار تھے۔

نمو صبح جاتی۔ شام کو آتی۔ گھر کے کام میں سمٹی سمٹی رہتی۔ لیکن جب کھلی فضاؤں میں ٹھنڈی ہواؤں میں اس کی بھیڑ بکریاں ڈھلانوں پر ادھر ادھر بکھر جاتیں تو اس کے من میں چھپی ہوئی امنگیں اور ولولے جاگ اٹھتے اور اس کے سینے میں مچلتے ہوئے نغمے اس کے لبوں پر آجاتے۔ اور وہ اپنی آواز کی لہروں پر سوار خلاؤں کے پیچ و خم میں کھو جاتی۔

حجاب کا یہ پردہ اٹھانے کے لئے اگلے روز میں سیر کے بہانے اس کے پیچھے نکل گیا۔

نمو حسب عادت ہلکی ہلکی پہاڑی لے میں گا رہی تھی۔ میں اس کی نظریں بچاتے دیودار کے ایک درخت کے تنے کی آڑ لے کر گیت سننے لگا۔ وہ اب ایک چٹان پر جا بیٹھی تھی۔

رابعہ سچ کہتی تھی---- "باجی کے گلے میں نور ہے نور!"

نمو کی آواز میں واقعی بے حد لوچ اور رس تھا۔ ایسی آواز کو اگر تشہیر کا موقع ملتا۔ تو بلاشبہ لاکھوں دلوں کو تڑپا کر رکھ دیتی۔ مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔

گیت ختم ہوا۔ تو میں تالی بجاتے ہوئے سامنے آگیا۔

نمو بدک کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"گھبراؤ نہیں" میں ہنس پڑا---- "تمہاری آواز سننے آیا تھا۔ واقعی رابعہ نے سچی تعریف کی تھی۔"

نمو چٹان سے اتر آئی---- "آپ کب آئے؟"

"تمہارے ساتھ ساتھ' تمہارے پیچھے پیچھے!"

"کسی نے دیکھ لیا ہوتا تو؟"

"سب جانتے ہیں کہ ہم ایک گھر میں رہتے ہیں"۔

"گھر کی بات اور ہے۔ اس طرح اکیلے میں تو ہر آدمی کو اعتراض ہو سکتا ہے"۔

"ہر آدمی کو تو ہو گا۔ اگر تم کو بھی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ اور آئندہ کبھی نہیں آؤں گا"۔

نمو خاموش ہو گئی۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔ "بیٹھئے!"

میں مسکرا کر بیٹھ گیا۔ "تم بھی بیٹھو نا!"

نمو بھی چپکے سے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ نمو کی نگاہیں اپنے پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور محسوس کر رہا تھا کہ دنیاداری کے اور کچھ خوف کی وجہ سے اس نے یہ باتیں کہہ دیں تھیں۔ مگر وہ میری آمد پر خوش تھی۔ ورنہ وہ اس طرح پرحجاب لیکن مطمئن اور خوش نہ بیٹھتی۔

"تم تو خاموش بیٹھ گئیں۔ بات نہیں کرو گی تو مجھے محسوس ہو گا کہ میرا آنا تمہیں ناگوار گذرا ہے"۔

نمو ہنس پڑی۔

"آپ کچھ نہیں بولتے۔ میں کیا کہوں۔ آپ کچھ باتیں کریں۔ پھر میں بھی بولوں گی!"

"میں بھی ہنس پڑا!"۔

"یعنی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تو تم بھی نہیں بولو گی؟"

"میں کیا کروں۔ جب سے سوچ رہی ہوں۔ کوئی بات ہی نہیں سوجھتی"۔

"گھر میں تو ہر ایک سے فرفر بولتی ہو۔ میرے معاملے میں اتنا بخل سے کام کیوں لیتی ہو؟"

"نہیں نہیں!" اس نے بے حد زور سے تردید کی۔ "بس جس طرح اب بولنے کو کچھ سوجھتا۔ گھر میں بھی یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا ہے"۔

"مجھے تو تم سے بہت شکوے ہیں نمو! کم و بیش تین مہینے ہو گئے۔ اس عرصے میں گنتی کے چار پانچ جملوں سے زیادہ ہماری گفتگو نہ ہوئی ہو گی۔ تم سب لوگوں کے خلوص و محبت کی وجہ سے میری صحت اس قابل ہو گئی ہے کہ واپس جا سکوں۔ پر سچ یہ ہے کہ میں اتنا جلدی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے ان خوبصورت وادیوں اور گھاٹیوں کو چھوڑ کر افسوس ہو گا۔ مجھے رابعہ، کریم اور امی سے جدا ہو کر رنج ہو گا اور نمو تمہیں چھوڑ کر مجھے دلی صدمہ ہو گا۔ مگر تمہارے دور دور رہنے سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہارے لئے ذہنی بوجھ بنتا جا رہا ہوں۔ ایسے لگتا ہے جیسے میں نے تمہارے قہقہوں پر پابندی لگا دی ہے اور میں نے تمہاری آزادی سلب کر لی ہے۔ اگر واقعی یہی بات ہے نمو۔ تو پھر میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ یہاں سے چلا جاؤں"۔

نمو کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی زمین پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا بوجھ بھی اسی سمت میں تھا۔ داہنے ہاتھ میں ایک تنکے سے وہ زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔

اتنا کچھ کہنے کے باوجود بھی جب مجھے اس کا ردعمل نہ ملا۔ تو مجھے کچھ شک گزرا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ نمو رو رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر سے آنسو لڑھک لڑھک کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔

میرا دل سرشار ہو گیا۔

یہ محبت تھی--- یہ پیار تھا--- یہ آنسو نہیں، وہ کلام تھا جس میں میرے

تمام سوالوں کا مکمل جواب موجود تھا۔

یہ رونا نہیں تھا۔ تین مہینوں کی سرگزشت کا عنوان تھا۔ وہ عنوان جسے نمو کے کنوارے احساس نے تخلیق کیا تھا۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ نمو اسی طرح نظریں جھکائے خاموش تھی۔ میں اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کے سہلانے لگا اور بے حد پیار سے کہا۔

"تم رونے لگیں پگلی! میں نے یہ سب کچھ اس لئے نہیں کہا تھا۔ میں تمہاری کسی سچائی کو جھٹلانے کی جرات نہیں کرتا۔ میری ساری تقریر میں اتنی سچائی نہیں ہو گی جتنی تمہارے ایک آنسو میں ہے۔ بس میری تو اتنی خواہش ہے کہ تمہیں ہنستا کھیلتا دیکھوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے اجنبی نہیں سمجھتیں اور آگے چل کر یہی دانست میرے کام آئے گی۔ اچھا ہوا آج میں یہاں آ گیا۔ اور تمہارا ایک اور روپ دیکھ سکا"۔

نمو کا ہاتھ میں اسی طرح سہلا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری باتیں جس قدر اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اس سے زیادہ اپنائیت اور مسرت اسے ہاتھ سہلانے میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سارے وجود میں ایک انوکھی خوشی سرایت کرتی جا رہی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"اچھا! اب تم ذرا مسکرا دو اور ہنس دو۔ اور میرے ساتھ اتنی باتیں کرو کہ تین مہینے کی ساری کسر نکل جائے"۔

وہ معصوم بچوں کی طرح مسکرائی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہاں شاباش!" میں نے شہ دی۔ "جس خلوص سے تم روئی ہو نمو۔ اب اسی خلوص سے باتیں کرو"۔

"میں کیا کہوں۔ آپ نے تو مجھے خواہ مخواہ رلایا۔ اب سوچتی ہوں کہ میں کس بات پہ روئی تھی تو عجیب سا لگتا ہے"۔

"اب تم ہزار نادم ہوتی رہو۔ ہم نے تمہارے رونے کا مکمل روپ دیکھ لیا ہے۔ یہ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور ہمیشہ کی طرح اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب تم کبھی زندگی میں خود بھی چاہو گی تو یہ روپ نہ دھار سکو گی"۔

"میں نے کیا روپ دھارا ہے۔ مجھے تو سرے سے خبر ہی نہیں۔ پھر بھلا کل کی توقع کیا رکھوں گی"۔

"تم کیا جانو نمو۔ کہ آج تم نے مجھے کیا کچھ دیا ہے۔ تمہارے آنسوؤں میں وہ دیئے جھلملا رہے تھے جو پیار کی منزل کی رہنمائی کرتے ہیں"۔

"ہوں۔۔۔!" وہ ہنس پڑی۔ اس ہنسی میں کسی حد تک حسرت کا عنصر بھی شامل تھا۔

"نمو، تمہاری ہوں' بڑی گہری تھی۔ اس میں آس اور یاس دونوں جذبوں کی گھمبیرتا تھی۔ خدا نہ کرے۔ تمہاری امیدوں کا کوئی چراغ گل ہو۔ تمہاری ہوں میں اتنے معنی پوشیدہ نہیں ہونے چاہئیں"۔

اب تو وہ کوئی تاثر دیئے بغیر ہنس پڑی۔

"آپ تو مکڑی کے جالے کی طرح باتوں کو پکڑتے ہیں۔ بھلا میں ایسی گہری باتوں کو کیا سمجھوں؟"

میں بھی ہنس پڑا۔ نمو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگرچہ دلی احساسات کی کوئی نہ کوئی جھلک اس کے لہجے یا چہرے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ مگر اس سادہ لڑکی کو اس کا کوئی علم نہ ہوتا تھا۔۔۔ وہ پیار کر سکتی تھی۔ یہ اس کی فطرت تھی۔ مگر میری طرح اس کا ذہن پالش نہیں تھا۔ اور نہ وہ میری طرح غیر معمولی مطالعے اور مشاہدے سے گزری تھی اور نہ ہی میری طرح جنس اور پیار کے تجربوں سے مسلح تھی۔

میں اس بات کو بھی سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے اندھا اعتقاد رکھتی ہے۔ نمو جیسی لڑکی کے کردار سے یہی کچھ متوقع بھی تھا۔۔۔ وقار و حجاب نے جو ایک مصنوعی سی اجنبیت پیدا کر دی تھی۔ وہ بھی آج ختم ہو گئی۔

وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آیئے آپ کو چام گلی کا چشمہ دکھا آؤں"۔ میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔

"آیئے نا! آپ اس طرح دیکھتے ہیں تو میں گھبرا جاتی ہوں"۔

"چلو!"

دو چار قدم جانے کے بعد میں نے پوچھا۔

"دیکھو نمو! مجھے واپس بھی جانا ہے۔ چشمہ زیادہ دور تو نہیں؟"

"ارے نہیں۔ وہ دیکھئے سامنے تو ہے"۔

نمو ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی اتر گئی۔ میں ایک چٹان سے دوسری چٹان کا سہارا لے کر اور قدم جما جما کر بڑی احتیاط سے نیچے اتر رہا تھا۔ نمو نے یہ سب دیکھا۔ تو بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ارے آپ تو ڈرتے ہیں"۔ وہ نیچے سے چلائی۔ "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہاں کی زمین پھسلن نہیں ہے۔ اور پتھر بھی بڑے کھردرے ہیں۔ خوب مزے سے اتریں جسم کا وزن ذرا پیچھے رکھیں"۔

میں کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا۔ نمو' دور ایک چٹان پر کھڑی ہنس رہی تھی۔ وہ پھر چلائی۔

"میں آؤں۔۔۔؟"

نمو کی آواز صدائے بازگشت بن کر دور تک گھاٹیوں میں پھیل گئی۔ اور چاروں طرف سے میں "میں آؤں۔۔۔ میں آؤں" کی صدا گونج اٹھی۔

چشمے کا پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ میں نے خوب جی بھر کر پیا۔ نمو نے ہاتھ پاؤں دھوئے پھر بولی۔

"اس چشمے کو پیر کی دعا ہے۔ پھوڑے پھنسی کے مریض تین دن نہائیں تو ان کا سارا دکھ دور ہو جاتا ہے"۔

میں پہلے تو حیران ہوا۔ پھر خیال آیا۔ چشمے کے پانی میں ضرور کوئی کیمیائی تاثیر

ہے جو شفا بخش ثابت ہوتی ہے اور اب یہاں کے لوگوں نے اس سے یہ روایت وابستہ کر دی ہے۔

سہ پہر کو گھر پہنچا تو رابعہ مجھ سے جھگڑ پڑی۔

"بھیا! آپ ذرا بھی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ صبح کے گئے اب آئے ہیں۔ کھانا بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ ہم تو سمجھے آپ اوپر مری چلے گئے۔ مگر مری بھی نہیں گئے تو پھر کہاں گھومتے پھرے ہیں؟"

"رابعہ! آج گہرے گہرے کھڈوں اور گھاٹیوں کی سیر کا شوق چرایا تھا۔ سوچا اونچی اونچی چوٹیوں پر تو لوگ جاتے ہیں۔ نیچے پستیوں کی طرف کوئی نہیں جاتا"۔

"واہ بھیا! مجھے کہتے۔ میں بھی ساتھ چلتی۔ اکیلے کسی کھڈ میں گر پڑتے تو کون آپ کی مدد کرتا"۔

"ہاں بھئی۔ اس کا خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ پر بہت بعد میں"۔

"میں ساتھ ہوتی تو آپ کو چام گلی کے چشمے پر لے جاتی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوتے وہاں باجی بھی ہوتی۔ ارے بھیا! بڑی غلطی ہو گئی۔ میں آپ کو کسی جھاڑی کی اوٹ میں چھپا دیتی اور باجی سے گیت کے لئے کہتی۔ آپ باجی کی آواز سن کر جھوم جھوم جاتے"۔

میں نے ہنس کر رابعہ کو گود میں اٹھا لیا۔

"واقعی تجویز تو تم نے خوب سوچی ہے"۔

تو پھر کسی روز آپ چلیں میرے ساتھ۔ بس مزہ آ جائے گا۔ اچھا تو آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر امی کو چائے کے لئے کہہ دوں؟"

"ہاں چائے پی لوں گا۔ تھکاوٹ دور ہو جائے گی"۔

"ابھی بنوا کے لاتی ہوں بھیا۔ ابھی!"

"رابعہ بھاگ کر چلی گئی۔

نمو کی یہ باتونی اور معصوم بہن مجھے ہمیشہ کی طرح اچھی لگی۔



سیزن ختم ہو چکا تھا۔

چند دنوں تک برف باری شروع ہونے والی تھی۔ لوگوں نے گھروں میں خشک لکڑیوں کا کافی ذخیرہ کر رکھا تھا۔ بابا سرور کو ہوٹل سے چھ مہینے کے لئے چھٹی مل گئی تھی۔ کیونکہ سیزن ختم ہونے کے بعد مری کے ہوٹل اگلے سیزن تک بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اس نے اپنے اور نمو کے لئے نوکری ڈھونڈ نکالی تھی۔

وہیں ہوٹل میں اس کی ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوئی تھی جو اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ مری آئی تھی۔ تین چار روز ہوٹل میں ٹھہریں۔ پھر انہوں نے ایک کوٹھی کے تین کمرے کرائے پر لے لیے اور وہیں منتقل ہو گئیں۔ بڑی لڑکی امید سے تھی۔ اس کا شوہر کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔ چند دن کے بعد لڑکی کے بچہ پیدا ہو گیا۔ چھوٹی لڑکی چند دن مری رہ کر واپس چلی گئی۔ مگر ماں بڑی لڑکی کے ساتھ وہیں رہ گئی تھیں۔ سیزن کے بعد مری بالکل ویران ہو جاتی ہے۔ لیکن لڑکی کو اصرار تھا کہ وہ واپس نہیں جائے گی اور سردیاں بھی یہیں گزارے گی۔ ماں نے بیٹی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور طے ہوا کہ ماں اور بیٹے کی خبر گیری کے لئے کوئی معقول انتظام ہو جائے تو لڑکی کی والدہ واپس چلی جائے۔

چنانچہ اس سلسلے میں جب ان کی بات بابا سرور سے ہوئی تو اس نے نہ صرف لڑکی کی نگہداشت کی ذمہ داری اٹھائی' بلکہ چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کے لئے نمو کی خدمات بھی پیش کر دیں۔

اسی روپے ماہوار پر بات طے ہوئی تھی۔ سردیوں کے موسم میں اتنی رقم کا آسرا مل جانا وہاں کے لوگوں کے لئے بڑی بات تھی۔

چنانچہ آج بابا سرور اسی سلسلے میں گھر آیا ہوا تھا۔ اور صبح نمو کو ساتھ لے کر اسے واپس جانا تھا۔

نمو اداس تھی۔

وہ جانتی تھی۔ میں چھ ماہ کے لئے آیا تھا۔ سیزن ختم ہو چکا تھا۔ میری صحت قابل رشک حد تک بحال ہو چکی ہے۔ مگر واپس جانے کے بجائے یہاں رہ رہا ہوں۔ ظاہر ہے نمو کی قربت کے لئے۔

اس کی غیر موجودگی میں شاید واپسی کا ارادہ کر بیٹھوں۔ مگر اس بے چاری کو تو مری جانا تھا۔ یہ اس کے ابا کا فیصلہ تھا۔

نمو کی جدائی کو میں یقیناً محسوس کر رہا تھا۔ میری آتما کو شمسہ نے جو گھاؤ لگایا تھا۔ بلاشبہ نمو نے اس پر مرہم رکھا تھا۔

ناہید پیار کے روپ میں جنسی احتیاج بن کر آئی اور چلی گئی۔ شمسہ کے دیئے ہوئے دکھ کو وہ سکھ کا روپ نہ دے سکی۔ مگر نمو نے تو اس زخم پر پھاہا رکھ کر اس کی جلن اور ٹھیس بہت حد تک کم کر دی تھی۔

نمو اب بھی مجھ سے اتنی ہی دور تھی۔ جتنی آج سے چھ مہینے پیشتر تھی۔ مگر یہ دوری ذہنی اور قلبی طور پر نہیں تھی۔ بلکہ اک لحاظ سے میں اسے قربت سے بھی زیادہ قیمتی سمجھا۔۔۔ یہ حجاب' یہ جھجک' یہ حیا' یہ تذبذب' یہ کشمکش اور یہ پا بہ زنجیر گریز۔۔۔

زندگی کے کیسے کیسے حسین روپ تھے۔۔۔ اگر میں نمو کو نہ دیکھتا تو عورت کا

یہ روپ کہاں سے دیکھتا؟

نمو کے بغیر سوچنے کا یہ انداز کہاں سے پاتا؟

کل نمو مری چلی جائے گی اور پھر مہینے میں ایک آدھ بار ہی آئے گی۔ اب میں روز کی طرح بکری کا دودھ دوہتے دوہتے اس کے شرمیلے تبسم سے محظوظ نہ ہو سکوں گا۔

نمو کے رویے میں جو بھاگی بھاگی سہمی سہمی کوملتا تھی۔ اسی نے اسے انمول بنا دیا تھا۔ اس سہمے سہمے پیار کا کھچاؤ۔ اس دھیمی دھیمی آنچ کی حرارت میں مری سے بھی محسوس کروں گا۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ میں کچھ لکھ رہا تھا۔ نمو چپکے سے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میں نے بے حد پیار سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا اور پھر نرمی سے بولا۔

"آج کتنے دنوں بعد تم سے سامنا ہوا ہے"۔

"میں کیا کروں۔ آپ کو دودھ دینے کے سلسلے میں رابعہ کسی کا کہنا تھوڑا مانتی ہے۔ آج اس کی منت کر کے دودھ لائی ہوں"۔

"کل تم جا رہی ہو۔ اچھا ہوا دو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ آؤ بیٹھو"۔

"نہیں میں جا رہی ہوں۔ ابا نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئے ہوں گے!"

میں سٹپٹا گیا۔

"نمو پھر منہ دکھانے کیوں آ گئی تھیں"۔

نمو بھی ہونٹ چبانے لگی۔

"میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں کیا کروں؟"

نمو کی آواز کی لرزش سن کر میں اپنی کوفت بھول گیا۔ چند لمحے خاموشی سے ہونٹ کاٹتی ہوئی نمو کو دیکھتا رہا۔ پھر بے حد نرمی اور پیار سے بولا۔

"جاؤ۔۔۔ جاؤ چلی جاؤ!"

مگر نمو کھڑی رہی' ہونٹ کاٹتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی۔ ایک عجیب سی بے بسی اس کی آنکھوں میں لرزاں تھی۔

مجھے اپنا احتجاج کتنا بے معنی سا لگا۔ وہ دور کب تھی بے چاری۔ میں نے قلم تپائی پر رکھ دیا اور اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔ نمو نے نگاہیں جھکا دیں۔ میں نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں ناراض تو نہیں ہوا پگلی۔ میں کبھی تم سے ناراض ہو سکتا ہوں---- ہاں مری جا کر بھول نہ جانا۔ کبھی کبھی خط لکھنا---- کسی سے لکھوا لینا"۔

نمو نے اثبات میں سرہلایا۔ اس کی نگاہیں اسی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ میں اس کے حجابی شہابی چہرے کو بے حد پیار سے دیکھ رہا تھا۔

"بس اب تم جاؤ۔ سو جاؤ"۔

نمو نے نگاہیں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ آنکھوں کے ایسے تصادم میں جیون کا کتنا بڑا سکھ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں' جن کی جھولی میں کبھی وقت نے ایسے موتی بھر دیئے ہوں۔

نمو امنگوں بھرا دامن لے کر چلی گئی۔

جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ لالٹین اسی طرح جل رہی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں میں گدگدی محسوس کی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا نمو والہانہ انداز میں اپنے گال میرے پاؤں سے سہلا رہی تھی۔ یہ خوشی شمسہ اور ناہید دونوں کی محبت کی خوشی سے انوکھی' نرالی اور ممتاز تھی۔ نمو کی عقیدت اور وارفتگی کو دیکھ کر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ پاؤں کھینچ لوں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں پھول کی طرح تھامے ہوئے تھی۔

پاؤں کھینچے بغیر میں بڑی احتیاط سے اٹھ بیٹھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں نمو کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے گلابی ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور اس کی گول حسین ٹھوڑی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"نمو!"

میری آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ مگر رندھے ہوئے گلے کی یہ جذباتی آواز نمو نے سن لی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ میں نے دونوں شانوں سے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کی پیشانی پر تازہ سجدے کا نشان دیکھ کر میں اس کی طرف جھک گیا۔

"تم نے شاید ابھی ابھی نماز پڑھی ہے نمو؟"

"ہاں!"

وہ بے حد ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ اس کی سبز آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ ایک انمٹ جذبہ ایک لازوال احساس---- ان سبز آنکھوں میں نیلے آکاش کی طرح سادگی اور سندرتا' اور نیلے ساگر کی طرح گہرائیاں تھیں۔

یہ لڑکی ابھی ابھی خدا کے حضور میں سجدہ کر کے آئی ہے' اور اب یہ اپنے محبوب کے قدموں میں سجدہ ریز ہے۔ وہ جس خلوص سے خدا کے حضور میں جھکی تھی۔ اسی عقیدت سے اپنے محبوب کے پاس آئی ہے۔

اس کی کنواری آنکھوں کی لازوال چمک نے مجھ سے کہا۔

"ندیم---- دیکھ آج خدا نے تم پر اپنا وجود عیاں کر دیا ہے!"

بے شک خدا اتنا ہی حسین ہو گا---- ہاں---- اگر یہی روپ ہے اس کا تو بلاشبہ وہ خدا ہی ہو گا۔

یہ لڑکی ابھی ابھی نماز پڑھ کر آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ذہن آلودگی سے پاک ہے۔ وہ میری گود میں بھی وہی مصفے و منزہ دل لے کر آئی ہے۔ جسے لے کر وہ خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہوئی تھی۔

نمو نے خدا اور انسان کے پیار کو ایک ہی درجہ دیا۔

جس طرح انسان خدا کے حضور میں پہنچ کر اپنے وجود کو بھول جاتا ہے۔ بالکل

اسی طرح آج اس نے خود کو پیار کی گود میں پھینک دیا ہے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ خدا کی طرح پیار بھی آدمی کا محافظ ہوتا ہے۔

ایک دن شمسہ نے بھی سسکتے ارمانوں کے ساتھ خود کو میری آغوش میں گرا دیا تھا۔ لیکن اس روز آج کی طرح مقدس احساس نے میرا سینہ منور نہیں کیا تھا--- مجھے یاد ہے کہ چند دنیاوی باتوں نے مجھے شمسہ کی عزت کا نگہبان بنا دیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی جو میرے ادب سے مرعوب تھی پر مزید اپنی عظمت کا سکہ بٹھانا مقصود تھا۔

آج میں نے محسوس کیا کہ جھوٹی عظمت کی خاطر کسی عصمت کی نگہبانی کرنے سے تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ خود کو ہر قسم کے فریب سے الگ کر کے سیدھے سادے فطری تقاضوں سے سمجھوتہ کر لے۔

ساری زندگی شمسہ مجھے فرشتہ سمجھتی رہے' یہ کتنا بڑا دھوکہ ہے۔

ناہید مجھے آدمی سمجھتی رہے۔ یہ فرشتے سے کم درجے کی عزت ہے۔ مگر دھوکہ تو نہیں!!!

لیکن--- آج کا مقدس جذبہ شمسہ اور ناہید دونوں کے تعلق اور احساسات سے الگ' انوکھا اور ارفع و اعلیٰ تھا--- آج مجھے مکمل احساس تھا' اور میں اپنے آپ سے پوری طرح باخبر تھا۔ آج نہ مجھے فرشتہ بننے کی تمنا تھی اور نہ مجھے فطری تقاضوں کے جواز اور تکمیل کی لگن تھی۔

آج تو میں نے ایک انسان کی آنکھوں میں خدا کا روپ دیکھا تھا۔ آج میں نے پیار دیکھا تھا۔ خلوص دیکھا تھا۔ عقیدت دیکھی تھی--- آج میں نے جیون کا سب سے بڑا سچ دیکھا تھا۔

نمو کی گہری آنکھوں مین جنسی شعلے کی لپک کے بجائے عمیق طمانیت تھی---

اس کے عنابی ہونٹوں پر جنسی ارتعاش کے بجائے لطیف فردوسی تبسم تھا۔

وہ لڑکی جو مجھ سے بھاگی بھاگی' سہمی سہمی' دور دور رہتی تھی تو کتنی حسین تھی

اور یہ لڑکی جو آج اپنی تمام قلبی واردات اور ذہنی معصومیتوں سے مسلح ہو کر میرے پہلو میں بیٹھی ہے تو کتنی حسین ہے۔

اس نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھوں سے اپنے چہرہ کھینچ لیا۔ اور مسکرا پڑی۔

"آپ مجھے اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ اب آئی ہوں تو کچھ بات کریں نا"۔

میں ہنس پڑا۔

"تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ باتیں تو ہو رہی ہیں نمو"۔

"ہوں---- یہ بھی کوئی باتیں ہیں"۔

"تو پھر اور کیا کہوں--- تم نماز پڑھ کے آئی ہو۔ تمہارے چہرے پر نور ہی نور برس رہا ہے۔ بس اسی کو دیکھ رہا ہوں"۔

"میں نے آپ کے لئے بھی دعا مانگی تھی"۔

"کیا---؟" میں نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"کہ خدا آپ کو سلامت رکھے"۔

"بس!"

"جو من میں آیا کہہ دیا۔ میرے نزدیک یہی سب سے بڑی بات تھی"۔

"بات تو بہت بڑی ہے نمو۔ پر میں چاہتا تھا کہ تم کچھ اور دعا مانگتیں"۔

"وہ آپ مانگ لینا۔ میں تو ایک وقت میں اللہ سے ایک ہی سوال کر سکتی تھی"۔

"اللہ سے جو مانگو مل جاتا ہے۔ اس کے خزانے میں کس بات کی کمی ہے"۔

"پھر آپ مانگتے کیوں نہیں؟"

"میں تمہاری طرح معصوم نہیں ہوں۔ شاید اللہ میاں سوچنے لگ جائیں۔ مگر تمہارے معاملے میں تو ذرا بھی دیر نہیں ہو گی"۔

"نہیں! میں اللہ میاں سے اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ اتنا کچھ دے رکھا ہے' خواہ مخواہ ناشکری کیوں بنوں"۔

"اچھا!" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا۔ "گویا تم بہت امیر ہو؟"

"ہوں تو!"

میں ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگا۔

"مگر تمہارے ہاتھ کی لکیروں میں تو ایسی کوئی امارت نہیں لکھی"۔

"روپیہ پیسہ نہ ہو گا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔

"پھر تم امارت کسے کہتی ہو؟"

"من سکھی ہو۔ اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"میں نے فرط عقیدت سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"نمو تم۔۔۔! تم ان باتوں کو سمجھتی ہو؟"

"واہ! اتنی سیدھی سی بات ہے۔ اس میں اچنبھا کیسا"۔

میں اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ میں اس وقت بہت خوش تھا۔ نمو نے لاڈ سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"آپ اس طرح مسکرا مسکرا کر مجھے کیوں دیکھتے ہیں"۔

"نمو! میری روح مچل رہی ہے اور دل کہتا ہے۔۔۔ کاش دنیا میں تمہیں اس طرح دیکھنے کے سوا میرا کوئی اور کام نہ ہوتا!"

"واہ! ساری زندگی کوئی ایک جگہ بیٹھ کر کسی ایک چیز کو تھوڑا دیکھ سکتا ہے"۔

"یہی شکایت تو میں خود کر رہا ہوں"۔

"شکایت کیوں کرتے ہیں۔ اگر اللہ میاں کو یہ اچھا لگتا تو وہ ساری دنیا اسی ڈھب پہ بنا دیتے"۔

"بس نمو۔ یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اللہ میاں نے یہ دنیا کس ڈھب کی بنائی ہے۔ دل پیار کرتا ہے اور ذہن کسی دوسری طرف غوطہ کھا جاتا ہے۔ بنانے والے نے آنکھیں تو دے دیں۔ مگر پھر بھی انسان راہ بھول جاتا ہے۔ دماغ دیا مگر

دھوکے سے بچنے کی قوت نہ بخشی۔ نمو اللہ میاں نے کوئی کام بھی تو مکمل نہیں کیا"۔

"ہائے۔۔۔!" نمو تڑپ گئی۔ "یہ آپ اللہ میاں پر گلہ کیوں کرتے ہیں۔ اللہ میاں بھی بھلا کوئی کام ادھورا چھوڑ سکتے ہیں!"۔

مجھے محسوس ہوا کہ مجھے کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جو نمو کی ذہنی سطح سے اونچی ہو اور جو اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس سے اس کا ذہن الجھ جائے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں اللہ میاں سے بہت پیار ہے نمو؟"

"ہائے۔۔۔ آپ کو نہیں کیا؟"

وہ اس بے ساختگی سے اور خلوص سے ہائے بولتی۔ جس میں احتجاج اور پیار دونوں ہوتے۔ میں اس کی سادگی کے سامنے ہار گیا۔

"نہیں نمو۔ اللہ میاں سے کون پیار نہیں کرتا۔ مگر تم جیسی یقین اور صداقت میرے سینے میں کہاں سے آئے گی"۔

نمو نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کے لئے کوئی اور بات کریں۔ آپ اللہ میاں کو درمیان میں نہ لائیں"۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو نمو۔ بہت اچھی لڑکی۔ خدا کا خوف تمہیں کتنا قیمتی بنا دیتا ہے۔ ایمان کی چنگاری تمہیں کس قدر تڑپا دیتی ہے"۔

اس کی قلبی طہارت اور پاکیزگی میرے دل میں اور بیٹھ گئی۔۔۔ بلاشبہ یہ لڑکی ذہن میں کوئی کھٹکا لے کر میرے پاس نہیں آئی۔۔۔ وہ سادہ دل اور معصوم ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر ہے۔ اس کی زندگی میں ماں باپ کا پیار اور بہن بھائیوں کی محبت ہے۔ اور خدا کا نور ہے۔۔۔ بس۔۔۔ اس کے سوا اس کی محدود دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔

میں نے سوچا۔۔۔ میں اس کی معصوم روح میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہیں دوں گا۔ اور میں اس کے مقدس ضمیر پر پھول جتنا بوجھ بھی برداشت نہیں کروں گا۔

میں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور اس کی سبز آنکھوں پر اس طرح جھک گیا۔ جیسے آج میں زندگی کی ساری سچائی اپنی آنکھوں کے ساغر سے اس کے نینوں میں انڈیل دینا چاہتا ہوں۔

سچ سچ۔ اس لمحے میں مجسم صداقت تھا۔ اور خود کو کسی ڈالی میں کھلے ہوئے پھول کی طرح اجلا' سبک اور حسین محسوس کر رہا تھا۔

بے شک یہی پیار ہے۔ یہی ہے سچ--- اس سے آگے جو دنیا ہے وہ ممکن ہے پھول کی طرح سبک ہونے کے بجائے ٹھوس اور متحرک ہو۔ زیادہ نتیجہ انگیز ہو---

لیکن اس دنیا کی زندگی محض ایک قطرۂ خون سے عبارت ہے!

قطرۂ خون ہو گا تو یہ دنیا آباد رہے گی۔ قطرۂ خون نہ ہو گا تو یہ دنیا خود بخود پیروں سے کھسک جائے گی۔

اور نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔

رات چپکے سے گزر گئی۔

صبح نمو بابا سرور کے ساتھ مری چلی گئی۔

اسے گئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا--- نمو مجھ سے بہت قریب کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ سوائے اس رات کے جس دن اس نے مری جانا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ نظروں کے سامنے نہ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ دنیا جہاں کی ساری خوشیاں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔

اور میں دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔

اگلے دن اس کا خط ملا۔ بے حد دلچسپ' بے حد بھرپور' خط کیا تھا' صد سالہ شراب کا ایک جام تھا۔ جس نے سات طبق روشن کر دیئے۔

لکھا تھا:

اچھے بابو جی!

آپ سے وعدہ کیا تھا نا خط لکھنے کا۔ دیکھئے لکھ رہی ہوں۔

ہمارے ہاں ایک بابا آتا ہے۔ سفید سی عینک لگاتا ہے۔ بالکل بوڑھا ہے۔ پوپی کے لئے دودھ لاتا ہے۔ میں نے اس کی بہت منت خوشامد کی۔ پہلے اس کی بیٹی بنی۔ پھر رازدار بنایا۔ مجھے بہت سمجھاتا رہا۔ مگر میری محبت کے سامنے ہار گیا۔ آخر خط لکھنے پر راضی ہو گیا۔ پر امی' کریم اور رابعہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کہہ دیجئے۔ شہر سے کسی عزیز کا خط آیا ہے۔

بابو جی! آپ اتنا عرصہ رہے۔ کبھی کھل کر بات نہ ہوئی۔ یہ بات تو نہیں کہ مجھے بات کرنا نہیں آتی---بات کرنا تو آتی ہے۔ مگر آپ کے سامنے بول نہیں سکتی۔ آج آپ سامنے نہیں تو بہت کچھ بولنے کو جی چاہتا ہے۔ آج میں بولوں گی بابو جی۔ آپ سمجھیں گے۔ مجھے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ قسم کھاتی ہوں۔ یہ بات نہیں۔ میں ذرہ بھر نہیں بدلی۔ میں بدلوں گی بھی نہیں--- مگر جو میرے دل میں ہے وہ کہنا ہی بہتر ہے۔ دل کی دل میں نہیں رکھنی چاہیے۔

بابو جی! پوپی بہت پیارا بچہ ہے۔ اتنا گورا چٹا' خوبصورت اور ہنستا کھیلتا بچہ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہو گا--- میری مالکن بھی بہت اچھی ہیں۔ بس کیا بتاؤں۔ میں نے تو ایسی خوبصورت عورت زندگی میں دیکھی ہی نہیں۔ پر جانے کیا بات ہے اداس اداس رہتی ہے۔ کم بولتی ہے' کم ہنستی ہے۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہے۔ پوپی کو جتنا میں پیار کرتی ہوں' مالکن نہیں کرتیں۔

ایک روز مجھ سے چائے کے سارے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ میں مارے شرم کے کٹ کٹ گئی۔ مگر ان کے ماتھے پر تیوری تک نہ آئی۔ بابو جی ایک رات ہم سونے لگے۔ پوپی میرے پاس سویا ہوا تھا۔ مالکن نے جھک کر اس کا بوسہ لیا۔ اور پھر رو پڑیں۔ میں حیران رہ گئی۔ وجہ

پوچھی تو بولیں۔

"کوئی بات نہیں نعیمہ۔ ویسے دل بھر آیا تھا!"

شاید اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں گی۔ وہ ولایت گیا ہوا ہے نا۔ پوپی نے باپ کو اور باپ نے پوپی کو نہیں دیکھا۔

بابو جی! میں گاؤں آؤں گی۔ پوپی بھی ساتھ ہو گا۔ آپ پوپی کو بہت پیار کرنا اور ہر وقت اسے پاس رکھنا۔ پھر پوپی کے بہانے میں بھی آپ کے پاس رہوں گی۔ پوپی آپ سے بہت جلد گھل مل جائے گا۔ وہ اپنوں اور غیروں سب کو ایک جیسے ملتا ہے۔ پھر آپ پوپی سے بہت باتیں کرنا۔ جس طرح رابعہ کو بیچ میں رکھ کر ہم باتیں کرتے تھے۔ اب پوپی کو بیچ میں رکھ کر باتیں کریں گے۔ پوپی بے چارہ رابعہ کی طرح چالاک تھوڑا ہے۔

بابو جی! جب آپ کمرے میں نہیں ہوتے تھے۔ تو میں چوری سے آپ کے کمرے میں جاتی تھی۔ آپ کے کپڑوں کو سونگھتی تھی۔ آپ کے کپڑوں کی خوشبو مجھے دیوانہ بنا دیتی تھی۔ میں بے خود ہو جایا کرتی تھی۔

آپ کی باتیں بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ دل چاہتا تھا بس آپ کی باتیں سنتی رہوں۔ اب کے آؤں تو مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کرنا۔ میں جانا چاہوں تو میرا راستہ روک لینا۔ میری کلائی پکڑ لینا اور مجھے نہ جانے دینا۔ میں شرم کی ماری چلی تو جاتی ہوں۔ مگر پھر رات بھر جلتی اور کڑھتی رہتی ہوں۔

میں نصیبوں جلی کتنی آپ سے دور دور بھاگتی تھی۔ مگر آپ بھی میرے دل کی بات نہ جان سکے۔ میں کئی بار چپکے چپکے روئی تھی۔ مگر آپ نے تو میرے من کے بھید کو پکڑنے میں بہت دیر کر دی۔

بابو جی! میں نے اپنی سکھیوں کے سامنے آپ کے پیار کے متعلق بہت جھوٹ بولے ہیں۔ شکر ہے۔ اللہ نے سب سچ کر دیئے۔

بابو جی! شہر میں تو میری مالکن جیسی خوبصورت عورتیں رہتی ہیں۔ پھر آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے؟ چھوڑ تو نہیں جائیں گے؟ میں تو ان کی پاسنگ بھی نہیں۔ پھر میرا کیا بنے گا؟

بابو جی! یہ بابا خط لکھ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے گاؤں یا آس پاس کے گاؤں میں جب بھی کوئی بابو آیا ہے۔ کسی نہ کسی لڑکی نے اس سے ضرور محبت کی ہے۔ مگر آج تک کسی لڑکی کی محبت پروان نہیں چڑھی۔ جانے ہم پہاڑی لڑکیوں کی قسمت میں یہ دھوکے کیوں لکھے ہیں؟

پر بابو جی! میں نے تو خط لکھنے والے بابا سے کہا ہے کہ میرے بابو مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ ہاں بابو جی! آپ اس بات کو سچ کر دکھانا اور میری لاج رکھ لینا۔

دیکھئے میں نے آپ سے کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔ سامنے ہوتی تو ایک بات بھی نہ کر پاتی۔ شاید اللہ نے اسی لئے آپ سے دور کر دیا ہے کہ من کی ایک ایک بات آپ تک پہنچا سکوں۔ بابو جی! کبھی کبھی جب میں پوپی کو سینے سے لگا کر بے تحاشہ چومتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں پوپی کو نہیں آپ کو چوم رہی ہوں۔ یہ دھوکہ میرے ساتھ کئی بار ہو چکا ہے۔ بے خیالی میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی ہوں۔ عجیب دیوانی سی لڑکی بنتی جا رہی ہوں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے بابو جی۔ یہ من ایک بات کے سوا کوئی دوسری بات کیوں نہیں سوچتا۔ یہ من ایسا باؤلا ہے۔ کچھ بھی نہیں مانتا۔ شاید سب لڑکیوں کے دل مجھ جیسے ہوں گے۔ پر مجھ جیسے نصیب انہیں کہاں

سے ملیں گے۔

یہی تو فرق ہے سب میں اور مجھ میں!

بابوجی! آپ کی تصویر میرے پاس ہے۔ آپ نے رابعہ کو دی تھی نا۔ تو میں نے ہی اسے اکسایا تھا بعد میں اس سے چرا لی۔ وہاں بھی اسے روز دیکھتی تھی۔ یہاں بھی اسے روز دیکھتی ہوں۔ کبھی کبھی تو دیر تک اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ اور مسکراتی رہتی ہوں۔ تصویر میں تو آپ اور زیادہ خوبصورت لگتے ہیں۔ آپ کی تصویر سے بھی' آپ کے کپڑوں جیسی خوشبو آتی ہے۔ یہ تصویر ہمیشہ میرے پاس رہے گی---- میں نے ابھی تک مالکن کو آپ کی تصویر نہیں دکھائی---- کبھی کبھی جی میں آتا ہے دکھا دوں اور جب وہ پوچھیں کہ یہ کون ہے تو کیا جواب دوں گی۔ شرم سے مر مر جاؤں گی۔ مگر مالکن تو سب کچھ سمجھ جائیں گی اور دل میں سوچیں گی۔ اجڈ' پہاڑی لڑکی--- لیکن نصیب آسمان پر چمکنے والے تاروں کا چرا کر لائی ہے--- ٹھیک تو ہے۔ کہاں میں' کہاں آپ؟ کہاں زمین کا جگنو اور کہاں آسمان کا چاند؟

نہیں! میں انہیں تصویر نہیں دکھاؤں گی۔ حیا اور شرم آئے گی۔ اف! یہ ساری دنیا کی شرم میرے حصے میں کیوں آگئی ہے۔ قدم قدم پر میرے پیار کے پھول کھلتے رہے۔ اور میں لاج کی ماری دیکھنے کو ترستی رہی۔

بس بابوجی۔ اب کے آؤں تو میرا کوئی لحاظ نہ کرنا۔ میں سہمی رہوں۔ بات نہ کروں۔ بھاگنا چاہوں تو میری کلائی مروڑ کر پوری بیدردی سے فرش پر دے مارنا۔ میرے آنسو نکل آئیں تو بھی ذرا پروا نہ کرنا۔ الٹا زور کے تھپڑ مارنا کہ میرا رواں رواں کانپ اٹھے۔

میں کسی سے کچھ نہ کہوں گی۔ شکایت بھلا میں کس کی کروں

گی۔ آپ تو میرے ایمان ہیں۔

بس بابوجی! مجھے اپنی روح میں گھلا دینا۔ اور اپنے سینے میں بٹھا لینا اور پھر کبھی نہ نکالنا۔ بابوجی۔ خدا کی قسم! میں اپنے بھیڑ کے بچے کی طرح پاک اور معصوم ہوں۔ میرے دامن میں ذرا بھی داغ نہیں ہے۔ میں نے خدا کی طرح آپ سے بھی سچا پیار کیا ہے۔ اور ہمیشہ کروں گی۔

اگر آپ نے کبھی مجھے چھوڑ دیا تو بھی سدا آپ ہی سے پیار کروں گی۔ میں کبھی آپ سے منہ نہیں موڑ سکتی۔

جب میں اللہ میاں کے حضور میں سجدہ کرتی ہوں تو اس لمحے بالکل مجھے اپنی بے غرضی کا یقین ہوتا ہے۔ اور بابوجی۔ جب میں آپ کے لئے سوچتی ہوں تو بھی بالکل اسی قسم کا جذبہ ہوتا ہے۔ پھر بھلا میرا پیار مقدس کیوں نہیں ہو گا۔ ایسے پاکیزہ جذبے کے لئے زندگی قربان ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

بابوجی! میں آپ کو کیا بتاؤں۔ کاش! آپ میرے سینے میں جھانک سکتے کہ کتنا ڈھیروں پیار محفوظ ہے صرف آپ کے لئے۔

بابوجی! وہ رات میں کبھی نہ بھولوں گی۔ جب ساری دنیا کو سوتا چھوڑ کر میں آپ کے پاس آئی تھی۔ میرا خیال تھا آپ ساری رات مجھ سے باتیں کریں گے۔ مگر آپ نے کتنا جلدی مجھے لوٹا دیا تھا۔ میرے اچھے بابوجی! اتنا خطرہ مول لینے کے بعد آپ نے مجھے اتنا جلدی واپس جانے کو کہا۔ اور مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوا--- دکھ کیوں ہوتا آخر--- اس گھڑی آپ کی آنکھوں میں سچ ہی سچ تھا۔ پیار ہی پیار تھا--- کس قدر یقین کے ساتھ واپس کیا تھا آپ نے مجھے۔

ایسا لگا تھا کہ واپس کوٹھڑی میں میں نے نہیں جانا۔ بلکہ ہوا میں

کھل مل جاؤں گی۔ آسمان پر پہنچ جاؤں گی۔ وہیں تو آپ مجھے بھیج رہے ہیں ـــــ یہی وجہ تھی کہ جب میں آپ کے کمرے سے نکلی تو میرا من بوجھل نہیں تھا۔ بلکہ میں پھول کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔

بابوجی! آپ بھی روز نہاتے ہیں نا۔ میری مالکن بھی روز نہاتی ہیں۔ نہ ٹھنڈی برف کا ڈر اور نہ یخ ہواؤں کا خوف۔ ان کی بہت سی عادتیں بالکل آپ کی طرح ہیں۔ نہا دھو کر جب وہ صاف ستھرے اجلے اجلے کپڑے پہن کر انگیٹھی کے سامنے بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے لمبے بال سکھانے کے لئے شانوں پر بکھیر دیتی ہیں تو بالکل پری لگتی ہیں۔ ایسے میں وہ مجھے بے حد پیاری لگتی ہیں۔

ان کی دیکھا دیکھی۔ اب میں بھی روزانہ نہانے لگ گئی ہوں۔ یہ بھید تو اب پایا ہے کہ نہانے کے بعد انسان کتنا ہلکا پھلکا اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ جسم صاف ہو تو روح بھی دھلی دھلی محسوس ہوتی ہے اور کپڑے صاف ستھرے اور بے داغ ہوں تو من کو کتنا سکون ملتا ہے۔

اب میرا رنگ بھی کچھ زیادہ نکھر گیا ہے۔ پچھلے دنوں یہاں گھٹنے گھٹنے برف گری تھی۔ نلکوں میں پانی آنا بند ہو گیا تھا۔ ہم برف کے گولے بنا بنا کر دیگچے میں ڈالتے اور آگ پر پگھلاتے رہتے۔ اور پھر گرم پانی اور خوشبودار صابن سے منہ ہاتھ دھوتے۔

برفباری ختم ہوئی۔ پانی کا قحط ذرا کم ہوا تو ہم لوگ پھر نہانے لگ گئے۔ شاید یہی وجہ ہے میرا رنگ زیادہ صاف ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ زیادہ خوبصورت ہو گئی ہوں۔ مالکن مجھے اپنے نئے نئے کپڑے پہننے کو دیتی ہے۔ ان میں بہت بانکی لگتی ہوں۔ بالکل شہر کی لڑکی بنتی جا رہی ہوں۔

جب بڑے آئینے میں خود کو دیکھتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آ جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجو مالکن کی برابری نہیں کر سکتی۔ میں لاکھ خوبصورت بنتی پھروں۔ مالکن کی شان ہی نرالی ہے۔

جب کبھی موسم صاف ہوتا ہے اور ہم سیر کے لئے نکلتے ہیں۔ تو سارے شہر کی نگاہیں مالکن کی راہ میں بچھ جاتی ہیں۔ جیسے سچ مچ کوئی شہزادی سیر کو نکلی ہے۔ مگر مالکن تو کسی کی پروا ہی نہیں کرتیں۔ کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتیں۔

بابوجی! آپ کہیں گے اس نمو کو کتنی باتیں آ گئی ہیں۔ اور یہ کتنی باتونی ہو گئی ہے۔ پر برا نہ ماننا۔ میں نے تو اپنے دل کا غبار دور کرنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ چلو پوری تو ہوئی۔

اب تو خط لکھنے والا بابا بھی تنگ آ گیا ہے۔

بس اب ختم کرتی ہوں۔

نعیمہ



خط پڑھ کر میری روح سرشار ہو گئی اور خوشی سے میرے آنسو نکل آئے۔ نمو کے خط کا ہر لفظ جگنو کی طرح دمک رہا تھا۔

یہ انوکھی لڑکی۔ یہ گہری عقیدت' یہ والہانہ پن اور یہ سچی پکار--- نمو کے جذبے' ولولے کتنے نرالے اور مقدس تھے۔

کتنا گھمبیر اس کا پیار' کتنی شدید اس کی محبت' قوس و قزح کی طرح البیلے اور رنگیلے احساسات--- سیدھی' بے ریا' بے غرض اور معصوم لڑکی۔ نہ دولت اسے گمراہ کر سکتی ہے اور نہ جنسی شعلے کی لپک اس کا راستہ بدل سکتی ہے۔ فطرت لاکھ طاقتور سہی مگر نمو کی فطرت شہر کی فطرت کی طرح تعلیم یافتہ اور لچکدار نہیں' جو دلائل کی آڑ لے کر زندگی کی مجبوریوں سے سمجھوتہ کر لے۔ بلکہ اس کی فطرت تو پہاڑ کی طرح ٹھوس اور سخت ہے۔ اور کھردری ہے۔ اس میں وحشت بھی ہے اور معصومیت بھی۔

دراصل نمو جیسی لڑکیوں کی فطرت کی یہی معصومیت انہیں شکار بھی کرتی ہے اور انہیں لے ڈوبتی ہے۔

چنانچہ آج مجھ پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ فطرتیں جو اٹل ہوتی ہیں۔ ان میں

بھی کچھ نہ کچھ فاصلہ اور فرق اور لچک ہوتی ہے۔

ایک بار میری فطرت نے شمسہ سے وفاداری کے باوجود ناہید کا بوسہ لینے کا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن آج نمو کی فطرت مجھے صاف کہہ رہی تھی کہ اگر اس کا من ٹوٹ گیا تو اس کی وحشی فطرت کوئی اور سہارا ہرگز نہ ڈھونڈے گی۔ ایک وحشی فطرت سے کسی اور بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

شمسہ!

ناہید!!

اور نمو!!!

پہلی روحانی تقاضا بن کر میری زندگی میں آئی۔

دوسری جنسی احتیاج بن کر مجھ پر چھا گئی۔

تیسری معصومیتوں کی مالا بن کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔

اور جب آنکھ کھلی اور خواب بکھر گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ روحانی تقاضا چرکہ لگا کر میری آتما زخمی کر چکی ہے۔ اور جنسی احتیاج اپنی منزل پا کر اب نڈھال' مجروح اور بے حال سسک رہی ہے۔ مگر معصومیتوں کی مالا تازہ اور شگفتہ ہے۔ اس کی مہک میری زخمی آتما کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہے۔ اور میرے نڈھال جسم کو تھپکی دے رہی ہے۔

کل کیا ہو۔ خدا جانے۔

مگر آج تو یہ معصومیت ہر درد کی درماں بن چکی ہے۔

دراصل نمو کے حسن اور حیا اور سادگی نے میرے جمالیاتی شعور کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہم دونوں کے تعلق نے ایسے مواقع پیدا کئے جن میں' میں زندگی کی بلند ترین وجدانی کیفیتوں سے دوچار ہوا تھا۔

اب میں عورت کو محض اس نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا کہ وہ جنسی ترغیب اور تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ بلکہ عوت کا پیار تو کبھی کبھی خدا کا روپ دھار کر آتا ہے وہ

من کو ایسی جلا بخشتا ہے۔ جیسے سونا بھٹی سے کندن بن کر نکلتا ہے۔

شمسہ میری زندگی میں ایک روحانی ضرورت بن کر آئی۔ مگر بوس و کنار کے باہمی تعلق نے دونوں کی جستجو میں ترغیب کا ایک جزو شامل کر لیا تھا۔ اگرچہ اس ترغیب میں پاکیزگی کا بھی ایک عنصر تھا۔۔۔ دوسرے لفظوں میں ترغیب کا جزو اور پاکیزگی کا عنصر دونوں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ اور شعور کی کسی سطح پر احساس کی واضح شکل سامنے نہیں آئی تھی۔

ہاں البتہ۔۔۔ ناہید کی چاہ بتدریج جنسی تڑپ کی واضح شکل میں سامنے آئی تھی۔ مگر نمو۔۔۔

نمو نے تو جیون کو بے حد شگفتہ بنا دیا تھا۔ شاید تحت الشعور میں جنسی جذبہ ہی کارفرما ہو۔ مگر شعوری قوتیں اتنی واضح اور احساسات اتنے لطیف اور حسین تھے کہ مجازی مطالبے وجدانی کیفیتوں میں بدل گئے۔

نمو کے خط میں کیا کیا رنگ کیا کیا جذبے تھے۔۔۔ فرار تھا تو کتنا حیا پرور' سپردگی کا احساس تھا تو کتنا معصوم۔۔۔ چھوٹے بچے سے وابستگی' مالکن کی عزت اور احترام' ہر ذکر سے ایک قلبی تعلق اور ہر رشتے سے بے ساختہ خلوص۔۔۔

وہ کس قدر بے ریا' سیدھی اور سچی لڑکی تھی۔

وہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ ورنہ کتنی مکمل لڑکی تھی۔

اس اثنا میں نمو ایک بار گاؤں بھی آئی۔ مگر حسب وعدہ پوپی کو ساتھ نہ لا سکی۔ دراصل مالکن نے راولپنڈی جانے کا پروگرام ہی ملتوی کر دیا تھا۔ اب سردیاں اٹھ رہی تھیں۔ اور سیزن کی آمد آمد تھی۔ مئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ نئی اور تازہ کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ دو دن گاؤں ٹھہر کر:: واپس چلی گئی تھی۔

اور اب اچانک اس کا دوسرا خط آ گیا تھا۔ اس نے مجھے مری بلایا تھا۔ مالکن چار دن کے لئے لاہور چلی گئی تھی۔۔۔ یہ کوٹھی جس کا آدھا حصہ ان کے پاس تھا۔ مال پر بڑے ڈاک خانے کے مشرقی ڈھلوان پر واقع تھی۔

سرور بابا بیرونی احاطے میں سیزن میں کھلنے والے پھولوں کے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ مجھے اچانک آتے دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

"ارے ندیم بیٹا! خوب آئے"۔

میں مسکرا پڑا۔ بابا سرور نے فوارہ رکھ کر بڑی گرمجوشی سے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر کوٹھی کی طرف منہ پھیر کر آواز دی۔

"اری نمو۔ نعیمہ بیٹی۔ دیکھ تو کون آیا ہے"۔

نمو لپک کر باہر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"بابوجی۔۔۔!" وہ خوشی سے تڑپ اٹھی۔

"کہو نمو۔ ٹھیک تو ہونا؟" میں نے بے حد گھریلو لہجے میں پوچھا۔

نمو خوشی سے بوکھلا گئی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہ آئی کیا کہے' کیا کرے۔ سرور بابا ہنس پڑا۔

"دیکھو باؤلی لڑکی کو' خوشی سے پاگل ہو گئی ہے۔ اری جا جلدی سے چائے بنا۔ بابوجی ٹھنڈی ہوا میں آئے ہیں"۔

نمو ہنستے ہنستے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ چلی گئی۔ سرور بابا نے میری طرف دیکھا۔

"آؤ بیٹا۔ برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ وہاں دھوپ لگ رہی ہے"۔

ہم دونوں برآمدے میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابا نے اپنے گیلے ہاتھ قمیض کے دامن سے خشک کئے اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

"ہماری مالکن دو چار روز کے لئے لاہور چلی گئی ہیں۔ تب تک آپ ہوٹل کے بجائے یہیں ٹھہریں۔ وہ آنے سے پہلے تار دیں گی۔ میں انہیں لینے راولپنڈی جاؤں گا۔ آپ کتنے دن ٹھہریں گے؟"

"میں ایک دو دن ٹھہروں گا بابا۔ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ آپ لوگ زحمت نہ کریں"۔

"کیسی زحمت بیٹا۔ آدھی کوٹھی ہمارے پاس ہے۔ سارے کمرے خالی پڑے ہیں۔ آپ ہوٹل میں پیسے کیوں خرچ کریں"۔

معاً" میری نظر پاس پڑی کرسی میں کتاب پر پڑی۔ یہ میری لکھی ہوئی کتاب تھی۔ میں نے مسکرا کر کتاب اٹھالی۔

"بابا یہ کتاب تو میری لکھی ہوئی ہے۔ میرے افسانوں کا مجموعہ ہے"۔

"اچھا!" بابا خوش ہو گیا--- مالکن کے پاس تو کتابوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہو گی۔ بہت زیادہ پڑھتی ہیں ہماری مالکن"۔

میں نے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی۔ جلد کھولی۔ پہلا صفحہ بالکل سادہ تھا۔ دوسرا صفحہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لکھا تھا۔

ناہید کے لئے۔ بے حد پیار اور خلوص کے ساتھ۔ ندیم!

یہ میری تحریر تھی۔ یہ کتاب میں نے اس تحریر کے ساتھ ناہید کو پیش کی تھی۔ مگر یہ کتاب یہاں کیوں ہے--- یہاں تو کوئی ایسی عورت رہتی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔ جس کا ایک بچہ ہے اور جس کا شوہر انگلینڈ چلا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ناہید کی کوئی سہیلی ہو۔ اور ناہید نے اسے کتاب دے دی ہو---

اتنے میں لجاتی مسکراتی نمو چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ میری توجہ نمو کی طرف ہو گئی۔ وہ کتنی خوش تھی۔ کتنی تندرست تھی--- وہ چائے پر جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کے شہبازی رخسار دمک رہے تھے۔ چست ریشمی' شہری لباس میں اس کے جسم کے تیکھے خطوط اور زیادہ تیکھے ہو گئے تھے---- نمو نے ٹھیک لکھا تھا۔

"میں بہت بانکی ہو گئی ہوں۔ پہلے سے بہت زیادہ نکھر گئی ہوں۔ میں روز نہاتی ہوں۔ روز صاف ستھرے اور دھلے ہوئے کپڑے پہنتی ہوں"۔

اس نے چائے کا کپ میری طرف بڑھایا۔ میں نے کتاب خالی کرسی پر رکھ دی۔ اور ہواڑ اٹھتی ہوئی گرم گرم پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اس لمحے ہم دونوں کے ہاتھ پرچ کو چھو رہے تھے۔ یہ بے حد مختصر لمحہ تھا۔ مگر زندگی

سے بھرپور۔ نمو نے بے حد صبر کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھیں۔ مجھے یوں لگا۔

جیسے کہہ رہی ہو۔

"تم آئے ہو میرے محبوب! میرے بلاوے پر۔ میں کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی وہ زبان کہاں سے لاؤں جو تمہارا شکریہ ادا کر سکے۔ میں نیلم و مروارید کے وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو تمہاری یہاں موجودگی کا احساس بیان کر سکیں۔ میرے محبوب! تم یہاں ہو۔ میرے پاس۔ میرے بالکل قریب۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ مگر پھر بھی تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ تم ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ میری آتما اپنے ڈھانچے میں منتقل کر لو اور اپنی آتما میرے ڈھانچے میں سمو ڈالو۔ تاکہ میری ذمہ داری صرف اتنی رہ جائے کہ جیون کے ہر سانس میں تمہیں اپنے ہی وجود میں تلاش کرتی پھروں---! میرے محبوب! آج رات تم یہاں سوؤ گے۔ آج کی رات گاؤں کی راتوں سے کتنی مختلف ہو گی--- کبھی کبھی جنت کی رات زمین کی رات بن کر آ جاتی ہے!"

سرور بابا چائے کی خالی پیالی تپائی پر رکھ کر بولا۔

"بیٹی! تم آلو ابال رہی تھیں۔ مگر بابو جی مالکن کی کوٹھی کے مہمان ہیں۔ تم ان کے نہانے کے لئے پانی رکھ دو۔ میں جا کر بازار سے گوشت لاتا ہوں"۔

بابا سرور چلا گیا۔ نمو وہیں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو!"

نمو نے پہلے میری طرف دیکھا۔ پھر خالی کرسی کی طرف۔ پھر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں بے حد غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں تھے۔ اور دوپٹے سے کھیل رہی تھی۔ دیر تک خاموش پا کر اس نے پلکیں اٹھائیں۔ مجھے اس طرح محو دیکھ کر اس نے شرما کر اور مسکرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ میں بھی ہنس پڑا۔

"دیکھو۔ تم نے بلایا۔ میں آ گیا"۔

ایک لمحہ کے لئے اس نے پھر نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں احسان مندانہ جذبات کی روشنی تھی۔

"دیکھو! چپ نہ رہا کرو۔ بولا کرو۔ خط میں تم نے کیسی کیسی باتیں لکھی تھیں"۔

وہ ہنس پڑی۔ "چائے اور بنا دوں؟"

"چائے چھوڑو۔ چاہ کی بات کرو"۔

"میں کیا کہوں۔ آپ باتیں کریں۔ میں بھی بولوں گی"۔ "اچھا بتاؤ۔ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

"میں کیا بتاؤں؟ جی میں آیا۔ آپ کو خط لکھ دیا۔ میرے من میں یہ بات مہینوں سے بیٹھی ہوئی تھی کہ جب مالکن باہر جائیں گی۔ آپ کو بلاؤں گی"۔

"اچھا پھر؟"

"بس مجھے اس بات کی خواہش تھی کہ ایک بار آپ کو یہاں دیکھوں۔ میں رات رات بھر خیالی پلاؤ پکایا کرتی تھی۔ کہ آپ آئیں گے۔ یہاں بیٹھیں گے' وہاں کھڑے ہوں گے' یوں چائے پئیں گے' اور یوں کھانا کھائیں گے۔ مجھ سے باتیں کریں گے اور جب آپ واپس چلے جائیں گے تو میں ایک ایک بات یاد کروں گی"۔

میں ہنس پڑا۔ "پگلی!"

میری نظر دوبارہ اپنے افسانوں کے مجموعے پر پڑ گئی۔ میں نے کتاب اٹھائی۔ اور پوچھا۔

"یہ کتاب شاید تمہاری مالکن کی ہے"۔

"ہاں انہیں کی ہے۔ ان کے پاس کتابوں کی کون سی کمی ہے۔ اندر ڈھیر ساری کتابیں پڑی ہیں۔ ہر مہینے کچھ نئی کتابیں بھی آ جاتی ہیں"۔

"تم یہاں بہت خوش ہو۔ تمہاری صحت بھی اچھی ہو گئی ہے۔ اور واقعی تم بہت خوبصورت ہو گئی ہو"۔

"ہوں---!"

"تمہاری باتیں ہمیشہ یونہی ہوتی ہیں۔ مگر ان میں معنی ہوتے ہیں۔ وہ بہت اچھی اور سچی ہوتی ہیں"۔

وہ ہنس رہی تھی۔ اور بے حد مسرور تھی۔ لمحہ بھر کے لئے نگاہیں اٹھاتی۔ مجھے دیکھتی اور پھر دوپٹے سے کھیلتی اور بار بار یہی حرکت کرتی۔

"تم یونہی ہنستی رہو گی اور باتیں نہیں کرو گی۔ چلو ہمیں اپنا گھر دکھاؤ"۔

نمو فوراً کھڑی ہو گئی۔

"آیئے!"

یہ مختصر سا سادہ مگر صاف ستھرا ڈرائنگ روم تھا۔ نمو کارنس پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف بڑھی۔

"یہ دیکھئے ہماری مالکن کی تصویر۔ کتنی خوبصورت ہیں!"

میرا چہرہ فق ہو گیا۔ میں حیرت و استعجاب سے تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ نمو نے مالکن کی کتنی تعریفیں لکھی تھیں اور ان میں سے کوئی بات جھوٹ نہیں تھی۔ تصویر واقعی بے حد خوبصورت تھی۔

نمونے میرے بدلے ہوئے چہرے کی گہرائیوں کو سمجھی۔ اور نہ میرے استعجاب کو' بلکہ مجھے حیران کر دینے میں اسے بڑا لطف آیا۔ وہ پلٹ کر میرے قریب آئی اور بولی۔

"دیکھ لیا نا۔ میں جو کہتی تھی۔ سچ کہتی تھی۔ مالکن تو پریوں کے دیس کی شہزادی ہے شہزادی"۔

میں نے نمو کی طرف دیکھا۔ بے حد پیار سے' بے حد خلوص سے--- مجھے نمو کی سادگی پر رحم آ گیا تھا--- آہ--- اب یہ سادہ دل لڑکی کہے گی۔

"آؤ تمہیں پوپی دکھاؤں۔ ایسا پیارا' تندرست اور خوبصورت بچہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہو گا!"

قدرت کتنا بڑا ڈرامہ دیکھنے کے لئے مجھے یہاں لائی تھی۔ نمو اجنبی سمجھ کر مجھے پوپی سے ملائے گی۔ احمق لڑکی یہ نہیں جانتی۔ کہ وہ باپ کو بیٹے سے ملا رہی ہے۔

نمو میری اس کیفیت کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ مجھے اس طرح پھیکی پھیکی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔۔۔؟"

میں مسکرا پڑا اور مجروح لہجے میں بولا۔

"آؤ نمو پوپی کو دیکھ لیں!"

"وہ ادھر ہے میرے کمرے میں"۔ نمو خوش ہو گئی۔۔۔ "سو رہا تھا۔ پیار لوں گی تو جاگ اٹھے گا"۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر نمو خوشی سے چلائی۔

"ارے یہ تو جاگ رہا ہے۔ دیکھو انگوٹھا چوس رہا ہے"۔

اس نے لپک کر پوپی کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔

"بچے سو کر اٹھتے ہیں تو روتے ہیں۔ پر پوپی ایسا پیارا بچہ ہے۔ بے روگ، کبھی نہیں روئے گا"۔

میں نے دیکھا۔ گول مٹول' تندرست' گورا' چٹا اور معصوم سا خوبصورت بچہ میرا اپنا خون۔۔۔ ناہید اور میرے پیار کا ثمر۔۔۔ نمو اسے کتنا پیار کرتی ہے۔ خط میں بھی اس کا ذکر نہیں بھولتی۔ مگر جب وہ جان جائے گی کہ اس کے ابا ولایت نہیں گئے۔ اور اس کی مالکن کی شادی نہیں ہوئی اور اس کا پوپی اس کی اچھی مالکن اور اس کے پیارے ندیم کی ناجائز اولاد ہے تو یہ معصوم لڑکی کیا سوچے گی۔ اس کے دل پر کیا بیتے گی؟

نمو پوپی کو ہاتھوں پر اچھالتے اچھالتے میرے پاس لے آئی اور بولی۔

"دیکھو ہنس رہا ہے"۔

میرا دل ایک عجیب خوف سے دھڑکا۔ یہ دھڑکن بالکل نئی چیز تھی۔ میں نے

مجرم کی طرح بچے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ بچہ مچلتا ہوا میرے ہاتھوں میں آگیا۔ بچے کو گود میں لیتے ہی بجلی کی سی ایک لہر میرے جسم میں پھیل گئی۔ اور اس خوف کو سلا گئی جو چند لمحے پیشتر اسے گود میں لینے سے پیدا ہوا تھا۔

بچہ مچل مچل کر ہنس رہا تھا۔ نمو بولی۔

"آپ اسے تھوڑی دیر بہلائیں۔ میں اس کے لئے دودھ گرم کرتی ہوں۔ یہ بھوکا ہو گا"۔

نمو چلی گئی۔ تو میں نے بے اختیار بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور ایسی احتیاط سے چوم لیا جیسے چوری کر رہا ہو۔

ڈرائنگ روم میں آکر میں نے ناہید کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا۔ تصویر میں ناہید مسکرا رہی تھی۔ نمو نے تو خط میں مالکن کی بے حد متین اور اداس تصویر کھینچی تھی لیکن یہ مسکان۔۔۔ شاید ان دنوں کی یاد دلا رہی تھی۔ جب کلی پر بھنورا نہیں بیٹھا تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔۔۔ لوگ گرمیاں گزارنے پہاڑ پر آتے ہیں۔ تم نے سردیاں بھی یہیں بتا دیں ناہید۔۔۔ تم اپنے پیار کی تلاش میں یہاں آئی تھیں یا پوپی کا مستقبل تمہیں یہاں کھینچ لایا تھا۔ ناہید تمہیں پوپی سے شاید نفرت بھی ہو۔ محبت بھی ہو۔ یہ تمہاری آنکھوں کا نور ہے۔ اور تمہارا تاریک مستقبل بھی۔۔۔ ناہید تم سماج سے آنکھیں چرا کر یہاں چلی آئیں۔ شاید ہم نے مل کر کوئی غلط قدم اٹھایا تھا۔۔۔ مجھے اب تک اس کا احساس اس لئے نہیں تھا کہ اپنے ارتکاب جرم کے نتائج سے بے خبر تھا۔ عورت اور مرد جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اور ان کے تعلقات بوسے سے تجاوز کر جاتے ہیں تو فطرت صنف نازک کے کمزور کندھوں پر سارا بوجھ لاد دیتی ہے۔۔۔ ناہید یہ پوپی' جانے تم نے اس کا نام کیا رکھا ہے۔ میرا اور تمہارا بیٹا ہے۔ ہم نے کسی گھڑی' بڑے خلوص سے پیار کا کھیل کھیلا تھا۔ اس لمحے نہ ہمارے ذہن میں گناہ کا تصور تھا اور نہ کسی جرم کا خوف۔۔۔ نہ ہم نے کسی کا کچھ بگاڑا۔ نہ

کسی کا نقصان کیا۔ لیکن جب اس بے ضرر پیار کے نتائج سامنے آنے لگے تو تم شہر چھوڑ کر پہاڑ پر آ گئیں۔ گرمیاں چھوڑ تم نے سردیاں بھی یہیں گزار دیں---- ناہید تم مسکرا رہی ہو۔ تمہارا پوپی میری گود میں مچل رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔ اگر ہم جانور ہوتے تو ہمارا یہ فعل گردن زدنی نہ ہوتا۔ تم سے کوئی پوچھ گچھ نہ کرتا اور تم یوں چوری چھپے اپنے مقصد کی تلاش میں نہ بھٹکتی پھرتیں۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ بھی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس عمل میں تم نے کسی کو ذرا بھر دکھ بھی نہ پہنچایا۔ لیکن اس کے باوجود تم روپوش ہو۔ تم پوپی کے راز کو اونچے پہاڑوں پر منڈلاتے سیاہ بادلوں میں تحلیل کرنا چاہتی ہو---- ناہید! نمو نے لکھا تھا میری مالکن اداس اداس رہتی ہے۔ اب سمجھ میں آئی کہ یہ حد سے بڑھی ہوئی متانت تمہیں کہاں سے ودیعت ہوئی۔ سوسائٹی کے خوف نے تمہیں کس قدر غمگین اور گھمبیر بنا دیا ہے---- ہمارے سماج نے کچھ قانون بنائے ہیں۔ ہمارے معاشرے نے چند قدریں تخلیق کی ہیں۔ ہماری سوسائٹی نے کچھ پابندیاں عائد کی ہیں اور ان قواعد میں رہنے کا نام زندگی رکھ دیا ہے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک رات میں ایسا انقلاب آ جائے کہ صبح آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ آج سے مذہب اور سوسائٹی کی ہر قید ختم ہو چکی ہے اور ہم حیوانوں کی طرح آزاد ہیں اور جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ اس طرح ہم سب کچھ کر سکیں گے۔ مگر محبت کبھی نہ کر سکیں گے۔ پھر شمسہ' ناہید' نمو جو بھی سامنے آئے گی۔ حیوانی تسکین کا ذریعہ بنے گی۔ بچے جنے گی' مگر ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔ پھر نہ کسی شمسہ کے لئے آنسو نکلے گا۔ نہ کسی ناہید سے فرار کی نوبت آئے گی اور نہ کسی نمو کے لئے ننھے ننھے' چھوٹے چھوٹے معصوم معصوم جذبے جنم لیں گے۔

ایک فطری طلب کی تکمیل کے لئے زندگی کو حیوانی سطح پر آزاد تو چھوڑا جا سکتا ہے۔ مگر زندگی کیسے کیسے انمول جذبوں' کیسے کیسے معصوم لغزشوں اور کیسے کیسے پیغمبرانہ

اقوال سے محروم ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اگر سوسائٹی نے تمہیں غمگین اور متین بنا دیا ہے تو مجھے خوشی ہوئی ہے۔ ہم نے اگر بہن بھائی' ماں باپ' دوستوں اور عزیزوں اور محبوب کی محبت کا مزہ چکھنا ہے تو سوسائٹی کے قوانین کا احترام لازم ہو جاتا ہے--- اتنے ڈھیر سارے جذبات و احساسات کا خون کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ اگر ہمیں موقع میسر ہو اور کسی عورت کا جسم مکمل طور پر ہمارے قبضہ میں ہو اور تکمیل خواہش میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ لیکن اگر اس سے معاشرے کی قدریں مجروح ہوتی ہوں۔ سوسائٹی کا دامن داغدار ہوتا ہو تو ہم اجتماعی مفاد کی خاطر ذاتی خواہش سے دست کش ہو جائیں۔ اور سچ بولنا ناہید۔ تو ایسی سچی خوشی ہے بلکہ اس میں ایک شعریت بھی ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنے کے لئے اور اس کا لطف اٹھانے کے لئے قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ہو گا!

پوپی تمہارے پیٹ میں تھا۔ اس لئے میرا تبسم سے ملنا جلنا بھی تمہیں پسند نہیں تھا۔ مجھ پر دنیا میں سب سے زیادہ حق' تم اپنا سمجھتی تھیں--- ٹھیک ہے! مگر تم نے اس وقت مجھے اس کا احساس کیوں نہیں دلایا۔ میں اگر آج اپنے دل کو بہت سی چیزوں سے خالی کر سکتا ہوں تو اس وقت بھی اسی طرح صاحب اختیار تھا۔ یہی دل یہی ضمیر اس وقت بھی تمہاری ڈھال بنتے۔ میں تمہاری عصمت کا شکاری ضرور تھا۔ مگر ڈاکو نہیں تھا۔

میں نے تو بڑے خلوص سے تم سے پیار کیا تھا۔ ایک نہ سمجھ آنے والی بھول اور نیک نیتی سے تمہاری عصمت کا شکاری بنا تھا۔ بلکہ خود تم نے بھی شکار بننے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا--- پھر اسی بھول پن سے میں نے تم سے فرار اختیار کرنا چاہا تھا۔ لیکن آج جب کہ تم میرے بچے کی ماں ہو۔ اور میری تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہو۔ میں وہ بات بالکل بھول گیا ہوں کہ کبھی میں نے تمہیں بوجھ سمجھ کر جان بھی چھڑانی چاہی تھی---- آج تو میں صرف یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں پیار کیا تھا۔ آج بھی کر رہا ہوں اور کل بھی کروں گا۔

یہ پیار میں پوپی سے کر رہا ہوں۔ اپنی بے بسی اور بے کسی سے کر رہا ہوں یا اپنے ضمیر سے کر رہا ہوں۔ ابھی واضح شکل ان میں سے کسی کی نہیں دیکھ سکا ہوں۔ ہاں البتہ اس قدر ضرور جان گیا ہوں کہ مجھے اب تم ہی سے پیار کرنا ہے۔

نمو دودھ لائی۔ اور پوپی کے پھولے پھولے گالوں میں انگلی ڈبو کر بولی۔

"لو دودھ پیو پوپی!"

میرے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ پوپی میری گود میں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دودھ کی بوتل کی طرف پھیل گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پوپی کی بے چینی پر ہنس پڑے۔

رات بڑا پیارا اور خنک موسم تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ پوپی سرِشام سو گیا تھا۔ لیکن بابا سرور اور نمو نو بجے تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر سونے چلے گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور میرا خیال یقین میں بدل رہا تھا کہ اب نمو نہیں آئے گی۔ ان دو گھنٹوں میں سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ نہایت سادہ اور سیدھے طریقے سے سارا واقعہ نمو سے سچ سچ کہہ دوں گا۔ بے شک نمو کو دکھ ہو گا۔ پر دھوکہ تو نہ ہو گا۔

ایک طرح سے میں خود کو مورد الزام بھی ٹھہرا رہا تھا کہ کیوں میں نے نمو کے معصوم دل میں پیت کے دیپ جلائے اور اب بڑی نیک نیتی سے ان دیپوں کو پھونک مار کر بجھا دینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ عجیب نیک نیتی تھی کہ دونوں میں سے کسی کے بھی کام نہیں آ رہی تھی۔

ضمیر احساس تو دلاتا ہے۔ مگر کب--- جب دل کانٹوں سے چھلنی ہو جاتا ہے۔ انسان کیسی کیسی بے بسیوں میں جکڑا پکڑا جاتا ہے۔ دل کچھ کہتا ہے۔ روح کچھ چاہتی اور ضمیر اپنے بلند بانگ دعوؤں سے الگ مرعوب کرتا ہے۔ ایسے میں کوئی سیدھی راہ پا کر منزل تک پہنچ جائے تو یہ رہبری کیسی' اور رہنمائی کس کی' اور انسانیت کیسی۔ ایسے میں تو آدمی کو فرشتہ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

نمو کو چاہا گیا--- کیسی بے غرض تھی وہ چاہت۔

اب نمو دکھی ہو گی۔ مگر کوئی اس بے غرضی کو نہیں سمجھے گا۔

چاہت دو طرفہ تھی۔ مگر دکھ تو صرف نمو کا ہی سمجھ میں آ سکے گا۔

زندگی کے ان نہ سمجھ آنے والے بھیدوں پر غور کرتے کرتے میں کوٹھی کے بیرونی احاطے میں ایک چٹان پر آ کر بیٹھ گیا--- حدنگاہ تک روپہلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مہکی مہکی ہوائیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ چناروں کے پتے پراسرار انداز میں سرسرا رہے تھے۔ جیسے کوئی اہم راز اگلنے کے لئے بیتاب ہوں۔

کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھا۔ اور مکان کے پشت کی طرف پھولوں کے اس تختے کی طرف گیا جس میں سیاہ گلاب کھل رہا تھا۔ میں نے ایک پودے پر جھک کر پھول سونگھا اور پھر ایک لمبی سانس لے کر اس کی فردوسی مہک کو اپنی روح میں تحلیل کر دیا۔

پیچھے کی دیوار کی دونوں کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ چاند عین کھڑکیوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ کمرے کے اندر پڑتی ہوئی چاندنی میں میں نے دیکھا--- کھڑکی کے سامنے کی دیوار سے لگی بابا سرور کی چارپائی پڑی تھی اور وہ سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی نمو کی تھی جو کھڑکی والی دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ نمو بائیں بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کا منہ آدھ کھلے غنچے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ پوپی اس کے بغل میں میٹھی نیند سو رہا تھا نمو کا داہنا ہاتھ حفاظتی انداز میں اس پر پھیلا ہوا تھا۔

پیروں کی طرف سے آدھا جسم اندھیرے میں تھا۔ باقی جسم اور چہرے پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ میں چپ چاپ خاموش اس آسمانی منظر کو دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک عجیب سچائی تھی۔

یہ اس کی مالکن کا بچہ ہے۔ بس اتنا سا جذبہ اور انمٹ شاہکار۔ وہ کس خلوص سے بچے کو سینے سے لپٹائے سو رہی ہے--- اس نے مجھے گاؤں سے بلایا تھا۔ مگر گاؤں کی رات کی طرح بتی بجھا کر اور سب کو سوتا چھوڑ کر میرے پاس نہیں آئی۔

مگر آج اس کا نہ آنا اس روز آنے سے کم قیمتی نہیں ہے۔

نمو کے پیار نے مجھے زندگی کے کیا کیا رنگ دکھائے تھے۔ اور کیسے کیسے جذبوں سے روشناس کرایا تھا---- میں سوچ رہا تھا۔ اس سیدھی اور سادہ دل لڑکی کے احسانوں کا حساب کیونکر چکاؤں گا۔ اور پھر وہ کبھی قرضدار نہ بنی۔ ہمیشہ میں ہی قرض اٹھاتا رہا--- اور یہ ریشم یا سونے چاندی کا لین دین نہیں تھا۔ جذبوں کی برتری کا بیوپار تھا--- یہ جذبے اپنے طور پر فطری انداز میں جنم لیتے تھے۔ اور میں ان سے متاثر ہوتا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔

کاش-----! پوپی نمو ہی کا بچہ ہوتا!

مگر دوسرے لمحے میں تصورات کی دنیا سے نکل کر آپے میں آ گیا۔

جو ہے۔ وہی ٹھیک ہے---- جو نہیں ہوتا۔ اس کی خواہش ہمیشہ ہوتی ہے۔

لہٰذا جب اتنا واضح مفہوم ذہن میں موجود ہے۔ پھر بھٹکنا حیوانیت کے سوا اور کیا ہے۔

بچے اور نمو پر ایک گہری مگر حسرت بھری نگاہ ڈال کر میں پلٹا اور چپ چاپ کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب نمو نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی۔

"ارے تم چائے بھی لے آئیں اور میں ابھی تک سو رہا ہوں"۔

نمو مجھے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ بولی۔

"دوسری جگہ جا کر انسان کو پہلی رات نیند نہیں آتی۔ شاید آپ کی آنکھ بھی دیر سے لگی ہو"۔

"ہاں نمو! نیند دیر سے آئی تھی۔ رات بہت پیاری چاندنی تھی۔ میں بہت دیر تک باہر بیٹھا رہا"۔

"ہائے!" وہ بے ساختگی سے بولی۔ "چاندنی کے لئے تو ہم رات کو کھڑکی کھول دیتے ہیں۔ جب چاند دور پہاڑیوں سے نکلتا ہے تو میں اسے تکتی رہتی ہوں۔ پہلے وہ

ذرا سی لکیر کی طرح ابھرتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آدھا اور پھر پورا چاند بن جاتا ہے۔ پہلے اس کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ کچھ اونچا ہو کر وہ چاند کی طرح سفید ہو جاتا ہے--- ہائے چاندنی راتیں' کتنی پیاری ہوتی ہیں!!"

میں اس کے بے ساختہ پن کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ نمو نے چائے بنا کر کپ میری طرف بڑھایا۔

"لیجئے۔ یہ بیڈ ٹی ہے۔ مالکن نے مجھے بیڈ ٹی کا مطلب سمجھا دیا ہے۔ آپ بھی تو شہر میں یہی کچھ کرتے ہوں گے۔ مگر ہمارے گھر آ کر تو آپ نے سب کچھ ہماری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ کہتے تو میں وہاں بھی آپ کو روز بیڈ ٹی دیتی---- اور یہ لیجئے اخبار--- گرم پانی بھی تیار ہے۔ جب تک آپ نہائیں گے۔ میں ناشتہ تیار کر لوں گی"۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"تم نے تو بہت ترقی کر لی ہے۔ نمو۔ شہر کے سارے آداب جان گئی ہو"۔

نمو جھینپ گئی۔

"ہوں۔ اس میں ترقی والی کون سی بات ہے۔ جو مالکن کہتی ہیں۔ وہی کرتی ہوں"۔

"ارے تو اس میں جھینپنے کی کیا بات ہے۔ تم اتنی باتیں جان گئی ہو۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے"۔

"ہوں---- آپ تو مذاق کرنے لگ جاتے ہیں۔ چائے لیجئے نا بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی"۔

میں نے مسکرا کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر چائے کا کپ اٹھا کر بولا۔

"بیٹھو! مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں"۔

نمو کچھ سنجیدہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر نمو کی طرف دیکھ کر بولا۔

"فرض کرو نمو۔ کوئی ایسی مجبوری آن پڑے کہ ہمیں ایک دوسرے سے بچھڑنا پڑ جائے تو تم مجھے برا تو نہیں سمجھو گی؟"

نمو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"مجھے احساس ہے نمو۔ میں نے جو کہنا ہے تم سے زیادہ خود میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ مگر وقت کے فیصلے بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ یہ فیصلے کبھی کبھی ایسی گہرے گھاؤ لگا دیتے ہیں کہ زندگی بھر یہ گھاؤ نہیں بھرتے"۔

نمو کو آنے والے خطرہ کا احساس ہو گیا تھا۔ حیرت و خوف سے اس کا منہ کھلا تھا اور وہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے نمو! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم ہنس رہے تھے۔ تمہارا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اور اب اسی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں رات کو ہی یہ سب باتیں تم سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ مگر تم سو گئیں۔ تم نے مجھے یہاں بلایا۔ اچھا بھی کیا۔ برا بھی کیا۔ برا اس لیے تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اور خود مجھے تمہاری روح کو گھائل کر دینے والی ذمہ داری پوری کرنا پڑ رہی ہے اور اچھا یوں کہ تم نے میرے جیون کو ایک بہت بڑے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے قریب کر دیا ہے۔۔۔ اگر تم مجھے نہ بلاتیں' اور بے خبری میں میں تمہارا ہاتھ پکڑ لیتا' تو خدا جانے اس کے نتائج کتنے بھیانک نکلتے"۔

نمو نے بات کی تمہید سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔

میں نے چائے کا خالی کپ تپائی پر رکھ دیا۔

تم روؤ گی۔ یہ میں جانتا تھا۔ تمہارے آنسو میرے اپنے آنسو ہیں۔ تمہارا دکھ میرا ذاتی دکھ ہے۔ تمہارا پیار میرا اپنا پیار ہے۔ پر اب من چھوٹا نہ کرو۔۔۔ اس دیس کی بیٹیاں آنسوؤں کا خزانہ جھولی میں بھر کر جینے کی عادی ہیں۔ صرف بیاہ شادی کا نام ہی پیار نہیں ہوتا۔ حسرتوں کی دولت ہمارے پاس ہے۔ اس سے ہماری یادوں کے

دیپ ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ من کو ڈھارس دینے کے لئے یہ بات کافی ہے۔ کہ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ دے کر الگ نہیں ہو رہے!"

باہر سے قدموں کی چاپوں کی آواز آئی۔ شاید بابا سرور آ رہا تھا۔ نمو نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بابا سرور نے اندر آ کر سلام کیا اور نمو سے بولا۔

"بیٹی پوپی جاگ اٹھا ہے۔ جاؤ اسے دودھ پلا آؤ"۔

نمو خالی کپ اٹھا کر چلی گئی۔ بابا سرور بولے۔

"بیٹا آپ کے لئے گرم پانی غسل خانے میں رکھ آیا ہوں"۔

"ہاں بابا! میں نہا لیتا ہوں"۔

شام کی بس سے سرور بابا راولپنڈی چلا گیا۔ کیونکہ رات کی ٹرین سے ناہید آ رہی تھی اور دوسرے دن انہوں نے مری پہنچنا تھا۔

شام کا کھانا جس طرح چپ چاپ نمو نے میرے سامنے رکھا۔ اسی خاموشی سے میں کھا پی کر فارغ ہو گیا۔۔۔ پوپی جب تک جاگتا رہا۔ میں اس سے دل بہلاتا رہا۔ اور جب وہ سو گیا تو نمو اسے چپکے سے اٹھا کر لے گئی۔ میں بڑی سنجیدگی سے نمو کی خاموش چیخ کو سن رہا تھا۔ مگر دوبارہ اس تذکرے کو چھیڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

رات اسی طرح چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ مگر میں اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے باہر نہ نکلا۔ لائٹ جل رہی تھی۔ میں بستر میں لیٹا ہوا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔ میرا ذہن نمو کے خیالوں سے خالی نہیں تھا۔ مگر آج مجھے نمو کا انتظار بھی نہیں تھا۔

نمو کو میں کھو چکا تھا۔ یہ بات میں اچھی طرح جان گیا تھا۔

پیار کھونا جیون کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے۔

اور میں تیسری بار اس المیئے سے دوچار ہوا تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔ نمو میرے متعلق کیا سوچتی ہو گی؟

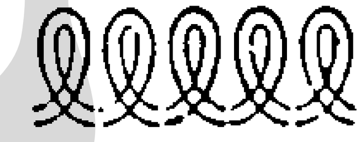
آج وہ اس گھر میں تنہا ہے۔ مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس سے کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ مجھ میں تو اس سے آنکھ ملانے کی ہمت بھی نہیں ہے۔

چاندنی رات میں وہ کھڑکی کھلی رکھتی ہے۔ محبت کرنے والی لڑکی اکیلی سو رہی ہے۔ مگر کھلے آسمان پر روشن چاند کو دیکھنے کی خواہش آج سو گئی ہے۔ زندگی کے وقار نے مجھے اپنے کمرے میں بند کر دیا ہے۔

میں نے اپنے دل کو سمجھا دیا ہے کہ جو ہے وہی ٹھیک ہے۔ جو نہیں ہوتا اس کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے۔

ہما کی تلاش بے سود ہے۔ کیونکہ درحقیقت اس کا وجود ہی نہیں!



ناہید آج واپس آ رہی تھی۔ بابا سرور نے اسے میرے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ ان کی واپسی تک میں گاؤں واپس جا چکا ہوں گا۔ ادھر میں نے نمو کو صرف اتنا بتایا تھا کہ میں ان کی مالکن کو جانتا ہوں۔ اس لئے اس کا انتظار کروں گا۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مگر توجہ کتاب کی طرف نہیں تھی۔ صفحہ دو صفحے پڑھ جاتا۔ اور جب اچانک چونکتا تو معلوم ہوتا کہ مفہوم تو وہیں کتاب میں رہ گیا ہے۔ میں نے تو صرف پڑھنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔ دراصل ناہید کی آمد نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اس کا انتظار بھی تھا اور ڈر بھی۔

ناہید اجنبی نہیں جانی پہچانی لڑکی تھی۔ مگر آج تو مجھے پوپی کی ماں کا سامنا کرنا تھا۔ معاً" نمو اندر آئی اور بولی۔

"مالکن آ رہی ہیں!"

میں زبان سے کچھ نہ بولا۔ اور خالی خالی نظروں سے نمو کو دیکھتا ہوا کھڑا ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نمو میری اندرونی کشمکش کو نہ سمجھ سکی اور مالکن

کے استقبال کے لئے باہر نکل گئی۔

میں چپ چاپ کھڑا کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھ رہا تھا۔

ناہید اسی طرح تندرست اور خوبصورت تھی۔ پوپی نمو کی گود میں تھا۔ ماں کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ مارنے لگا۔ اور نمو کی گود سے ماں کی طرف مچلنے لگا۔ ناہید نے بڑھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا۔ اور اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ پوپی بے حد خوش تھا اور کھٹ کھٹ ہنس رہا تھا۔ نمو نے لپک کر باپ کے ہاتھ سے ناہید کا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ اٹیچی کیس کے علاوہ اس کے پاس پھل کا ایک ٹوکرا اور دوسری مختلف چیزیں تھیں۔ وہ دونوں ناہید کے کمرے میں سامان رکھنے چلے گئے۔۔۔ ناہید پوپی کو گود میں اٹھائے ہنستی مسکراتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ اسنے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ڈرامائی انداز میں' میں مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آگیا۔

اس طرح غیر متوقع مجھے دیکھ کر ناہید کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے حقیقت ہے۔ میں اس کی گھبراہٹ کو سمجھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

"کیا تمہیں اس کی توقع نہیں تھی کہ ہم زندگی میں دوبارہ بھی ملیں گے؟"

"ہاں! مجھے تم سے کسی قسم کی توقع نہیں تھی۔ تم صحت بنانے آئے تھے۔ سو وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ تمہارے رخساروں پر سرخی آگئی ہے۔ اب تمہاری پہاڑ پر رہنے کی ضرورت بھی ختم ہو چکی ہے۔ مقصد اور ضرورت پوری ہونے کے بعد تم لوگوں کے پاس زندگی کا کون سا مقصد باقی رہ جاتا ہے"۔

میں اس طرح کے سلوک کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں ششدر و حیران اسے دیکھتا رہ گیا۔ ناہید نے دوسرا وار کیا۔

"اپنے ادب میں دوسروں کو زندگی کی روشن راہیں دکھانے والے اور اونچی آدرشوں کا پرچار کرنے والے اپنی عملی زندگی میں سچائی کے قریب نہیں پھٹکتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ میں کہتی ہوں تم لوگ وہی کچھ کیوں

نہیں لکھتے جو کچھ ہوتے ہو۔ تم لوگ حقائق سے گریز کیوں کرتے ہو۔ اپنی جھوٹی شہرت کے سہارے بھولی بھالی لڑکیوں کا غرور کیوں چھین لیتے ہو؟ کنواری لڑکیوں کی گود میں حرامی بچے ڈال کر تم لوگ اس سے اس طرح منہ پھیر لیتے ہو۔ جیسے زندگی میں ان سے کبھی شناسائی ہی نہ تھی!"

پوپی ماں کا جوش اور یہ انوکھا رنگ دیکھ کر گھبرا گیا اور رو پڑا۔ نمو سامان رکھ کر آگئی تھی۔ اور دروازے کے باہر کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ پوپی کے رونے کی آواز سن کر اندر آگئی اور ناہید کی گود سے بچے کو لے کر باہر چلی گئی۔ بچہ اس کے سینے سے لگ کر خاموش ہو گیا۔ مگر بچے کی ماں کا جوش ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے آنکھیں ملانے کی ہمت کیسے ہوئی۔ تم نے اس لڑکی کو نظرانداز کیسے کیا جس نے اپنی عزت' گھر کی لاج اور ماں باپ کا اعتماد تم پر قربان کر دیا تھا۔۔۔؟"

"ناہید۔۔۔!" میں تقریباً چیخا۔ "یاد رکھو! تم اپنے احسانوں اور قربانیوں کو گن کر اپنی قیمت بڑھا نہیں رہی ہو۔ گھٹا رہی ہو۔" تم نے جو کچھ کیا تھا اس لئے نہیں کہا تھا کل اس کی قیمت بھی مانگو گی۔ اس کی قیمت میں دے سکتا ہوں مگر اپنے طور پر۔ مانگو گی۔ تو شاید کچھ بھی نہ دے سکوں۔۔۔ تم نے اس وقت جو کچھ کیا تھا۔ بے شک خلوص سے کیا تھا۔ بے لوث تھا وہ سب کچھ' میرے دل پر نقش تھا۔ مجھے اس کا صلہ بھی دینا تھا۔ مگر اس طرح جتا کر تو شاید تم کچھ بھی نہ پا سکو"۔

ناہید ہونٹ کاٹنے لگی۔ شاید میری شخصیت ایک بار پھر اس پر اثرانداز ہو رہی تھی۔

"سنو اور اچھی طرح کان کھول کر سنو۔۔۔ بے شک میں اس بچے کا باپ ہوں' جسے تم دنیا سے چھپا کر پال پوس رہی ہو۔ لیکن کیا تم اس کی ماں نہیں ہو۔۔؟ ٹھیک ہے کہ ایک غیر محسوس طریقے پر میں اس کا باپ بننے کی تحریک میں شامل تھا۔ لیکن کیا تم اسی جذبے سے اس کی ماں بننے کی ترغیب میں شامل نہیں تھیں؟ یقیناً تھیں! جرم

میں جتنا حصہ میرا تھا۔ اتنا ہی تمہارا بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تم عورت تھیں اور میں مرد۔ فطری طور پر تمہیں یہ بار اٹھانا تھا۔ جو کچھ ہوا۔ ذہنی اور جذباتی سمجھوتے کے تحت ہوا۔ دونوں کا ارادہ اس میں شامل تھا۔ ایسے میں تم ساری ذمہ داری مجھ پر ڈالو گی تو اسے کون تسلیم کرے گا؟"

"ٹھیک ہے میں بھی اتنی ہی مجرم ہوں۔ جتنے تم لیکن یہ سب کچھ جو کہ نا سمجھی یا خلوص سے ہو چکا تھا۔ اس کے نتائج سے تم غافل کیوں رہے۔ جبکہ یہ جانتے تھے کہ اس سماج کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور بے حد لمبی زبان۔۔۔؟"

"ہاں! مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے تمہیں اپنا پتہ نہیں دیا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں تمہیں دھوکہ دینا چاہتا تھا یا تمہارے بچے کا باپ کہلوانے سے ڈرتا تھا۔ مجھے تو سرے سے اس بچے کے وجود کا علم ہی نہیں تھا اور نہ تم نے کبھی اس کا اشارہ کیا تھا۔۔۔ ہاں میں نے تمہیں بھلا دیا۔ لیکن میں نے تو اس سے بھی زیادہ ایک اہم کام کیا اور اس لڑکی کو بھول جانے کی کوشش کی جس نے مجھے زندگی کا روگ دیا تھا۔ دیکھو آج میں تندرست ہوں۔ گویا وہ لڑکی بھی اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ میرا تو اب یہ ایمان ہو چلا ہے کہ فرض کے سوا دنیا کی ہر چیز کسی اسٹیج پر آ کر اپنی اہمیت کھو دیتی ہے"۔

نمو' میرے گریز و فرار کی ساری حقیقت جان چکی تھی۔ ناہید بھی میری باتوں سے مرعوب ہو چکی تھی۔ ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ فرض بھی کسی اسٹیج پر آکر اپنی اہمیت کھو دے؟"

"بیٹھ جاؤ!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ "اس کا بھی تمہیں جواب مل جائے گا"۔

ناہید بیٹھ گئی۔ میں بھی کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"دیکھو! کبھی میں تمہارے لئے دیوانہ تھا۔ بہت خلوص سے میں نے تمہیں چاہا

تھا۔ لیکن تمہارا جسم حاصل کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ چاہت کہیں تحلیل ہو گئی ہے۔ وہ خلوص کہیں بہہ گیا ہے۔ وہ دیوانگی ایک قطرۂ خون کی مرہون منت تھی۔ جب تک جسم میں خون کی حرارت تھی تمہاری ہر بات اچھی اور تمہاری ہر ادا دلفریب لگتی تھی۔ لیکن جب خون کی حرارت معمول پر آگئی۔ تو تمہاری باتیں مجھے بار معلوم ہونے لگیں۔ تمہاری دلکش اداؤں سے مجھے چڑ ہو گئی۔ اور تمہارے خوبصورت جسم کے تڑپا دینے والے زاویے اپنی قوت اور گرفت سے محروم ہو گئے۔ قدرتی طور پر میں تم سے کھنچتا چلا گیا اور ایک دن میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر ان پہاڑوں میں آ گیا۔۔۔ ہم نے زندگی کے چند دن خوشی خوشی گزارے تھے۔ وہ اکیلے میرے نہیں۔ تمہارا بھی ان میں حصہ تھا۔۔۔ یہاں آکر میں تمہیں بھول گیا۔ کسی کو صدمہ دیئے بغیر بھول جانا جرم نہیں۔ بلکہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔ لیکن جب تقدیر مجھے یہاں لائی۔ اور میں نے وہ بچہ دیکھا جو تمہاری اور میری مشترکہ بھول کا نتیجہ تھا۔ تو مجھے محسوس ہوا کہ اب میں تمہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تم سے شادی کرنا ہو گی۔ اس بچے کے مستقبل کے لئے اور تمہارے مستقبل کے لئے۔ کیونکہ جس سماج میں ہم نے جینا ہے اس کا تقاضا یہ ہے اور یہی تھا وہ فرض' جس نے مجھے یہاں سے فرار ہونے کے بجائے روک رکھا تھا۔ میرے خیال میں اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ اپنی جبلت پر جبر کر کے بھی فرض کو دنیا مقدم رکھتی ہے!"

ناہید بڑے غور سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں مکمل شکست خوردگی کا احساس تھا۔

"تو تم محض فرض کی خاطر مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں! شادی فرض کا بالکل دوسرا نام ہے۔ میں اس سلسلے میں تمہیں محبت کا دھوکہ ہرگز نہیں دوں گا۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور جو لوگ محبت کے دھوکے میں آکر شادی کرتے ہیں وہ بھی چند روز بعد جان جاتے ہیں کہ وہ محبت کی نہیں' فرض کی بجا آوری کر رہے ہیں۔ اس لئے میں پہلے سے تمہیں صاف کیوں نہ بتا دوں'

کہ مجھے تم سے پیار نہیں ہے۔ اس سے ہم دونوں کو فائدہ بھی ہو گا۔ ہمیں ہر وقت احساس ہو گا کہ ہم فرض پورا کر رہے ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا چکے ہوں گے کہ زندگی اسی قید و بند کا نام ہے"۔

اس غیر معمولی انکشاف اور دلائل سے ناہید کا رہا سہا دم بھی ختم ہو گیا۔ چند لمحے پہلے جوش میں آ کر جو کچھ کہہ چکی تھی۔ اب اسے ہیچ معلوم ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ سوچ رہی تھی کہ سرے سے اس نے غلط ہی کہا تھا۔ جو شخص اتنی صفائی سے کہتا ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے مگر شادی تم ہی سے کروں گا۔ اس شخص کی عزت تو کرنی ہی پڑے گی۔

ایسی بات کوئی معمولی آدمی نہیں کہہ سکتا۔

"دیکھو!" میں نے اسے چپ دیکھ کر پھر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "تم نے جذباتی ہو کر جو کچھ مجھ سے کہا اس سے مجھے صدمہ نہیں پہنچا۔ اپنی عزت نفس کے لئے آدمی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ان بدترین حالات میں بھی تم نے خودداری کا مظاہرہ کیا۔ میرے پاؤں پر نہیں گریں۔ اس سے تمہاری عزت میری نظروں میں کم نہیں زیادہ ہوئی ہے۔ میں تمہاری عزت شروع سے کرتا تھا۔ اب زیادہ کروں گا۔ کسی کی عزت کرنا بھی ایک قسم کی محبت ہے اور یہ محبت اس جنسی محبت سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہوتی ہے۔ گو اس طرح کی طوفانی نہیں ہوتی!"

ناہید اس حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ کہ فرط عقیدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کرسی سے اس نے میرے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ اور بے اختیار رو پڑی۔

مجھے نمو کا خیال آیا۔ شاید اس نے مجھے اس لئے بلایا تھا کہ دو بچھڑے ہوئے ساتھیوں کا ملاپ ہو جائے۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر ناہید کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں چوم لیں۔ ناہید نے مجھے عقیدت سے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

یہ شخص مجھ سے پیار نہیں کرتا چلو نہ کرے۔ لیکن یہ اگر اس خلوص اور یقین کے ساتھ میرے آنسو خشک کر سکتا ہے تو میرے لئے یہی کافی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مانگتی!

میں نے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔

"تم کبھی بھی خود کو سماجی اور معاشی طور پر کمزور عورت مت سمجھو۔ تم ہمیشہ میری دوست رہو گی۔ شادی کے بعد میں تمہیں اور زیادہ قابل احترام سمجھوں گا۔ شادی کے اس افادی پہلو کو تو کم از کم ہر آدمی تسلیم کرے گا۔ کہ میاں بیوی کا رشتہ دو اجنبی انسانوں کو ایک دوسرے کا سچا بہی خواہ اور ہمدرد بنا دیتا ہے"۔

ناہید آنکھوں میں پیار کے پھول بھر کر بولی۔

"میں تمہاری کینز ہوں ندیم! تم مجھ پر زندگی کے آخری سانس تک بھروسہ کر سکتے ہو۔ تمہارے آج کے سلوک سے مجھے جتنی خوشی ہوئی ہے۔ وہ تمہارے پیار سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ کل تک میں ایک جذباتی مرد کے خیالوں سے برسرپیکار تھی۔ لیکن آج مجھ پر ایک عظیم شخصیت کا عزم' سایہ فگن ہے۔ آج میں خود کو ہر خطرے سے محفوظ سمجھتی ہوں۔ آج مجھے ایک مضبوط مرد کی دوستی کا فخر حاصل ہے۔ تم نے اچانک اور بے حد غیر متوقع انداز میں مجھے بہت اونچا کر دیا ہے!"

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ باہر نمو نے پوپی کو سینے سے بھینچ لیا اور ہونٹ کاٹتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہی زندگی ہے۔ یہاں روتوں کو تو ہنسنے میں شاید دیر لگ جاتی ہے۔ مگر ہنستوں کو رونے میں دیر نہیں لگتی۔

میں محسوس کر رہا تھا آج وہ پوپی کو بہت پیار کرے گی۔ جس شخص کے تصور سے نمو کی دنیا رنگین تھی۔ اسی کا خون اس بچے کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ وہ اسی کے وجود کا ایک حصہ تھا۔ وہ انہیں خیالوں میں سے ایک خیال تھا جو اس نے بڑے لاڈ اور پیار سے پالے تھے۔

جیسے کسی کا نوجوان بیٹا مرجائے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ لیکن اس کی ذہانت' اس کی خوبیاں اور اس کی باتیں' جگنو بن کر خیالوں میں دمکتی رہیں۔ بس اسی قسم کی تصوراتی تسکین پوپی کی اپنائیت میں مخفی تھی۔

ایک دو دن گزارنے کے بعد میں نے محسوس کیا۔ کہ نمو نے بڑے صبر اور تحمل سے میرے اور ناہید کے رشتے اور تعلق کو قبول کر لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے نہ مجھ سے گلہ ہے اور نہ ناہید سے کوئی شکوہ۔

بے شک نمو اجڈ اور جاہل لڑکی تھی۔ مگر فطرت نے پیار کرنے کا جذبہ اسے بھی دوسروں کی طرح ودیعت کیا تھا۔ ایک پڑھی لکھی عورت کی طرح وہ بھی پیار کی محرومی سے متاثر ہو سکتی تھی اور وہ ہوئی تھی۔ مگر اس کا پیار اس لئے ارفع و اعلیٰ تھا کہ بے ریا تھا۔ دل میں ہزاروں ارمان ہیں۔ مگر زبان خاموش ہے۔ آنکھوں میں ان گنت پیام ہیں۔ مگر لب سل گئے ہیں۔

اس کا رویہ ایسے ہو گیا تھا' جیسے مجھے نادم ہونے سے بچا رہی ہو۔ اسے قریب رکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا دور رکھنا۔

اس کے برعکس ناہید کے کردار میں جو ایک غرور اور تمکنت سی ہوا کرتی تھی وہ سراسر وفا اور غلامی میں بدل گئی تھی۔ وہ میری راہ میں بچھ بچھ گئی تھی۔ میرے آرام و آسائش' کھانے پینے ہر بات کا خود خیال رکھتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ بس وفا اور خدمت ہی اس کا نصب العین بن گیا ہو۔

اس کی یہ وفا شعاری دیکھ کر میں اس کے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اس کی خاکساری سے میں چڑا نہیں۔ بلکہ کوشش کرنے لگا کہ ناہید کے دل سے یہ خیال دور کر دوں کہ وہ میرے رحم و کرم پر ہے۔

ناہید اور نمو دوہری ذمہ داریاں تھیں۔ جنہیں میں نیک نیتی سے نبھاہ رہا تھا۔ لیکن ہماری شادی کو ابھی ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ مال روڈ کی ایک شام نے مجھے ایک نئی صورت حال سے دوچار کر ڈالا۔

میں اور ناہید آگے آگے جا رہے تھے۔ نمو پوپی کو اٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ مری کی خنک اور سہانی شام' رنگ برنگ کے ملبوسات' نکھرے' شگفتہ چہرے--- بیس پچیس قدم کے فاصلے پر فیروزی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔ اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

لڑکی مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ اور اب ہمارے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس کے ہمراہ ایک چھوٹے سے قد کا سانولا سا نوجوان تھا۔ وہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ لڑکی کی نگاہیں ابھی تک مجھ پر نہ پڑی تھیں۔ میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ اور میں کسی حد تک سہم گیا تھا۔

زیادہ بھیڑ کی وجہ سے لڑکی کی توجہ اب بھی ادھر نہ ہوئی تھی۔ بہت اغلب تھا کہ وہ ہمیں دیکھے بغیر آگے گزر جاتی۔ مگر کسی ان جانے جذبے کی تحریک سے میں بے ساختہ پکار اٹھا۔ "شمسہ!"

شمسہ نے دیکھا اور دوسرے لمحے اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ غیر متوقع میرے پہلو میں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ حیرت و استعجاب کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔ نوجوان نے دھیرے سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

مگر وہ کچھ نہ بولی۔ میں اب قدرے سنبھل چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اور اس سے پہلے کہ شمسہ کے جواب کا انتظار کروں--- ناہید سے مخاطب ہوا۔

"آؤ ناہید ان سے ملو۔ یہ ہیں شمسہ' ان کے والد جج ہیں اور ان کے بھائی میرے بڑے دوست ہیں۔ ایک بار کراچی گیا تھا تو انہوں نے بڑی شاندار دعوت دی تھی"۔

ناہید نے مسکرا کر شمسہ کو سلام کیا۔ شمسہ پہلی بار مسکرائی اور سلام کا جواب دیا۔ میں نے ساتھ والے نوجوان سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے ندیم کہتے ہیں"۔

نوجوان بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر بولا۔

"خاکسار کو سعید کہتے ہیں"۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ اور پھر ناہید کی طرف دیکھا۔ اور "اور یہ ہیں ناہید میری وائف۔"

شمسہ کے منہ پر جیسے کسی نے طمانچہ دے مارا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے غور سے ناہید کو دیکھا۔ اور پھر میری طرف' اس کی نظروں میں حیرت کے ساتھ جواب طلبی بھی تھی۔

ناہید خوبصورت تھی۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ مگر یہ صورت اس کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی کہ جس نے اس کے پیار کو نیچا دکھایا ہے!

میں نے اس کی گھبراہٹ کو پوری طرح محسوس کیا۔ مگر ان لمحوں کا تقاضا تھا کہ صورت حال اور سنجیدہ نہ ہونے پائے۔ میں ہنس کر بولا۔

"اگر گستاخی نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے سعید صاحب سے شادی کر لی ہے؟"

شمسہ نے بظاہر شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ سعید صاحب نے ہنس کر اس کی تائید کی۔

"جی ہاں! آپ نے درست اندازہ لگایا ہے۔ ہماری شادی کو صرف دس دن ہوئے ہیں"۔

"اوہ! مبارک مبارک۔ تو گویا ہنی مون منا رہے ہیں"۔

سب ہنس پڑے۔ نمو پوپی کو گود میں لئے چپکے سے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"اری نمو' آگے آؤ"۔

نمو لجاتی ہوئی سامنے آ گئی۔ میں نے اس کا بھی تعارف کرایا۔

"یہ پوپی کی آیا نمو ہے اور یہ ہمارا بیٹا پوپی ہے"۔

شمسہ کے دل پر ایک اور بجلی گری۔ میرے سلوک اور اطوار و گفتگو سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں بے حد مطمئن' مسرور اور پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔

شمسہ نے حسرت و یاس سے بچے کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے۔

پوپی حسب عادت ہنسا اور پھر مچل کر اس کی گود میں پہنچ گیا۔

اس نے پوپی کی ٹھوڑی پر انگلی رکھی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ شمسہ نے اس کے سرخ سرخ گالوں کو چوم لیا۔

نمو مسکرا رہی تھی۔ مگر جانے شمسہ کا دل کیوں بھر آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پوپی کو سینے سے بھینچ لیا۔ میں جو اس کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کی ہر جنبش کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔

"چلو بھائی کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پئیں"۔

نمو بچے کو لینے کے لئے آگے بڑھی تو شمسہ بڑے گھریلو لہجے میں بولی۔

"رہنے دیجئے۔ ایسے پیارے بچے بوجھ تھوڑے ہوتے ہیں"۔

ہوٹل پہنچ کر سب ایک بڑے میز کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ پوپی اب خود سے نمو کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ کل ہی مری پہنچے ہیں اور رٹز ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ چائے آ گئی تو میں نے کہا۔

"ارے ناہید! تم نے ابھی تک ان کو دعوت نہیں دی۔ نیا بیاہتا جوڑا ہے۔ انہیں گھر پر بلاؤ اور اچھی اچھی چیزیں کھلاؤ"۔

سب ہنس پڑے۔ ناہید بولی۔

"آپ ہر بات میں پہل کر جاتے ہیں۔ دعوت کے لئے تو میں نے کہنا تھا۔ مگر میں اس کے لئے موزوں موقع تلاش کر رہی تھی"۔

"مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" سعید نے تکلف برتنا چاہا۔ "ابھی تو کافی دن ٹھہریں گے' دعوت بھی کسی روز ہو جائے گی"۔

"ارے نہیں صاحب! ہم ادھار رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ شمسہ کی دعوت ہمیں یاد ہے۔ ہم تو قرضہ چکائیں گے"۔

شمسہ ہنس پڑی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کی دعوت ضرور کھائیں گے۔ تاکہ آپ کا بوجھ اتر جائے!"

"ہاں ٹھیک ہے۔ جب آپ بوجھ اتار دیں گے تو ہم ایک اور دعوت دے کر آپ کے کندھوں پر مزید بوجھ لادیں گے۔ تاکہ یہ سلسلہ چلتا رہے"۔

نمو' ناہید اور سعید اس ذومعنی گفتگو کو نہ سمجھ سکے۔ مگر شمسہ نے مجھے ایسے ساحرانہ نگاہوں سے دیکھا کہ میرا دل کانپ کانپ گیا۔ یقیناً یہ لڑکی اب بھی میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ خود میرا دل بھی دھیمے دھیمے سروں میں کہہ رہا تھا--- تم نے تو اسے بھلا دیا تھا۔ تم تو اسے بھول چکے تھے۔ تم تو اس کے شوہر کو بظاہر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مگر دل ہی دل میں اسے کس قدر تنقید کا نشانہ بنا چکے ہو!

میں نے گھبرا کر موضوع بدل دیا۔

"شمسہ! آپ تو آئس کریم بہت پسند کرتی ہیں۔ یاد ہو گا۔ اس دعوت میں سب نے چائے پی تھی۔ آپ نے آئس کریم کھائی تھی۔ کہو تو منگوا دوں؟"

"نہیں شکریہ! آج سب کے ساتھ میں بھی چائے پیوں گی"۔

ناہید نے چائے بنا کر سب کو دی اور پھر شمسہ سے مخاطب ہوئی۔

"تو آپ کل ہمارے ہاں آ رہے ہیں؟"

"جی کیوں نہیں آئیں گے۔ یہ آپ کا بچہ اتنا پیارا ہے۔ کم از کم میں تو روزانہ اسے دیکھنے آؤں گی"۔

میں نے محسوس کیا کہ فخر اور غرور کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے من کو گدگدا کر گذر گیا۔

یہ جیون ہے کیا؟--- میں اس وقت تین ایسی لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا

جس سے میں "فردا" فردا" محبت کر چکا تھا۔ اس لمحے میرا دل شمسہ کی قربت کو زیادہ محسوس کر رہا تھا اور اس کی ہر بات کو اہمیت دے رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ ارادتاً" نہیں' بلکہ غیر محسوس انداز میں ہو رہا تھا۔

یہ بات نہیں تھی کہ شمسہ کی آمد سے ناہید کا حق خطرے میں پڑ گیا ہو اور یہ بات بھی نہیں تھی' کہ شمسہ کی شخصیت نمو کے خلوص' معصومیتوں پر اثرانداز ہوئی ہو--- ہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی۔ بات جو تھی۔ وہ یہ کہ شمسہ کی توجہ سے میری شخصیت ابھر رہی تھی۔ میں یہ جاننے کے لئے بے قرار تھا کہ شادی کے باوجود مجھے چاہا جا رہا ہے یا نہیں؟

زندگی کے ہر موڑ پر انسان محبوب بننا پسند کرتا ہے اور جو اسے محبوب بناتا ہے۔ قدرتی طور پر انسان اسے عزت دیتا ہے۔ بلکہ ردعمل کے طور پر محبت کا صلہ محبت میں دیتا ہے۔ جن لوگوں کا ذہن صاف نہیں ہوتا اور اس نفسیاتی الجھن کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہی فرض کر لیتے ہیں کہ وہ محبت کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس غلط فہمی میں اپنی ہی پوجا کرتے ہیں۔ اپنی ہی ذات سے محبت کرتے ہیں--- غالباً" میرے لاشعور میں بھی یہی بات تھی۔

ناہید میری بیوی بن چکی تھی۔ اس لئے یہاں تڑپ یا طلب و خواہش کا سوال ہی نہیں تھا۔ نمو کا خلوص و عقیدت اور سادگی صبح و شام مجھ پر نثار ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس مخصوص قسم کی جنونی کیفیت کا احتمال بھی نہیں تھا--- رہ گئی شمسہ' سو وہ ایک غیر شخص کی بیوی تھی۔ چنانچہ اس کے متعلق اس قسم کی خواہش اور تڑپ کا پیدا ہونا بالکل فطرت انسانی کے عین مطابق تھا۔

یہی وجہ تھی کہ شمسہ کی ذومعنی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اور ایک غیر یقینی مسرت اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔ اور آگے جا کر میں اس بات کا منتظر تھا۔ کہ وہ کھلم کھلا اعتراف شکست قبول کر کے میرے زانوں پر سر رکھ دے اور مان جائے کہ دنیا میں اس کے سوا وہ کسی سے محبت نہیں کرتی۔

رات کو میں اپنے خیالوں میں یوں بھٹک گیا۔ جیسے میرے وجود میں ایک کے بجائے تین ندیم بیٹھے ہیں۔ ایک مجھے شمسہ کی حیثیت جتا رہا ہے۔ دوسرا ناہید کا مقام بتا رہا ہے۔ اور تیسرا نمو کی وکالت کر رہا ہے--- ہر ندیم کسی نہ کسی حد تک مجھے متاثر کر رہا تھا۔

ان لمحوں میں مجھے بڑے انوکھے خیال آئے۔ ان پیچیدہ خیالوں میں ایک خیال ایسا بھی تھا جو میری انگلی پکڑ کر میری رہبری کر رہا تھا۔

میں نے سوچا۔ اگر مجھے موقع ملتا۔ اور ایک ہزار خوبصورت لڑکیاں میرے زندگی میں آ کر مجھے متاثر کر جاتیں۔ تو آج میرے وجود میں تین ندیموں کے بجائے ایک ہزار ندیم بیٹھے ہوتے۔ اور مجھے مختلف انداز میں ستاتے۔ پھر میں کس کا ساتھ چھوڑتا، کس کا ساتھ دیتا؟

مگر اس معاشرے میں ایک آدمی کو اتنے مواقع نہیں ملتے۔ زندگی میں شاید ایک آدھ ہی عورت ایسی ملتی ہے۔ وہ بھی شاذ و نادر--- جو آدمی کو سچی محبت کا یقین دلاتی ہے۔ آدمی اسی کے لئے مرمٹتا ہے۔ اس کی محبت کو زندگی کی معراج سمجھتا ہے۔

اگر اس کا امکان ہو کہ انسان کو دوسری بار محبت ملے اور اس میں وہی مخلصانہ اور والہانہ جذبہ کارفرما ہو۔ اور اس میں اسی دیانتدارانہ سپردگی کا احساس ہو تو بلاشبہ انسان کی بے کسی اور محرومی باقی نہیں رہتی۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر ایک لڑکی کی آغوش محبت اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ تو ایک ہزار لڑکیوں کی گود بھی اسے طمانیت نہیں بخش سکتی۔

خیالوں کی اس منزل پر پہنچ کر مجھے کچھ سکون ملا۔ اب میں اس فیصلے پر پہنچنے میں حق بجانب تھا کہ زندگی میں ایک لڑکی سے جنسی اور جذباتی روابط ایک ہزار لڑکیوں سے جنسی روابط کے مترادف ہیں۔ ہاں اس کے لئے کسی حد تک اپنی جبلت پر جبر کرنا ہو گا۔ بلکہ اپنے آپ سے کہنا ہو گا کہ بہن بھی ایک لڑکی ہوتی ہے۔ ماں بھی اسی صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ماں اور بہن کے لئے جذبوں کا احساس مقدس ہو

سکتا ہے تو ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ۔ حتیٰ کہ ان گنت لڑکیوں سے صرف جنسی لگاؤ کا احساس کیوں پنپتا رہے۔

فطرت اٹل سہی۔

مگر اس سے زیادہ خوشی اس بات میں ہے کہ اپنے ذہن پر جبر کر کے دوسروں کا من موہ لیا جائے---- سچ یہ ہے کہ سچی خوشی دوسروں کو خوش کرنے میں ملتی ہے۔

یہ بات سوچ کر میرے سینے سے بوجھ اتر گیا۔

اور میں گہری نیند سو گیا۔



اب ہم اکثر اکٹھے سیر کو نکلتے۔ ساتھ کھاتے' ساتھ پیتے۔ سعید کافی حد تک مجھ سے مانوس ہو چکا تھا۔ بلکہ کسی حد تک مرعوب بھی تھا۔

اس اثنا میں شمسہ نے محسوس کر لیا تھا کہ میرا سلوک بے حد مخلصانہ اور شریفانہ ہے۔ مگر اس میں چمک نہیں ہے۔ شاید اس سلوک میں جذباتی چاشنی کی کمی تھی۔ یا سرے سے مفقود تھی۔

اس بات سے اسے رنج پہنچا تھا۔۔۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کراچی کے واقعے نے مجھے کس حد تک متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اب وہ اس دنیاوی قسم کے احترام سے مطمئن نہیں تھی۔

اس کے دل کی لگی' ابھی تک نہیں بجھی تھی۔ وہ مجھ سے ایک مخصوص قسم کی والہانہ تڑپ کی خواہشمند تھی۔ اور وہ اسے نہیں مل رہی تھی۔۔۔ اس نے سوچا شاید میں اس سے انتقام لے رہا ہوں۔ لہٰذا اس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس نے غیر ضروری طور پر اپنے شوہر سے میرے سامنے پیار و خلوص کا مظاہرہ کیا۔ وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ اور میرے بغیر اس کی زندگی نامکمل نہیں ہے۔

مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ اپنی طرف متوجہ کرنے کی یہ بڑی بھونڈی کوشش تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے کے باوجود خوشی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ اپنے شوہر سے فریب کر رہی تھی۔

لیکن میں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ ایسے مواقع میں خود کو بالکل بے پردہ اور لاتعلق رکھتا۔ گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ شمسہ کے لئے یہ اور آزمائش ہوتی اور وہ کٹ کٹ جاتی۔

مجھے امید تھی کہ جب جذباتی دور گزر جائے گا اور اس کے سوچوں کی سطحیت ختم ہو جائے گی اور اس کے خیالوں میں گمبھیرتا آ جائے گی۔ تو اسے خود احساس ہو جائے گا کہ زندگی بہت بڑی امانت ہے۔

پھر وہ شوہر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر دور پھینک دے گی تو اس میں دکھاوا نہیں' زندگی کا خلوص ہو گا۔ تصنع نہیں حقیقت ہو گی۔

بھٹکنا عارضی ہوتا ہے۔ ایک دن جذبات تھم جاتے ہیں اور پھر جیون کا دھارا بہت دھیرے دھیرے بڑے سکون اور بے حد تسلی سے منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔

اس عرصے میں ناہید نے میرے اور شمسہ کے میل جول پر ذرا بھی شبہہ نہ کیا۔ حالانکہ ایک روز اس نے اپنی بہن' تبسم پر بھی شک کیا تھا۔ دراصل جن حالات میں' میں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس سے ناہید کا اعتماد مجھ پر اور زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ اور اب یہ اعتماد یقین کی شکل میں مزید مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ بلکہ اس کے اس یقین کو غرور اور فخر کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

نمو خاموش تھی۔ نہ احتجاج' نہ شکوہ' نہ شکایت اور نہ قربت کی تڑپ' وہ اپنے حصے پر گویا صابر بن کر بیٹھ گئی تھی۔ پوپی سے اس کی گرویدگی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس کے سارے جذبات' آسمانی احساسات کا روپ

دھار کر پوپلی میں منتقل ہو گئے تھے۔

بعینہ نمو کے بارے میں میرے احساسات آفاقی رنگ اختیار کر گئے تھے۔ میرا دل اس پاک ذہن اور پاک دامن لڑکی کی عقیدت سے لبریز تھا۔ میں لحموں اسے دیکھتا اور ایک عجیب کیف سے سرشار ہو جاتا۔ اس سرشاری میں یاس و محرومی کی چاشنی ہوتی' درد شناس اور غم آشنا جذبہ ہوتا۔

لیکن جب ایسے میں نمو کی نگاہیں مجھ پر پڑتیں تو میں بے حد شرمسار ہو جاتا اور فوراً نگاہیں جھکا لیتا۔

ایک انداز تو یہ تھا کہ پیار پر سے میرا اعتقاد اٹھ گیا تھا۔ مگر نمو سے میرا رشتہ اتنا ارفع اور اعلیٰ اور مقدس تھا کہ اپنے من پر خدائی احساس کا پرتو دیکھ لیتا تھا۔ شاید یہی وہ مقام تھا جہاں مجاز حقیقت کا رنگ بدلتا ہے۔ دراصل اسی رنگ نے مجھے ناہید کا وفادار ساتھی بنا دیا تھا۔ اور اسی رنگ نے میرے اور شمسہ کے درمیان فرض اور تفہیم کی دیوار کھڑی کر دی تھی--- اور غالباً" یہی رنگ جذبات و احساسات کے پھولوں کو اعتدال کے گلدستے میں سجا کر زندگی کو مسرت اور صداقت بخشتا ہے۔

میرا ذہن اس قدر صاف ہو چکا تھا۔ کہ اپنے دل کے پیمبرانہ محسوسات کو بالکل واضح صورت میں دیکھ رہا تھا۔

جنسی ناآسودگی' جہاں ذہنی پراگندگی اور بے راہ روی کا سامان پیدا کرتی ہے' وہاں جنسی آسودگی' ایک ہاتھ نہ آنے والی خوشی کے انجام سے دوچار کر دیتی ہے۔ انسان سوچتا ہے۔ وہ سب کچھ یہ تو نہ تھا۔ جس کے لئے وہ ساری عمر سرگرداں رہا ہے؟

وقتی طور پر اس کا نتیجہ ہنگامہ خیز سہی۔ مگر اس تلاش بسیار کا ماحصل تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔

شروع شروع ناہید سے جذباتی لگاؤ نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ لیکن جنسی تعلق استوار ہونے کے بعد اس کا نتیجہ لطف انگیز ہونے کے باوجود بے حد دل شکن اور

مایوس کن بھی تھا۔ اور جو بعد میں فرار و گریز کی شکل اختیار کر گیا۔

لیکن اب--- جب وہ میری بیوی بن گئی۔ میں شب و روز جنسی آسودگی کے ماحول میں سانسیں لے رہا تھا۔ کسی قسم کی ذہنی تبدیل کا شکار نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ اب میں جنسی کشش و ترغیب کے معنی بھی سمجھ گیا تھا اور عمل و ردعمل کے فریب کو بھی۔

اب میں جنسی طور پر مکمل بالغ نظر انسان تھا۔

اور پھر اس ذہنی ٹھہراؤ پر' نمو کی سادگی اور صداقت نے مہریں ثبت کر دی تھیں---- نمو جو پیار کر کے بیچ راہ میں معلق ہو گئی تھی۔ جو اپنے حق کے لئے اصرار نہیں کر رہی تھی۔ مگر جس کی نامرادی میں اتنی شکتی تھی کہ اس نے میری سوچوں میں آفاقی رنگ بھر دیا تھا۔ گویا اس کا وجود نہ صرف میرے لئے بلکہ پورے سماج کے لئے ایک خوبصورت مستقبل کا نشان تھا۔

ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھ میں اپنے طور پر متاثر ہونے کی اہلیت تھی۔ لیکن جب تک پھول کھلتا نہیں۔ اس کے پودے سے کوئی معطر نہیں ہو سکتا۔

نمو نہ ہوتی۔ تو یہ کلیاں نہ کھلتیں۔ یہ جذبے پیدا نہ ہوتے۔

وہ پیار' حسن اور حیا اور صبر کی ایک تصویر تھی' جو روح کو جلا بخشتی تھی۔

وہ غم تھی' جو زندگی کو گداز بنا دیتا ہے۔

وہ آنسو تھی' جس سے آتما کی پیاس بجھتی ہے۔

وہ پکار تھی' مگر سنگیت سے لبریز۔

وہ یاس تھی' مگر آس کے مینار کی طرح روشن۔

نمو کو نہ ان نفسیاتی الجھنوں سے کوئی تعلق تھا اور نہ اپنی بڑائی اور عظمت کا علم ---- اور نہ وہ اس بات کو جانتی تھی کہ اس کے سیدھے سادے کردار سے دوسرا کتنا تاثر لیتا ہے۔

جس طرح سرخاب اپنے پروں کے حسن اور قیمت سے بے خبر ہوتا ہے۔ جس

طرح ہیرا اپنی چمک اور دمک کی اہمیت کا ادراک نہیں رکھتا اور جس طرح کسی خوبصورت منظر کو اپنے حسن کا احساس نہیں ہوتا۔ نمو کو بھی نہیں تھا۔

مگر جس طرح ہر خوبصورت چیز ذہن میں ایک احساس پید اکرتی ہے۔ نمو کا کردار بھی ایسی ہی سچائی اور حسن کا محرک تھا۔ وہ صبر' پیار اور چاشنی کا مظہر تھی۔

چاند ایک ویرانہ سہی۔ مگر انسان کے لئے تو روشنی کی علامت ہے۔

خدا کو کسی نے نہ دیکھا ہو۔ لیکن "صبح" تو روز دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک "پرنور صبح" میں جو راحت' تسکین اور مسرت ہوتی ہے۔ نمو کے وجود میں بھی کچھ ایسی ہی طمانیت کا احساس تھا۔

ایسے ہی سوچ کا کرشمہ تھا کہ کل کی حب ذات' آج حب محبوب کی معرفت سے حب انسانیت کا روپ دھار گئی تھی۔

اس روز میں شمسہ اور سعید کا انتظار کر رہا تھا۔ ناہید کو سردی لگ گئی تھی۔ اس لئے اس کی طبیعت ناساز تھی اور باہر سیر کو جانے کا موڈ بھی نہ تھا۔ اتنے میں شمسہ آ گئی تو وہ بولی۔

"لو--- وہ لوگ آ گئے۔ بس اب آپ اکیلے نہیں رہے"۔

"کیا بات ہے"۔ شمسہ نے پوچھا۔ "آپ لیٹی ہوئی ہیں۔ کیا آج آپ باہر نہیں جائیں گی؟"

"نہیں شمسہ! آج مجھے رہنے دیجئے۔ سر میں درد بھی ہے۔ جسم بھی بھاری بھاری ہو رہا ہے۔ میں آج ذرا آرام کروں گی۔ سعید بھائی کہاں ہیں؟؟"

"وہ تو کسی دوست کے ساتھ آج دوپہر ہی کو نکل گئے تھے۔ کہہ گئے تھے میں شام کو مال پر ہی ملوں گا"۔

شمسہ کہنے کو تو بات کہہ گئی۔ مگر اس کا رنگ بدل گیا۔ میرے ساتھ اکیلے جانے کا ایک موقع بن گیا تھا۔ وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ناہید بولی۔

"ہاں تو پھر آپ جایئے۔ دیکھئے ندیم! میرے لئے اسپرو کی ٹکیاں لیتے آنا"۔

میں کسی حد تک چونک گیا تھا۔ مگر یہ اصرار کا موقع نہیں تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ اگر میں اس موقع پر ناہید کو ساتھ لے جانے پر زیادہ زور دوں گا۔ تو شمسہ شاید اس اصرار میں بداعتمادی کی جھلک دیکھ کر اپنی توہین محسوس کرے۔ لہٰذا خاموش رہا۔

کوٹھی سے باہر نکل کر میں نے کہا۔

"تو ہم پنڈی پوائنٹ کی طرف جائیں گے۔ سعید صاحب مال ہی پر ملیں گے نا؟"

"ہاں!"

شمسہ نے تائید کی۔ اگر وہ سعید کا ذکر پہلے نہ کر بیٹھتی تو پنڈی پوائنٹ پر جانے کے بجائے کشمیر پوائنٹ کی طرف جانے کی تجویز پیش کرتی۔ کیونکہ ادھر سعید کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ کچھ سہمی ہوئی تھی۔

مال پر پہنچ کر اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ اس بھیڑ بھاڑ سے بہت جلد نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کو بھی میں سمجھ رہا تھا کہ کہیں سعید سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

مگر بدقسمتی یا خوش قسمتی--- سعید ہمیں نہ ملا۔ اور ہم بہت آگے نکل گئے۔

ہم دونوں رسمی باتیں کر رہے تھے۔ اور اس کے بوجھ کو بھی محسوس کر رہے تھے۔

دونوں جانتے تھے کہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ موضوع جو تھا میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ مگر شمسہ اس موضوع تک پہنچنے کے لئے راستہ تلاش کر رہی تھی۔

میرا موضوع سے بچنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس میں فراریت کا پہلو تھا۔ مگر جب زندگیاں ایک خاص ڈگر پر چل پڑی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی اپنی منزل متعین کر لی تھی۔ تو پھر گڑے مردے اکھیڑنے کا فائدہ بھی کچھ نہیں تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میں اب تک پہلو بچاتا رہا۔ پہلے دن شمسہ کو دیکھ کر میں ضرور چونکا تھا مگر بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ وہ بالکل سطحی قسم کا جذبہ تھا۔ جس نے وقتی

طور پر مجھے چونکا دیا تھا۔

مگر آج--- مجھ پر یہ ذمہ داری آن پڑی تھی کہ اس منفی صورت حال کا مقابلہ کروں اور شک و شبہہ کی دیواریں ڈھا دوں۔

اب ہم پنڈی پوائنٹ پہنچ چکے تھے۔ اور چیڑ کے اکیلے درخت کے پاس ایک چٹان پر بیٹھ گئے تھے۔ نیچے دور تک گہری گھاٹیاں تھیں اور راولپنڈی کی سطح مرتفع ہلکی ہلکی غبار میں لپٹی ہوئی تھی--- غروب آفتاب میں ابھی تقریباً آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ باتیں کرتے کرتے میں نے پوچھا۔

"تم اکیلی آگئیں شمسہ! سعید صاحب محسوس تو نہیں کریں گے؟"

"ارے نہیں بھئی۔ وہ بہت سیدھے آدمی ہیں۔ اس قسم کی باتیں سرے سے ان کے دماغ میں آتی ہی نہیں!"

"ہاں-- وہ آدمی مجھے معقول لگے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کی ازدواجی زندگی کامیاب ہو گی"۔

"ہوں!" وہ ہنس پڑی۔ اسکے لہجے میں طنز تھا۔ "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"آپ لوگوں کے تعلقات سے۔ وہ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا ہے۔ آپ کے طور طریقے سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ خوش ہیں"۔

"ٹھیک ہے" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ "اگر آپ یہی سمجھتے ہیں تو مجھے واقعی خوش ہونا چاہیے"۔

"کیوں۔ ایسی کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوئی ہو گی۔ ورنہ آپ انکار کر سکتی تھیں"۔

"انکار کی کیا ضرورت تھی۔ جب زندگی میں چاشنی ہی باقی نہ رہی تھی۔ پھر اقرار کرتی یا انکار کرتی۔ میرے لئے برابر تھا۔

"نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ جب زندگی میں چاشنی باقی نہ رہی تھی تو زمین پر

بوجھ بننے کی بجائے آپ خودکشی کر سکتی تھیں۔ مگر آپ نے تو شادی جیسا اہم کام کیا اور اب ہنی مون منا رہی ہیں۔ آپ کی زندگی مقصد سے خالی نہیں تھی۔ کل آپ کے بچے پیدا ہو جائیں گے۔ پھر یہ مقصد اور زیادہ پھیل جائے گا--- یہ سائنس کا دور ہے کسی ایک شخص کے لئے زندگی وقف کر دینے کا زمانہ اب نہیں رہا۔ آپ نے شادی کر کے ایک ذمہ داری مول لی ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ اس قابل تھیں۔ میرا خیال آپ کو اپنی قابلیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے"۔

شمسہ یہ لمبی تقریر سن کر سٹپٹا گئی۔ وہ سمجھی میں اسے شادی کا طعنہ دے رہا ہوں"۔

"آپ نے کون سی خودکشی کر لی ہے۔ آپ نے بھی تو شادی کر لی ہے۔ میں نے اب کی ہے۔ آپ تو ایک بچے کے باپ بھی بن گئے ہیں!"

میں ہنس پڑا۔

"لو--- آپ تو خفا ہو گئیں۔ میرا مطلب آپ کو اشتعال دلانا نہیں تھا اور یہ نہ مقصد تھا کہ آپ پر بے وفائی کا الزام لگاؤں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چند پیارے لمحے اور کچھ خوبصورت جذبے دیئے ہیں۔ ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اور اب جب کہ سوائے خلوص اور دوستی کے ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ ہمیں اپنے دلوں سے ہر خیال نکال دینا چاہیے"۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے۔ پیار جیسا مقدس جذبہ بھی دلوں سے کھرچ کر نکال دینا چاہیے؟"

"ہاں شمسہ! یہ بھی بعید نہیں ہے۔ بشرطیکہ اپ پیار کے مفہوم کو زندگی کی مروجہ اقدار سے ذرا ہٹ کر معنی پہنا سکیں۔ پیار کا ایک آفاقی نظریہ ہمارا----- بن چکا ہے۔ اس لئے زندگی کے ہر لمحے میں ہم کسی نہ کسی حیثیت سے کسی کے لئے اپنی عقیدت وابستہ کئے رکھتے ہیں۔ پیار نام ہے ان جذبات کا جو جنسی----- سے عبارت ہیں۔ ان جذبات میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ مگر گہرائی نہیں ہوتی۔ پیار ایک جذباتی

غرض ہوتی ہے جو پوری ہونے کے بعد جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے"۔

شمسہ بڑی حیرت سے بولی۔

"گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے پیار کا جو کھیل کھیلا تھا۔ وہ ایک ڈرامہ تھا۔ اس میں صداقت نہیں تھی؟"

"صداقت تھی--- جب تمنائیں جوان ہوتی ہیں۔ جب آرزوئیں تڑپتی ہیں۔ تو اپنی عمر کے لحاظ سے ان میں صداقت ہوتی ہے۔ مگر جب وہ طبعی عمر پاتی ہیں اور منزل سے ہمکنار ہوتی ہیں تو یہ صداقت بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ صداقت طوفان کی طرح اٹھتی ہے اور تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہے۔ اس کی اٹھان بھی جھوٹ نہیں ہے اور اس کی بے اعتنائی اور فرارت میں بھی جھوٹ نہیں ہے"۔

شمسہ عجیب نظروں سے مجھے گھور رہی تھی--- یعنی یہ شخص میلان اور بے اعتنائی دونوں کو سچ کہہ رہا ہے ان کی عمر اور منزل متعین کر رہا ہے اور پھر اپنی بات کو سمجھانے کے لئے پورا اثر ڈالتا ہے۔ اور اس کا وار خالی نہیں جاتا۔

میں اس کی آنکھوں میں شک و یقین کی ملی جلی کیفیتیں دیکھ کر مسکرایا۔

"شمسہ! کوشش کروں گا کہ سچ اور جھوٹ کے اتصال سے جو چنگاری نکلتی ہے اس کے متعلق آپ کو بتا سکوں کہ وہ زندگی کو روشنی بخشتی ہے یا اندھیرا"۔

شمسہ چپ تھی اور ہمہ تن گوش۔

"میرا مطلب اس پیار سے ہے جو ہم نے ایک دوسرے سے کیا۔ یہ پیار میرے لئے خدا کے تصور کی طرح حسین اور مقدس تھا اور مجھے اس پر غیر متزلزل یقین تھا۔ مگر اچانک میری زندگی میں ایک اور انقلاب آیا۔ میں آپ سے زیادہ ایک خوبصورت لڑکی سے ملا اور ہزار انکار کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ اسکا تصور پہلے خدا سے کچھ زیادہ حسین اور تقدس ماب ہے۔ اور میں اس زیادہ طاقت ور خدا کی طرف جھک گیا۔ لیکن جب میں نے اس خدا کو چھو کر دیکھا تو وہ ایک جسم نکلا۔ محض ایک جسم۔ میرا خدا مجھ سے چھن گیا تھا۔ چند دن بعد یہ ڈھارس بندھی کہ صرف میں لٹا

ہوں صرف میرے ذہن پر ڈاکہ پڑا ہے۔ اور شاید یہ تلون مزاجی صرف میرے حصہ میں آئی ہو۔ باقی انسانیت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس خیال نے مجھے آپ کی طرف دوبارہ متوجہ کیا۔ سوچا' دھوکہ میں نے کھایا ہے۔ شمسہ تو مجھے دل و جان سے پیار سے کرتی ہے۔ چنانچہ ہزار تذبذب کے باوجود میں آپ کے بلاوے پر کراچی چلا گیا۔ لیکن وہ دن میری بد نصیبی کا کتنا بڑا دن تھا۔ جب میں ہوٹل کے کمرے میں آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور آپ ایک کیفے میں ایک کیبن میں ایک اجنبی سے محو اختلاط تھیں!"

شمسہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"شمسہ میں جانتا ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے اور میں نے یہ سب کچھ آپ سے کہا بھی نہیں تھا۔ آپ کو مجرم ثابت کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے جبکہ فطرت خود مجرم ہے۔ لیکن چونکہ مجھے آپ کو یہ بات سمجھانا تھی کہ جس وقت ہم ایک دوسرے کے سچے بہی خواہ تھے اور ایک دوسرے کو فریب دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے تو بھی ہم نے فریب دیئے۔ اور فریب کھائے۔ اور اب--- جب ہم پھر ایک دوسرے سے ملے تو میں نے محسوس کیا کہ آپ ابھی تک فریب کے اس جال سے چھٹکارا نہیں پا سکیں۔ آپ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ کچھ سننا چاہتی تھیں اور میں نے آپ کو اس کا موقع فراہم نہیں کیا۔ لیکن آج جب یہ موقع خود سے پیدا ہو گیا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر دوں اور اگر ہو سکے تو آپ کو اپنی طرح کسی نتیجے پر پہنچا دوں"۔

شمسہ جو واقعی کچھ کہنے کے ارادے رکھتی تھی۔ خاموش تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی اور زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ ایک دو لمحے خاموش رہ کر بولا۔

"شمسہ! میں نے یہ سب کچھ ضرور دیکھا تھا۔ مگر آپ سے نفرت نہیں کی۔ اس لئے کہ جو کچھ آپ نے کیا تھا۔ وہی کچھ آپ کی لاعلمی میں میں نے بھی کیا تھا۔ خود

اپنے کو سزا نہیں دے سکا تھا۔ پھر آپ نے نفرت کیسے کرتا۔۔۔ ہاں متاثر ضرور ہوا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ شہر چھوڑ کر پہاڑوں میں آن بسا۔ مگر شکر ہے کہ میں بہت جلد انسان کے جبلی تقاضوں کو سمجھ گیا۔ ناہید سے شادی بھی اسی سمجھ کی بنیاد پر کی تھی۔ ناہید ہی وہ لڑکی تھی جس سے میں نے پیار بھی کیا' نفرت بھی' اور شادی بھی کر ڈالی۔ اور اب نہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں نہ محبت کرتا ہوں لیکن محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے جسم کا کوئی ضروری حصہ ہے۔ اسے تکلیف ہوتی ہے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس دوڑنا پڑتا ہے وہ خوش ہوتی ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کی مسکراہٹ میں میرا بھی حصہ ہے۔ وہ راز نہیں میری بیوی ہے۔ جسے میں کتاب کی طرح ہر وقت پڑھ سکتا ہوں۔ ہر وقت ٹٹول سکتا ہوں مجھے خود پر بھی اختیار ہے۔ اس پر بھی اختیار ہے۔ اس لئے میں اسے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں وہ میرے مزاج کو سمجھتی ہے۔ میرے اشارے کو سمجھتی ہے۔ اس لئے روزمرہ کی چیز ہو کر بھی بار نہیں ہے جب وہ آن بان والی ایک مغرور لڑکی تھی۔ تب بھی اسے دیکھا تھا۔ اور اب جب کہ وہ شوہر کے اشاروں پر ناچنے والی ایک بیوی ہے۔ تو بھی اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت وہ اپنی نخوت اور حسن کی وجہ سے غیر معمولی تھی۔ اور آج وہ اپنی شوہر پرستی اور وفاشعاری کی وجہ سے غیر معمولی ہے۔ عورت جب دوسرے وجوہ سے اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ تو خدمت اور ایثار سے اپنی عظمت منوا لیتی ہے۔ زندگی میں مایوسیوں کے پہلو بہ پہلو بڑے پیارے پیارے سہارے بھی ہوتے ہیں۔ شمسہ۔۔۔۔۔ پیار کی طرح وفا میں بھی ایک چسکہ ہوتا ہے اور پھر پیار کی ایک حد ہوتی ہے مگر وفا کی تو کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ بیوی شوہر سے' شوہر بیوی سے' دوست دوست سے' وفا کرے۔ زندگی یہ بھی تو تقاضا کرتی ہے شمسہ!"

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے"

شمسہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آواز میں عزم اور استقلال تھا۔

"بے شک میرا ماضی بے داغ نہیں ہے۔ اور نہ میرے کردار میں مثالی پختگی

ہے۔ مگر ایک بات میں دعوی اور یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔ کہ اگر مجھے دنیا میں ایک عزیز ترین شخص کے انتخاب کے لئے کہا جاتا۔ تو وہ آپ کے علاوہ دوسرا نہ ہوتا۔ غلط یا صحیح قسم کی رسائی' اپنے گرد و نواح سے متاثر ہو کر ہر لڑکی کرتی ہے۔ میں نے بھی کی ہو گی۔ مگر جسے سچا جذبہ خلوص کہتے ہیں وہ آپ کی ذات کے سوا کسی کے لئے نہیں تھا۔ آپ نے فلسفہ محبت کا جس قسم کا تجزیہ کیا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی جگہ درست ہو۔ پر مجھے اتنا کہنا ہے کہ آج بیوی ہونے کے بعد' اور کل ایک ماں ہونے کے بعد' میں آپ کے دیئے ہوئے یادوں کے چراغ کو ہی زندگی کا سب سے انمول سرمایہ سمجھوں گی!"

"شمسہ یہ بالکل فطری ہے' لاکھ فہم و ادراک سہی یہ انسانی کمزوری کا ایک پہلو ہے۔ کہ وہ اپنے سینے کے کسی گوشے میں ایک لافانی اور آسمانی محبت کی یاد پالتا ہے اور گاہ بگاہ بچوں کی طرح اس سے دل بہلاتا ہے۔ ایک بات ابھی میں نے آپ کو نہیں بتائی۔ یہ جو لڑکی ہے' پوپی کی آیا' یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے اس سے بھی پیار کیا ہے۔ بلکہ کرتا ہوں۔۔۔۔!"

شمسہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ آپ کا چونکنا بالکل فطری ہے۔ آپ شاید سوچیں گی کہ میں ناہید سے بھی بے وفائی کروں گا۔۔۔ نہیں!۔۔۔۔ نمو کے پیار میں یہ رنگ نہیں ہے۔ اس میں ہزار رنگ ہیں۔ ایک سے ایک لکش دلفریب اور دل آویز۔۔۔ اس کا پیار گھائل آتما کے لئے مرہم ہے۔ زندگی کا یہ نظریہ رکھنے کے باوجود' کہ مرد عورت کا پیار ایک قطرہ خون سے عبارت ہے۔ جنسی کشش اور تڑپ کا نام ہی محبت ہے۔ وہاں نمو کی ذات مجھے زندگی کا ایک اور پہلو دکھاتی ہے۔ یہ پہلو اس نظریے کی تردید نہیں کرتا۔ مگر اس میں ایک ایسا پرتو ہے کہ روح کو منور کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی جذباتی ہو کر میں نے تمہارے لئے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔ ناہید کے لئے بھی جذباتی ہوا تھا اور یہ بھی علم ہے کہ نمو کے بارے میں میرے خیالات جذبات سے خالی

نہیں ہوں گے۔ مگر مجھے یہ بھی علم ہے کہ اس سیدھی سادھی لڑکی نے میرے جذبات کی سطحیت میں کیسے کیسے گہرے رنگ بھرے ہیں۔ میں اسے چھو سکتا تھا پر چھو نہ سکا۔ اس لئے کہ میں نے اس کے روپ میں خدا کا روپ دیکھا تھا جسم کو چھونا تو ایک بہت معمولی فعل ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے تقدس تک میرے ہاتھ کب پہنچ سکتے تھے------ خوشبو کو میں محسوس تو کر سکتا تھا۔ مگر اسے اپنی گرفت میں کہاں لا سکتا تھا۔ شمسہ یہ وہ لڑکی ہے جس نے اس روگ کی دوا کی ہے جو تم نے مجھے بخشا تھا۔ پر اب سوچتا ہوں کہ جس روگ کی دوا ہوتی ہے اسے روگ کہنا بھی چاہئے یا نہیں؟"

شمسہ نے ایک بار پھر حیرت و اضطراب سے میری طرف دیکھا۔

"سورج غروب ہو گیا ہے آؤ چلیں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"نیچے گھاٹیوں میں بھی اندھیرا پھیل گیا ہے سڑک کی لائیٹیں جل اٹھی ہیں"۔

شمسہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

اس کے سینے میں روشنی اور تاریکی آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

پنڈی پوائنٹ سے ہم مال روڈ پر پہنچ گئے تو میں نے چائے کے لئے پوچھا۔

شمسہ بولی۔

"ہاں کافی پی لیں گے"۔

دراصل وہ کچھ اور وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتی تھی اس کے ذہن میں کچھ مبہم، مبہم سے سوال ابھر رہے تھے۔ گرم گرم کافی سے ہواڑ اٹھ رہی تھی بولی۔

"ندیم صاحب! اس بات کو تو میں سمجھ گئی کہ آپ ناہید کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔ اور اس بات پر مجھے خوشی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بھی احساس ہو گیا ہے۔ کہ میرے لئے آپ کے دل میں صرف احترام رہ گیا ہے۔ قلبی اور جذباتی رشتہ آپ توڑ چکے ہیں۔ مجھ جیسی سطحی ذہن کی لڑکی کو اس سے صدمہ ضرور ہو گا۔ مگر میرے لئے اس سے بھی تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ آپ نے نمو کے عظیم ہونے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ میں ایک بیوی کی عزت اور عظمت کا بوجھ تو اٹھا لوں گی۔ مگر اپنی جیسی ایک لڑکی کی روحانیت کا بار برداشت نہ کر سکوں گی۔ نمو بھی شمسہ اور ناہید جیسی ایک لڑکی ہے۔ بس اس کی خوش بختی صرف یہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی میں اس وقت آئی۔ جب آپ جنسی طور پر سیر نظر اور جذباتی طور پر بالغ نظر ہو چکے تھے۔ مگر

مجھے پوچھ لینے دیجئے کہ اس تمام بالغ نظری اور سیر نظری کے باوجود کہیں آپ بھی تو نمو کی لافانی اور آسمانی محبت کا دھوکہ نہیں کھا رہے؟"

"ہاں---- ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو اور میں اسے سمجھ نہ سکا ہوں"۔ میں نے تائید کی۔

"مگر میں پھر بھی اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں دھوکے اور فریب کی ان منزلوں کو طے کر چکا ہوں میں جنسی لذت کی محرومی اور جنسی آسودگی کی انتہا دونوں مراحل سے گزرا ہوں۔ جسمانی ناآسودگی کی تڑپ کو میں پیار سمجھتا رہا ہوں۔ اور جسمانی لذکت کو بھی پیار پر محمول کیا ہے۔ حالانکہ دونوں قسم کے نتائج محض وقتی ہی نہیں۔ غلط بھی تھے۔ عورت جب تک راز رہتی ہے بے حد انمول ہوتی ہے۔ اس راز کو پیار بھی کر لو مگر جب وہ بیوی بنتی ہے تو پیار کا یہ راز افشا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ جب تک مرد عورت جنسی لذت کے تجربے سے آشنا نہیں ہوتے۔ یہ راز ہزار شکلوں میں دھوکہ دیتا رہتا ہے اور پیار کا تانا بانا نہیں ٹوٹتا۔ اس کی زندہ مثال خود آپ ہیں جب تک نمو نہیں ملی تھی آپ کو ایک اجنبی کے ساتھ دیکھنے کے باوجود میرا ذہنی رشتہ نہ ٹوٹ سکا تھا اور یہ ٹوٹنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ ہم جسمانی لذت کے جذبے سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ مگر جب اچانک نمو میری زندگی میں آئی تو میری زندگی میں وہ خلا بھی نہ رہا جو ایک عورت کے بغیر ہمیشہ رہتا ہے---- میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یہ خلا بھی جنسی تڑپ کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور نمو سے میرا قلبی لگاؤ بھی اس کے اثر سے خالی نہ ہو گا۔ مگر اس کے باوجود مجھے یہ کہنا ہے کہ اس جنسی لگاؤ نے مجھے بے حد مقدس لمحوں سے آشنا کیا ہے۔ انہی لمحوں نے مجھے احساس دلایا ہے کہ حیوانی سطح پر زندگی گزارنے کا نام زندگی نہیں ہے۔ بے شک دیوانگی کی چند گھڑیوں میں ہم خود کو محظوظ کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے عوض کس قدر انمول اور مقدس احساس کا خون کرنا ہو گا۔ جب جذبات پر ٹھنڈی اوس پڑ جائے گی تو نہ نمو، نمو نظر آئے گی اور نہ اس کی آنکھوں میں بسنے والا خدا نظر آئے گا۔ شمسہ

مجھے اس خدا تک پہنچانے میں آپ کا اور ناہید کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا نمو کا---- آپ نہ ہوتیں ناہید نہ ہوتیں تو نمو سے ملنے والا شخص وہ ہوتا جو آپ کی عصمت کی حفاظت محض اپنے جھوٹے وقار کے لئے کرتا رہا اور پھر ناہید کے سلسلے میں ساری ذمہ داریاں بھول گیا---- مگر نمو سے تو وہ شخص ملا تھا جو پیار کی اور جنس کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا۔ نمو کی قسمت میں تجربوں اور مشاہدوں سے مسلح ندیم آیا تھا۔ اس لئے اگر آج وہ ندیم آپ کے کندھوں پر نمو کی روحانیت کا بوجھ لاد رہا ہے۔ تو سمجھ لو وہ آپ کو اپنا حصہ لوٹا رہا ہے۔ ذہن اسی طرح بنتے ہیں فکر و احساس یونہی روشن ہوتے ہیں۔ اور انسانیت کی تعمیر اسی طرح ہوتی ہے"۔

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی کیونکہ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک گھونٹ نہیں بھرا تھا۔ میں نے بیرے کو گرم کافی لانے کے لئے کہا۔ شمسہ خاموش تھی---- وہ محسوس کر رہی تھی کہ آج میں نے ہمیشہ کی طرح اسے ذہانت سے قائل نہیں کیا۔ بلکہ میری باتوں میں گہرا تجربہ، عمیق مشاہدہ اور ناقابل تردید حقائق پوشیدہ ہیں۔

گرم کافی کے ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد میں پھر شمسہ سے مخاطب ہوا۔

"آپ کی خاموشی سے میں یہ نتیجہ اخذ کر رہا ہوں کہ میرے خیالات میں پسندیدگی کا پہلو موجود ہے اور آپ ان سے کسی حد تک متاثر ہوئی ہیں"۔

شمسہ نے کافی کی پیالی ہونٹوں سے ہٹا کر پرچ میں رکھ دی اور بے حد متانت سے بولی۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ اگر میں آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں کروں تو گویا ایک دوسرے درجے کی جذباتی سطح کی سچائی کا ساتھ دوں گی۔ دوسرے درجے کی سچائی سے میری مراد یہ ہے کہ کبھی یہی سچائی میرے لئے حتمی اور آخری تھی۔ گویا اول درجہ کی تھی۔ ایک عام آدمی کا ذہن اس مروجہ سچائی سے آگے نہیں جھانک سکتا۔ لیکن آج آپ نے وہ باتیں کہی ہیں جو سینے میں کہیں ہوتی تو ہیں مگر جنہیں انسان گرفت میں نہیں لا سکتا۔ اور جنہیں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسی سچائی تک پہنچ سکنے

والے دوسرے درجے کی سچائی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور یوں زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے"۔

میں ہنس پڑا۔

"آپ نے سچائی کے دو حصے بنا کر میری مشکل حل کر دی۔ میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے درجے کی سچائی تک پہنچ کر رک نہیں جانا چاہئے۔ یہ منزل نہیں ہوتی اب میں بڑے یقین کے ساتھ اور واضع طور پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس دوسرے درجے کی سچائی کو سچ ہی نہ کہوں"۔

"بات میری سمجھ میں آ گئی ہے" شمسہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے کی طرح جینے کا مفہوم میرے سینے میں اتر گیا ہے۔ برق کی تڑپ جس طرح اندھیرے کے سینے میں روشنی کا شگاف ڈال دیتی ہے میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ جذبات زندگی کا آخری سنگ میل نہیں ہیں۔ اب میں سعید پر ترس نہیں کھاؤں گی۔ اسے دوست بناؤں گی---- زندگی میں ایک بھی سچا دوست مل جائے اس سے بڑی نعمت دنیا میں کچھ نہیں ہوتی---- شوہر سے اچھا دوست اور کون ہو سکتا ہے؟"

"ہاں" میں نے اس کے لہجے کے نئے پن کو محسوس کیا----

"جس کے ساتھ زندگی بھر نباہنے کا عہد کر لیا ہے اس سے کڑھ کڑھ کر نباہنے کی بجائے ہنس ہنس کر کیوں نہ نباہا جائے۔ تین مختلف قسم کی لڑکیوں سے پیار کر کے میں نے یہ راز پا لیا ہے کہ انسان خوشی سے بھی اتنی ہی جلدی بیزار ہو جاتا ہے جتنا غم سے---- لہٰذا جس چیز کو دنیا سکون قلب اور اطمینان کہتی ہے وہ اس جہاں میں ناپید ہے۔ غم یا خوشی جس ماحول میں بھی انسان رہے' کچھ عرصہ کے بعد ان سے مانوس تو ہو جاتا ہے۔ مگر بہت جلد اس سے اکتا بھی جاتا ہے۔ انسانی ذہن ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔ کم از کم میں تو ایک خاص عرصے کے بعد کسی نئی بات کے لئے کسی نئی چیز کے لئے بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہوں۔ کبھی قیمتی اور خوبصورت کپڑے پہن کر

خوشی ڈھونڈتا ہوں۔ کبھی حسین عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں خوشی تلاش کرتا ہوں۔ اور کبھی اونچا ادب تخلیق کر کے من کو شانت کرتا ہوں۔ ہر چیز کو پا بھی لیتا ہوں مگر پھر بہت جلد تھک بھی جاتا ہوں---- دور کیوں جایئے میں نے ابھی ابھی نمو کا ذکر کیا تھا جب میں نے اس لڑکی کو پایا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ میری اکتاہٹ اور بیزاری کو دور کرنے کے لئے خود خدا نے مجھے اس پہاڑ پر بھیجا ہے۔ اس فرشتہ دل لڑکی نے مجھے چند جنتی لمحوں سے آشنا کیا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس خوشی کا بھی ایک اختتام ہے۔ اس خوشی کو جہاں تک میں طول دے سکتا ہوں دیتا رہوں گا۔ ورنہ ایک پہاڑی لڑکی کے پیار اور ایک پڑھی لکھی مہذب لڑکی کے پیار میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ کہیں خلوص کم ہو گا کہیں زیادہ ہو گا۔ کہیں شرافت ہو گی۔ کہیں سادگی ہو گی۔ مگر اکتاہٹ اور بیزاری تو بہرحال مقدر ہے۔ ایک مخصوص منزل پر پہنچ کر منزل یوں پیروں سے سرک جاتی ہے جیسے خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آنکھ کھل جائے۔

شمسہ' یہ زندگی ایسی عجیب شے ہے کہ کبھی کبھی یہ موت میں بھی تسکین کے سامان تلاش کرتی ہے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر مرنے پر بھی کوئی تسکین کا یقین نہیں دلا سکتا تو پھر زندہ رہنے میں کیا حرج ہے۔ اور اگر زندہ ہی رہنا ہے تو پھر خوشی کی تلاش میں بھٹکنا بے سود ہے۔ مارا مارا پھرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ سوسائٹی نے زندہ رہنے کے جو قوانین بنائے ہیں انہیں صحیح تسلیم کر کے زندگی کو اس ڈگر پر لگایا جائے۔ شاید اس پابندی میں ہی خوشی کا مفہوم پوشیدہ ہو؟"

شمسہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیون کی الجھی ہوئی گتھیاں یوں آسانی سے سلجھ جائیں گی۔ شاید زندگی کا مفہوم سمجھانے خدا خود مجھے پہاڑ پر لے آیا تھا۔ آپ کی باتیں میری روح میں اتر گئی ہیں۔ آپ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کے کہنے کی مجھ میں اہلیت نہیں تھی۔ آپ نے مجھے وہ احساس دے دیا ہے جو اپنی نامرادیوں کامیابیوں اور خامیوں کو پرکھ سکے---- مجھے یاد ہے کئی بار ایسا ہوا ہے کہ

اگر آپ یاد آ گئے ہیں تو میں تڑپ تڑپ گئی ہوں ایسے لمحوں میں میرا عجیب موڈ بن جاتا تھا میں رو پڑتی تھی اور سوچا کرتی تھی میں نے کتنی انمول محبت کھوئی ہے-----

یہ گھڑیاں مجھے حسرت و یاس کی وادیوں میں لے جاتی تھیں۔ جہاں کسی منزل کا سراغ نہ ملتا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ موڈ بدل جاتا اور میں روزمرہ کی زندگی کی طرف پلٹ آتی تھی۔ اور پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ دنوں آپ کا خیال نہیں آیا۔ میں سوتی رہی' جاگتی رہی' کھاتی رہی' اور پیتی رہی۔ ہنسنے کے مواقع ملے تو ہنستی بھی رہی' جینے کی امنگ کسی نہ کسی شکل میں میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ تب مجھے احساس ہوا تھا کہ زندگی زندہ رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ اور شاید اسی احساس نے مجھے شادی کے بندھن میں جکڑ ڈالا۔ مگر شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی ایک بار آپ نے میرے دل و دماغ کو پیار کی مسرتوں کو سرشار کر دیا تھا اور آج آپ ہی نے میرے ذہن کو جینے کے مفہوم سے آشنا کر دیا ہے۔ اب میں ساری کدورتوں کو مٹا کر بڑے ہلکے پھلکے مزاج میں آپ سے مل سکوں گی----- اب میں آپ سے ملوں گی تو سعید کا ذرا سا خوف بھی نہ ہو گا"۔

میں ہنس پڑا۔

وہ اسی موڈ میں بولی۔

"دراصل خوف اپنے ہی دل کی دھڑکن دوسروں سے ڈر کا باعث بنتی ہے میں جب سے یہاں آئی تھی یعنی جس روز سے آپ سے سامنا ہوا تھا۔ تب سے ایک چور دل میں بیٹھا تھا۔ اس چور نے مجھے بہت ستایا۔ ایک طرف یہ سعید سے سہا سہا رہا اور اسے فریب بھی دیتا رہا۔ دوسری طرف اس چور کا ہاتھ آپ تک نہ پہنچ سکا اور صرف تڑپتا ہی رہا مگر آج آپ نے اس چور کا گلا بھی گھونٹ دیا۔ بہت اچھا کیا۔ میں آپ کی بے حد ممنون ہوں!"

میں بہت خوش تھا۔ آج زندگی کے مفہوم کی کلیاں کھل رہی تھیں۔ اور یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور سب کی نظریں بچا کر بڑی

عقیدت سے شمسہ کا ہاتھ چوم لیا۔

شمسہ ایک دم چونکی مگر میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔

"شمسہ! یہ وہ بوسہ ہے جس کے لمس میں تمہارے احترام کے سوا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ احترام اور پیار میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ جس کا احترام کیا جاتا ہے----- اس کے لئے سینے میں احساسات اور جذبات ضرور ہوتے ہیں جہاں یہ سب کچھ ہو گا وہ دُنیا پیار ہی کی دنیا ہو گی----- آج سے ہم پیار کی اس نئی دنیا میں قدم رکھتے ہیں"۔

شمسہ کی حیرت اب ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ بڑے فخر و غرور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم چلے گئے۔

اگلے دن ناہید کا ٹیلی گرام آیا۔ تبسم کی شادی کی تاریخ طے پا گئی تھی اور اسے لاہور بلایا گیا تھا۔

ناہید بہت خوش تھی۔ خوشی دراصل اسے اس بات کی تھی کہ میں شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ جا رہا تھا----- ناہید کا اعتماد بحال ہو گیا تھا اور اس کی آن بان دوبارہ قائم ہو چکی تھی۔ اب وہ خاندان والوں سے' سکھیوں سہیلیوں سے' بہن سے' ماں سے حتیٰ کہ باپ سے بھی آنکھ ملانے کی جرات کر سکتی تھی۔

نمو نے ہماری واپسی کی خبر سنی تو کچھ نہ بولی۔

اس نے ہر نامرادی کی طرح اس خبر کو بھی بڑے صبر سے برداشت کیا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

جوانی پیار کو جنم دے سکتی ہے مگر اپنے پیار کا پیچھا نہیں کر سکتی۔

سعید اور شمسہ کو ہمارے واپس چلے جانے کی خبر ملی تو انہیں بڑا رنج ہوا----- ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اور پھر انہوں نے بھی دس بارہ روز مزید ٹھہرنا تھا۔

اگلے دن سعید نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔

دعوت میں نمو بھی شامل تھی۔

شمسہ نے ناہید سے کہا۔

"یہ پوپی کی آیا مجھے بہت پسند ہے۔ اگر آپ اس کے ابا سے کہہ دیں کہ جب تک ہم مری میں ہیں یہ ہمارے پاس رہے تو میں ان کی بہت مشکور ہوں گی"۔

نمو مسکرائی اس کے تبسم میں بڑی گہری حسرت تھی۔

ناہید بولی۔

"کہنے کو تو میں کہہ دوں گی مگر اس کے ابا مانیں گے نہیں۔ پوپی اور میں دونوں اس سے بے حد مانوس ہو چکے ہیں۔ میں نے سرور بابا سے کہا تھا کہ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں مگر وہ ہنس کر ٹال گئے"۔

"باجی----!"

نمو نے شمسہ کو مخاطب کیا۔

"مری تو آپ نے دیکھ لی ہے۔ چند دن آپ نے اور ٹھہرنا ہے۔ میرے ساتھ گاؤں چلئے بابو جی نے ہمارا گاؤں دیکھا ہے' آپ بھی اسے پسند کریں گے"۔

میں نے تائید کی۔

"ہاں شمسہ! نمو ٹھیک کہتی ہے ان کا گاؤں بے حد خوبصورت جگہ پر واقع ہے۔ نمو آپ کو چام گلی کے چشموں پر لے جائے گی۔ اپنی بھیڑوں کا خالص خالص دودھ پلائے گی ان کی چھوٹی بہن رابعہ اپنی پیاری پیاری باتوں سے آپ کے کانوں میں شہد کی بوندیں ٹپکائے گی۔ اور سارا گھر آپ پر خلوص نچھاور کرے گا!"

"اچھا"

شمسہ نے مسکرا کر نمو کی طرف دیکھا۔

"ہوں بابو جی تو یونہی تعریف کرتے ہیں"

نمو نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ رات تقریباً" ایک بجے تک ہم خوش گپیوں

میں مصروف رہے۔

دوسرے دن صبح دس بجے ہم ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ گزشتہ شام میں ٹیکسی کا انتظام کر چکا تھا---- ناہید بے حد خوش تھی اس کی ہر ادا اور ہر حرکت میں ایک گھمبیر مسرت کا احساس تھا۔

پوپی نمو کی گود میں مچل رہا تھا۔ نمو بظاہر اس کے اچھل کود کے موڈ میں شامل تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں یاس کے دیئے جھلملا رہے تھے۔ اور اس کی نظریں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ سعید اور میں الوداعی گفتگو کر رہے تھے شمسہ ناہید سے باتوں میں مصروف تھی۔ اور اسے بار بار خط لکھنے کی تاکید کر رہی تھی۔ مگر ماحول کی متانت سے وہ پوری طرح باخبر تھی---- نمو کے استقلال' صبر اور یاس و مسرت پر بھی اس کی نظر تھی۔ ناہید کی خوشی کو بھی وہ سمجھ رہی تھی اور میری مجبوری اور جھنجھلاہٹ بھی اس سے مخفی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ ہم سب ہنس رہے ہیں۔

ڈرائیور سارا سامان پیک کر کے بولا۔

"صاحب---- سامان پیک کر دیا ہے اور چلنے کا وقت ہو گیا ہے"۔

"ہاں چلتے ہیں"۔

ڈرائیور کو جواب دے کر میں سعید سے بغلگیر ہو گیا۔ شمسہ اور ناہید بھی گلے ملیں---- نمو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ ناہید نے دس دس کے چند نوٹ نکالے کچھ بابا سرور کو دیئے اور کچھ نمو کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

نمو شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ہونٹ چبا رہی تھی اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے اس کے لئے ہر چیز دھندلا گئی تھی اسے تو اس بات کا بھی علم نہیں ہوا تھا کہ پوپی کب اس کی گود سے ناہید کی گود میں منتقل ہو گیا ہے۔

خود میں---- جسے زندگی نے جذبات کے بجائے حقائق پرستی کا سبق سکھایا تھا۔ ایک بار پھر جذباتی ہو گیا۔ میں نمو کی طرف بڑھا اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں

جھانکا۔

اور دوسرے لمحے میں نے نمو کی پیشانی چوم لی۔

نمو نے بھیگی پلکیں اٹھائیں------ اس کی سبز آنکھوں میں ایک فردوسی تبسم رقص کرنے لگا۔

سعید نے شمسہ کی طرف دیکھا مگر حیرت کے بجائے خود وہی تبسم شمسہ کے لبوں پر بھی رقصاں تھا۔

ناہید ابھی تک اس عقدے کو سمجھی نہیں تھی اور حیران کھڑی تھی۔ بلکہ اس کی مسرت وقتی طور پر غائب ہو گئی تھی پوپی اس کی گود میں اچھل رہا تھا۔

میں ناہید کی طرف مڑا۔ پوپی کو گود میں لے کر مسکرایا۔ اور پھر ناہید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"بوسہ تو لوگ اپنی بہنوں کا بھی لے لیتے ہیں' بچوں کا بھی لیتے ہیں۔ پھولوں کو بھی لوگ ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں---- الہامی کتابوں کو بھی دنیا آنکھوں سے لگاتی ہے---- ناہید دنیا میں پیار و عقیدت کے مختلف اور ان گنت رنگ ہیں۔ آؤ بیٹھو' ہمارا سفر بہت لمبا ہے!!"

❦❦❦❦❦❦